معرکہ اسلام و جاہلیت

مولانا صدرالدین اصلاحیؒ

دیباچہ

اسلام کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے اور اس کے اتباع کا حق ادا کرسکنے کے لیے جہاں اس بات کا علم ہونا ضروری ہے کہ اسلام کیا ہے، وہاں یہ بھی جانے رکھنا ضروری ہے کہ غیر اسلام، یعنی جاہلیت کیا ہے؟ اور یہ کہ عقائد، افکار، تصورات، اخلاق، اعمال اور معیارِ خیر و شر کے وسیع و آفاق گیر میدانوں میں یہ دونوں کس طرح ایک دوسرے سے الگ اور ممیز رہتے ہیں؟ نیز یہ کہ ان دونوں کی فطری اور مسلسل کشمکش کا انداز کیا رہتا ہے؟ غیر اسلام پیروانِ اسلام کے ذہنوں میں نفوذ کرنے کے لیے کس طرح کوشاں رہا کرتا ہے؟ جب تک یہ ساری باتیں آدمی کی نظر میں نہ ہوں، اسے اپنے دین و ایمان کے بارے میں پوری طرح مامون یقین نہیں سمجھا جا سکتا۔

اسی ضرورت کو سامنے رکھ کر راقم الحروف نے اپنی تصنیفی زندگی کے ابتدائی دور میں "معرکۂ اسلام و جاہلیت" کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھا تھا، جو ملک کے مشہور ماہنامہ "ترجمان القرآن" کی بارہویں اور تیرہویں جلدوں کے چھ شماروں میں شائع ہوا تھا، اور جسے کچھ دنوں بعد ہی لاہور کے ایک کرم فرما نے اپنے اشاعتی ادارے سے، میری اجازت اور اطلاع کے بغیر، کتابی شکل میں از خود شائع کر لیا تھا۔ اگرچہ ان کی شائع کردہ یہ کتاب میری نظر ثانی اور تصنیفی ترتیب کے بغیر ہی شائع ہوئی تھی، مگر اسے کافی پسند کیا گیا۔ جس کی ایک وجہ اس کی بحث کا مخصوص انداز بھی تھا۔ تقسیم ہند کے بعد سے بہت سے احباب بار بار زور دیتے رہے کہ اسے اپنے ہاں سے شائع کیا جانا چاہیے۔ مگر میں ان سے برابر یہی عرض کرتا رہا کہ اس کی نظر ثانی کر لوں اور اسے تصنیفی ترتیب دے لوں اس کے بعد ہی اسے شائع کرنا مناسب ہوگا۔ اِدھر اپنی گوناگوں مجبوریوں اور مصروفیتوں کے باعث بہت دنوں تک اس کام کے لیے موقع نہ مل سکا، اور اب ایک تہائی صدی سے زائد مدت گزر جانے کے بعد اس کی توفیق مل سکی۔ اس بات نے یہ حقیقت ذہن میں تازہ کردی کہ معاملات کے فیصلے زمین پر نہیں، آسمان پر ہوا کرتے ہیں، کسی بھی کام کا جو وقت مقرر ہوتا ہے وہ اس سے لمحہ بھر بھی پہلے انجام نہیں پا سکتا۔

اس غیر معمولی تاخیر کا جہاں اب تک افسوس رہتا رہا تھا، وہاں اب ایک پہلو سے اس پر خوشی بھی محسوس ہو رہی ہے، اور وہ یہ کہ اس کے نتیجے میں کتاب کا معیار، بحمد اللہ کہیں سے کہیں پہنچ گیا اور صفحات بھی ڈھائی گنے ہو گئے۔
دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کے مقصدِ تصنیف کو پورا کردے۔ آمین۔

صدر الدین اصلاحی

۹ر دسمبر ۸۳ء

فہرستِ مضامین

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حق اور باطل، دو فطری حریف

عقل، انسان کا امتیازی جوہر

نوعِ انسانی کا وہ امتیازی جوہر، جو اسے قدرت کی ایک شاہ کار مخلوق بناتا اور دوسری تمام مخلوقات سے ممتاز کرتا ہے، اس کی 'عقل' ہے۔ اور یہی عقل وہ چیز ہے جو اسے اپنے اعمال و حرکات کے بارے میں جواب دہ ٹھیراتی ہے۔ اگر کسی کے اوپر کوئی چٹان لڑھک کر گر پڑے اور اسے جان سے مار دے، تو اس عمل کی بنا پر اُسے مجرم نہیں قرار دیا جاتا۔ کیونکہ وہ عقل اور شعور سے عاری ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی مویشی کسی کی کھیتی چر ڈالے اور اسے روند کر رکھ دے تو اس پر بھی کوئی فردِ جرم نہیں لگائی جاتی۔ اس لیے کہ اگرچہ وہ شعور اور احساس رکھتا ہے مگر عقل نہیں رکھتا۔ لیکن ضرر رسانی کی ایسی ہی کوئی حرکت جب کسی آدمی سے سرزد ہوتی ہے تو قانون اور مذہب، سماج اور حکومت، سب اسے اپنے اس فعل کا ذمہ دار سمجھتے اور مجرم و مستحقِ سزا قرار دیتے ہیں۔ اور ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ آدمی شعور بھی رکھتا ہے اور عقل سے بھی بہرہ ور ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ صحیح اور غلط میں تمیز کر سکتا ہے، جب کہ جمادات اور حیوانات اس صلاحیت سے محروم ہوتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ انسان کے ایک ذمہ دار، مسئول اور مستحقِ جزا یا لائقِ سزا ہونے کی تمام تر وجہ اس کی عقل و فہم ہے۔

عقل پر انسان کا ظلم

لیکن انسان کے ایک صاحبِ عقل و فہم ہستی ہونے کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ اس کا ہر کام لازماً عاقلانہ ہی ہوا کرتا ہے، اور وہ جو کچھ کرتا ہے عقل و دانش کی ترازو میں ٹھیک ٹھیک تول کر ہی کرتا ہے۔ ایک طالب علم اپنا بیشتر وقت تفریحوں میں گزارتا رہتا ہے جب کہ دوسرا اپنے تعلیمی فرائض کی انجام دہی میں لگا رہتا ہے۔ انسان ہونے کے باعث صاحبِ عقل ہستی دونوں ہی ہوتے ہیں، لیکن کوئی بھی شخص دونوں کو یکساں طور پر اپنی عقل کا صحیح استعمال کرنے والا نہیں کہہ سکتا۔ اس طرح کے متضاد کرداروں کی مثالیں واقعات کی دنیا میں ہر طرف موجود دیکھی جا سکتی ہیں، جو اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ انسان اپنی اس امتیازی قوت کے صحیح استعمال میں جہاں کامیاب رہتا ہے وہاں ناکام بھی ہو جایا کرتا ہے، اور شواہد بتاتے ہیں کہ اس کی ناکامیوں کی فہرست کامیابیوں کے مقابلے میں کم طویل نہیں ہے۔ پھر بات اتنی ہی نہیں ہے کہ وہ اپنی عقل کے صحیح استعمال میں ناکام ہوتا رہتا ہے، بلکہ یہ بھی ہے کہ بسا اوقات وہ اس کا استعمال ہی نہیں کرتا، یا استعمال کرنے کے بعد اس کی سُنی ان سنی ایک کر دیتا ہے۔ کتنے ہی شرابی، جواری، رہزن اور فحش کار آپ ایسے ہر جگہ پا اور دیکھ سکتے ہیں جو دل میں اپنے فعل کو خود بھی نادرست ہی سمجھتے ہوں گے، مگر پھر بھی کسی نہ کسی وجہ سے وہ اس کا ارتکاب کیے جا رہے ہوں گے۔ اس سے جو حقیقت روشنی میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ انسان اپنی عقلی قوت کا استعمال ہمیشہ نہیں کیا کرتا، اور جب کرتا بھی ہے تو ضروری نہیں ہوتا کہ وہ صحیح بھی ہو، اور اگر وہ صحیح ہو بھی تو لازمی نہیں ہے کہ وہ اس کے کہے پر عمل بھی کرے۔

جب معمولی معمولی باتوں کے سلسلے میں بھی عقل کی قدر ناشناسی کا اور اس پر آدمی کے ظلم کا یہ حال ہے تو خدا اور مذہب جیسے ماورائی مسئلے کے بارے میں کیا کچھ نہیں ہو سکتا؟ دو پیسے کی امانت میں خیانت کر جانے والے سے یہ توقع رکھنا کہ وہ ایک لاکھ کی امانت میں سچا امین ثابت ہوگا، بڑی سادہ لوحی کی بات ہوگی۔ اس لیے جو انسان اپنے دل پسند دنیوی

مفادات کے بارے میں بھی اپنی عقل کے ٹھیک ٹھیک استعمال میں ناکام ہو جایا کرتا ہے، اور ٹھیک استعمال کی شکل میں بھی بسا اوقات کسی نہ کسی وجہ سے اس کے فیصلے کے مطابق عمل درآمد نہیں کر پاتا، وہ اگر خدا اور اس کے دین کے معاملے میں دس فی صد بھی اپنی عقل کا صحیح استعمال کر سکے، اور پھر ان دس میں سے دو ایک کے فیصلوں کو بھی عملاً تسلیم کر لے سکے تو بہت بڑی بات ہوگی۔ یہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ تاریخ کا کوئی باب بھی مذہبی اختلافوں اور تصادموں کے تذکرے سے خالی نہیں ہے تو یہ دراصل عقل و دانش کو کبھی غلط استعمال کرنے، کبھی استعمال ہی نہ کرنے، اور کبھی اس کے کہے کو جان بوجھ کر ٹھکرا دینے ہی کا نتیجہ ہے۔

عقل اور فطرت کے حجابات

یہ پہاڑ جیسی غلطی انسان سے کیوں سرزد ہوتی رہتی ہے؟ اپنی سب سے قیمتی متاع، عقل اور فطرتِ سلیم، کے ساتھ اس نے اس ظلم کو کیسے روا رکھا؟ یہ ایک بڑا اہم سوال ہے جو اس موقع پر لازماً ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ آگے بڑھنے سے پہلے اس کا جواب معلوم کر لیا جائے۔

یوں تو اس غلطی اور اس ظلم کے اسباب متعدد ہیں، اور بہت سی چیزیں ہیں جو دین و مذہب کے سلسلے میں آدمی کی عقل پر اور اس کی خیر پسند فطرت پر پردے ڈال دیا کرتی ہیں۔ لیکن ان میں سے تین ہی چیزیں ایسی ہیں جن کا رول اس معاملے میں بنیادی ہوا کرتا ہے:۔

۱۔ پہلی چیز تو آدمی کی جبلّی ضرورتیں اور طبعی خواہشیں ہیں۔ یہ خواہشیں بڑی طاقت ور اور منہ زور واقع ہوئی ہیں۔ اگر انسان انہیں قابو میں نہ رکھ سکے، اور آزاد چھوڑ دے تو وہ بالکل بے لگام ہو رہتی ہیں، یہاں تک کہ اس کے اندر کسی ایسے عمل اور اقدام کی ہمت، بلکہ اس کا ارادہ تک باقی نہیں رہنے دیتیں جو انہیں گوارا نہ ہو۔ اور جب آدمی کسی کام کے کرنے کا ارادہ بھی کر سکنے کے قابل نہ رہ گیا ہو تو چاہے اس کی عقل کچھ بھی کہتی رہے اس پر وہ کان نہیں دھر سکتا۔ شراب کا رسیا خوب جانتا ہے کہ یہ ام الخبائث اس کی صحت، اس کی دولت، اس کا ذہنی اعتدال اور اس کی اخلاقی پاکیزگی، سب کو چاٹے لے رہی ہے، مگر ان ساری

تباہ کاریوں کو آنکھوں دیکھتے ہوئے بھی وہ ُدل کے ہاتھوں مجبور' بنا رہتا ہے اور عقل غریب کی ایک سن کر نہیں دیتا۔ یہ امر واقعی اس حقیقت کی زندہ مثال ہے۔

۲- دوسری چیز قومی تعصب، باپ دادا کی اندھی تقلید، موروثی افکار و عقائد اور رسم و رواج سے گہری وابستگی ہے۔ آدمی معقول سے معقول بات کو بھی محض اس بنا پر حقارت سے ٹھکرا دیا کرتا ہے کہ وہ ُباہر' سے آئی ہوئی ہے اور اس کے اپنے قومی ورثے سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ گویا اس کے سوچنے کا انداز یہ ہوتا ہے کہ جو چیز اس کے اپنے ہاں کی ہو وہی صحیح اور قابلِ التفات ہے، اور اس کی قومی انا کا تقاضا ہے کہ اسے ہر حال میں دانتوں سے پکڑے رہے۔ یہ بڑی بے غیرتی کی بات ہوگی کہ وہ اس کے غلط اور قابلِ ترک ہونے کا تصور بھی دل میں لائے۔

۳- تیسری چیز فکر و نظر کی غیر سنجیدگی، خامی اور کجی ہے۔ ایسے لوگ کثرت سے ہر طرف موجود دیکھے جاسکتے ہیں جو دین کے سب سے اہم اور سب سے نازک مسئلے پر غور و فکر کرتے بھی ہیں تو غور و فکر کا حق ادا نہیں کرتے۔ ان کے سوچنے کا ڈھنگ سطحی اور غیر سنجیدہ ہوتا ہے اور ان کے استدلال میں پھسپھسا پن اور بھینگا پن کام کر رہا ہوتا ہے۔ چند قدم چلے نہیں کہ غلط رخ پر مڑ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ خدا کو بھی مانتے ہوں گے اور آخرت کے محاسبے کو بھی تسلیم کرتے ہوں گے، مگر اس ُماننے اور تسلیم کرنے' کی تفصیل میں جانے کے بعد ان کا یہ ماننا نہ ماننے کے برابر ہو کر رہ جاتا ہوگا۔ تکوینی حیثیت سے تو وہ ساری عظمتوں کا مالک اللہ رب العالمین ہی کو سمجھتے ہوں گے، اسی کو ساری کائنات کا خالق اور پروردگار، آقا و حکمراں مانتے ہوں گے۔ مگر تشریعی حیثیت سے سوال سامنے آتے ہی وہ اسے عرش سے اتار کر فرش پر لا بٹھاتے ہوں گے۔ کبھی اسے دنیا کے حکمرانوں پر قیاس کر کے ُشرک' کی گندگی میں جا گرتے دکھائی دیں گے، اور کبھی اس کی ذاتِ واجب الوجود کو فانی مخلوقات پر قیاس کر کے ُتشبیہ' کی گمراہی میں جا پڑتے نظر آئیں گے، حالانکہ ان میں سے ہر قیاس کھلا ہوا قیاس مع الفارق ہوتا ہے۔

یہی ان کے نام نہاد ایمان بالآخرت کا بھی ہوگا۔ قیامت، آخرت اور محاسبۂ اعمال

کو تسلیم کرنے کا انھیں دعویٰ بھی ہوگا، مگر ساتھ ہی کچھ ہستیوں کی شفاعت کے بل پر بہر حال پروانۂ مغفرت حاصل کر لینے کا من مانا عقیدہ بھی رکھتے ہوں گے، اور انھیں اس واضح حقیقت کا بالکل احساس نہ ہوگا کہ ایسے عقیدۂ شفاعت کے بعد آخرت اور اس کے محاسبے پر ایمان رکھنے کے کوئی معنی ہی نہیں باقی رہ سکتے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کے لفظوں میں پہلے سبب کا نام 'حجابِ طبع' یا حجابِ نفس، دوسرے(۲) کا 'حجابِ رسم' اور تیسرے(۳) کا 'حجابِ سوءِ معرفت' ہے(۱)۔

عقل و فطرت کے ان حجابات میں سے کسی کی بھی کارستانیوں کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ بنی آدم کی بہت بڑی اکثریت انھی حجابات کی تاریکیوں میں گم، اور ان کی پیدا کی ہوئی محرومیوں کا شکار بنتی چلی آ رہی ہے۔ غیر دینی معاملات سے تو انھیں کوئی غرض نہیں ہوتی، مگر خدا اور مذہب کے معاملے میں وہ آدمی کے دل و دماغ پر کالی گھٹا بن کر چھا جایا کرتے ہیں، اور پھر ایسا بہت کم ہونے پاتا ہے کہ وہ چھٹ جایا کریں۔ الا لمن یشاء اللّٰہ۔

مذاہب کی بنیادی تقسیم

یوں تو دنیا میں بے شمار مذاہب پائے جاتے ہیں، لیکن معقولیت اور سچائی کی کسوٹی پر اگر کس کر دیکھا جائے تو وہ بنیادی طور پر دو ہی قسم کے ٹھیریں گے: صحیح(۱) اور برحق مذہب، اور غلط و حق گریز مذہب۔ صحیح اور برحق مذہب تو ایک ہی ہے اور ایک ہی ہو سکتا ہے، جب کہ غلط اور حق سے ہٹے ہوئے مذہب متعدد ہیں اور انھیں متعدد ہونا ہی چاہیے۔ مذاہبِ عالم کی یہی بنیادی تقسیم اس لیے ہو سکتی ہے کہ جس مذہب کو بھی لے کر دیکھا جائے گا وہ یا تو عقل کے صحیح فیصلے اور فطرتِ سلیم کے ٹھیک تقاضے کے عین مطابق ٹھیرنے والا نظر آئے گا یا اس سے ہٹا ہوا دکھائی دے گا۔ اگر صورتِ واقعہ پہلی ہوگی تو اسے حق مذہب سمجھا جائے گا، اور اگر دوسری ہوگی تو وہ غلط اور حق گریز قرار پائے گا۔ عقل کا صحیح فیصلہ اور فطرت کا ٹھیک تقاضا چوں کہ ایک ہی ہو سکتا ہے اس لیے صحیح اور برحق مذہب بھی ایک ہی ہو سکتا ہے، جب کہ

---

(۱) حجۃ اللہ البالغہ، جلد اول، ص ۵۶

عقل کے غلط فیصلے بہت سے اور کئی طرح کے ہو سکتے ہیں اس لیے غلط مذاہب بھی متعدد ہو سکتے ہیں۔

اسلام اور جاہلیت

حقائق اور دلائل کا فیصلہ (جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں) یہ ہے کہ صحیح اور برحق مذہب 'اسلام' ہے، اس کے سوا جو کچھ ہے، جتنے مذاہب اور نظامہائے فکر و عمل ہیں، ان میں سے کوئی نہیں جسے پوری طرح حق کہا جا سکے۔ اس کے اندر حق کے اجزاء تو موجود ہو سکتے ہیں لیکن سب کچھ حق نہیں ہو سکتا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ یا تو سر سے پیر تک غلط ہوگا یا پھر غلط اور صحیح کا ملغوبہ ہوگا۔ ایسے تمام مذاہب اور نظامہائے فکر و عمل کی تعبیر کے لیے ایک جامع لفظ 'جاہلیت' ہے۔ 'جاہلیت' اسی ایک کامل سچے مذہب 'اسلام' کی ایک اصطلاح ہے، اور اس سے مراد مذہبی یا اخلاقی نوعیت کی ہر وہ چیز اور طور طریقہ ہے جس کا سرچشمہ اللہ کا دین، یعنی اسلام نہ ہو۔ ایسی ہر چیز کو جاہلیت کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی بنیاد، کم از کم اسلام کی نگاہ میں، اللہ کی کسی ایسی ہدایت پر نہ ہوگی جو بے آمیز اور معتبر ہو۔ بلکہ براہِ راست یا بالواسطہ، اس کے ماننے والوں کے اپنے جذبات اور اپنی ذاتی پسند پر ہوگی، اور عربی زبان و ادب کی رو سے اسی بے لگام اتباعِ جذبات کا نام جاہلیت ہے۔[1]

جاہلیت کی دنیا نوازی

جاہلیت کے اندر نشوونما اور ارتقاء کی زبردست صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ مسلسل

---

[1] شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ نے 'جاہلیت' کا مفہوم یہ بیان کیا ہے اور بالکل صحیح بیان کیا ہے:۔
" ہر وہ کام جاہلیت کا کام ہے جسے لوگوں نے اختیار کر رکھا تھا لیکن اسلام نے اسے برقرار نہیں رکھا۔ پس امورِ جاہلیت میں وہ ساری چیزیں داخل ہیں جنہیں لوگ اپنائے ہوئے تھے (لیکن اسلام نے ان کی مثبت طریقے پر توثیق نہیں کی) خواہ اس نے صراحت سے ان کے نام لے کر ان سے منع بھی نہ کیا ہو" (اقتضاء الصراط المستقیم ص۵۴)

ترقی کرتی اور انسانی ذہن میں مضبوطی سے جمتی چلی جاتی ہے۔ اور جوں جوں اس کے اندر وسعت اور گہرائی آتی جاتی ہے، عقلِ صحیح اور فطرتِ سلیم سے اس کی آویزش بڑھتی چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ ایک وقت چل کر وہ آدمی کے ذہن سے اس تصور کو بھی نکال باہر کرتی ہے کہ وہ 'انسان' ہے، اور یہ باور کرا دیتی ہے کہ وہ بس ایک اونچے درجے کا حیوان ہے۔ اور یہ خیال ایسا خیال ہوتا ہے جس کے بطن سے مادیت، عشقِ دنیا، خود غرضی، لذت پرستی، ظلم، سرکشی، استکبار اور فساد فی الارض جیسی برائیوں کے سوا اور کچھ پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ انانیت اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ یہ انسان نما مخلوق مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً کا نعرہ بلند کرنے سے بھی باز نہیں رہتی۔ اور اگر اس جذبۂ انانیت نے مذہبی بھیس میں ظہور کرنے کی سوچی تو اللہ رب العالمین تک کو چیلنج دے دیتی ہے، اور اُسے، بزعمِ خویش، انسانی زندگی پر اُس کے حقِ فرماں روائی سے معزول کر کے اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰی کا اعلان کر دیتی ہے۔

ابھی جو یہ بتایا جا چکا کہ جاہلیت سے مراد ہر وہ مذہبی یا اخلاقی نوعیت کا کام یا نظریہ یا طور طریق ہے جس کا سرچشمہ اللہ کا دین نہ ہو، اُس سے اِس سوال کے اُٹھنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ جب جاہلیت عقل کے غلط استعمال کا یا اس کے عدم استعمال کا نتیجہ ہوتی ہے تو جاہلی قوموں کو دنیوی اور تمدّنی حیثیت سے بھی پس ماندہ ہونا چاہیے۔ 'مذہبی نوعیت' اور 'اخلاقی نوعیت' کی قید اس سوال کو بالکل خارج از بحث قرار دے دیتی ہے۔ کیونکہ اس قید سے از خود یہ حقیقت روشنی میں آجاتی ہے کہ جاہلیت کی مار انسان کی اس سوجھ بوجھ پر نہیں پڑا کرتی جس کا تعلق دنیا کے معاملات اور مادّی مفادات سے ہوتا ہے۔ وہ عقلِ انسانی کی کارکردگی پر صرف اُس وقت حملہ کرتی ہے جب وہ دین اور اخلاق کے مسئلے پر غور کر رہی ہو۔ اس کو عناد صرف دین اور اخلاق سے ہے، دنیا اور مادی مفادات سے قطعاً نہیں ہے۔ انسان کا مادّی ترقی کی طرف بڑھنا اس کے مقاصد کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتا، بلکہ بالعموم معاون و مددگار ہی بنا کرتا ہے۔ کیونکہ اُسے جس قدر زیادہ معاشی اور تمدّنی اور سیاسی عروج حاصل ہوتا جاتا ہے اسی قدر اس کا رشتہ خدا اور آخرت سے عموماً کمزور پڑتا چلا جاتا ہے۔ اور یہی جاہلیت کو مطلوب ہے۔ پھر وہ کسی کی مادّی ترقیوں کی

راہ میں مزاحم کیوں بنے؟ اس لیے جاہلیت میں ڈوبی ہوئی قومیں جہاں دینی، روحانی اور اخلاقی
حیثیت سے بانجھ ہو رہتی ہیں وہاں دنیوی اور مادّی حیثیت سے بڑی 'زرخیز' بھی ہوسکتی ہیں،
ہوتی رہی ہیں، آج بھی ہیں اور آئندہ بھی ہوتی رہیں گی۔ چنانچہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ
ماضی میں جو قومیں جاہلیت کی علم برداری کر کے اخلاقی موت مرتی رہی ہیں، ان میں سے اکثر و
بیشتر اپنے اپنے زمانوں کی بڑی ہوشیار اور ترقی یافتہ قومیں تھیں۔ عاد اور ثمود کے بارے
میں قرآن مجید کا بیان ہے کہ وہ جہاں دین اور اخلاق کے معاملے میں بالکل اندھے بنے ہوئے
تھے وہاں دنیا کے معاملات میں بڑی سوجھ بوجھ بھی رکھتے تھے (وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ۔
عنکبوت۔ ۳۸) اور دوسرے لفظوں میں یہی بات اس نے قریش کے بارے میں بھی بتائی
ہے (يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ روم۔ ۷) قومِ عاد اتنی زور آور اور باجروت
تھی کہ دنیا نے اس وقت تک ایسی قوم دیکھی نہ تھی، اور تمدّنی شان و شوکت بھی اس کی
بے مثال تھی (اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ۔ فجر۔ ۸) نیز فوجی
طاقت کے لحاظ سے اپنے عہد کی وسپر پاور تھی (وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ۔
شعراء: ۱۳۰) قومِ ثمود کی بابت قرآن بتاتا ہے کہ وہ بھی اپنے دور کی انتہائی ترقی یافتہ قوم تھی۔
علم و فن، خصوصاً فنِ تعمیر میں، کمال کے درجے تک پہنچی ہوئی تھی۔ میدانی علاقوں میں اس
نے شاندار محل، اور کوہستانوں میں پہاڑوں کو تراش کر بڑے بڑے مکان اور قلعے تعمیر
کر رکھے تھے۔ (تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا۔ اعراف ۷۴)
قومِ شعیب تجارت کے میدان کی شہسوار تھی اور اپنی کوششوں اور شاطرانہ چالوں سے
اپنے کاروبار کو بامِ عروج پر پہنچائے ہوئے تھی۔ قومِ فرعون کا جاہ و جلال دنیا پر روشن ہی
ہے۔ قریش مکہ ایک طرف عرب کے 'برہمن' بنے ہوئے تھے تو دوسری طرف بحر احمر کے کنارے
کنارے گذرنے والی بین الاقوامی تجارتی شاہراہ کے گویا تنہا مالک تھے۔ یہ ساری شہادتیں
اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ جاہلیت کو اگرچہ عقل انسانی کے اخلاقی رجحانات سے انتہائی
بیر ہے، مگر اس کے مادی رجحانات اسے بہت عزیز ہیں۔

دین حق اور جاہلیت کی دائمی کشمکش

اختلاف، خصوصاً دینی افکار کے اختلاف کا یہ مزاج ہی نہیں کہ وہ اپنی حدوں میں خاموشی کے ساتھ سمٹا رہے۔ اس کے بخلاف یہاں تو ہر فریق مسلسل اس کوشش میں لگا رہتا ہے کہ مخالف کو زیر کرلے۔ اس لیے خیر اور شر، اسلام اور جاہلیت کے درمیان برپا ہونے والی کشمکش بھی نہ کبھی ختم ہوئی ہے نہ کبھی ختم ہونے والی ہے ٹکرانے کو تو شر و جاہلیت کے مختلف حلقے بھی باہم ٹکراتے رہتے ہیں، مگر ان کا ٹکراؤ ایک ہی خاندان کے مختلف افراد کی باہمی آویزش سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ آویزش اکثر اوقات صلح و مسالمت میں بھی بدل جایا کرتی ہے۔ مگر اسلام اور جاہلیت کا ٹکراؤ ایسا ٹکراؤ ہے جو نا پیدا کنار ہے۔ یہ کبھی بقائے باہم کی سوچ ہی نہیں سکتے۔ اس لیے ان دونوں کی جنگ سب سے زیادہ کھلی ہوئی، سب سے زیادہ حقیقی اور سب سے زیادہ سخت و شدید ہوتی ہے۔

دنیا کا سارا ہنگامہ بڑی حد تک انہی دونوں پیدائشی حریفوں، اسلام اور جاہلیت' کی کشاکشوں کا نتیجہ ہے۔ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کی ایسی ضد واقع ہوئی ہیں کہ ایک کی زندگی دوسرے کی موت کا نام ہے۔ جس طرح رات کی فطری تاریکی کسی ایک ذرّے پر بھی سورج کی کرنوں کا پرتو گوارا نہیں کرسکتی، اور جس طرح سورج کی تیز نگاہیں کسی گوشے میں بھی تاریکی کے کسی دھبے کو باقی نہیں دیکھ سکتیں، ٹھیک اسی طرح عالم باطن کی روشنی اور تاریکی بھی ایک دوسرے کی جانی دشمن ہیں اور ان کے درمیان مصالحت کا کوئی امکان نہیں پایا جاتا۔ باطل کی ہر چیز حق کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتی ہے، اور حق کی ہر آواز باطل کے لیے یکسر قابلِ نفرت قرار پاتی ہے۔

ان دونوں قوتوں کی اس دائمی کشمکش کا محور، انسان کی ذات ہے۔ ان میں سے ہر ایک اُسے پوری طرح فتح کر لینا چاہتی ہے۔ اور ان کی اسی کشمکش میں انسان کی آزمائش ہو رہی ہے۔ نتیجہ کے طور پر انہی کی ہار جیت پر اُس کی سعادت اور شقاوت موقوف رہتی ہے۔

وحیِ الٰہی کی رہنمائی اور مدد

اسلام اور جاہلیت کی اس زبردست کشاکش کی منجدھار میں پڑے ہوئے انسان کو اس کے خالق اور پروردگار نے اپنے حال پر نہیں چھوڑ رکھا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس نے اس آزمائش سے اس کے سرخ رو نکل سکنے کے لیے تدبیروں اور کوششوں کا سارا بوجھ اس کی اپنی عقلی قوت اور فطری صلاحیت ہی پر ڈال رکھا ہو۔ حالانکہ اگر ایسا ہوا ہوتا تب بھی انصاف کے خلاف نہ ہوتا، مگر یہ صرف 'خشک' اور نرے 'قانونی انصاف' کی بات ہوتی۔ ایسے انصاف کی بات نہ ہوتی جسے اِس خالق اور پروردگار کے رؤف و رحیم اور ہادی و حکیم ہونے کے شایانِ شان کہا جا سکتا۔ اس لیے اس کی مشیت کا بجا طور پر یہ فیصلہ ہوا کہ وہ انسان کو اس آزمائش میں کامیاب ہونے کے لیے عقل اور فطرتِ سلیم کے سوا کچھ اور بھی دے، ایسی چیز دے دے جو اس کی عقل کو 'ہر بہکاوے سے' اور اس کی فطرت کو ہر بہلاوے سے بچا لینے والی ہو۔ یہی وہ چیز ہے جس کو 'وحیِ الٰہی' کہتے ہیں۔ یہ وحی الٰہی انسان کی عقل کو روشنی دکھاتی اور اس کی فطرت کا تزکیہ کرتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کے اندر فرشتوں سے بھی بازی لے جانے کی طاقت پیدا کر دیتی ہے، بشرطیکہ وہ خود اس کا سچا طالب ہو۔ یہ وحی سراپا ہدایت ہوتی ہے، جو پوری وضاحت اور کامل صراحت کے ساتھ انسان کو بتا اور سمجھا دیتی ہے کہ حق یعنی اسلام کی صراطِ مستقیم فی الواقع کیا ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے اور اس کی رصورت، کیسی ہے؟ اس کے تقاضے کیا کیا ہیں؟ باطل یعنی جاہلیت سے اس کی سرحدیں کس کس طرح الگ ہوتی ہیں؟ اور اس کی پیروی انسان کے لیے کیوں ضروری ہے؟ اس آسمانی ہدایت کا قبول کرنا یا نہ کرنا ہر شخص کی اپنی آزاد مرضی پر موقوف ہے۔ کیونکہ اگر یہ آزادی انسان کو حاصل نہ ہوتی تو نہ صرف یہ کہ یہ سارا ہنگامۂ حق و باطل سرد پڑ کر رہ جاتا، بلکہ انسان کے پیدا کیے جانے کا مقصد بھی فوت ہو رہتا۔ جو کوئی اس رہنمائی کے قبول کر لینے کا فیصلہ کر لیتا ہے اور اس فیصلہ کو عمل کی شکل بھی دے دیتا ہے، یہ اس کی عقل کو 'فرقان' عطا کر دیتی اور اسے صحیح معنوں میں 'اُولُوالْاَلْبَاب' (اہلِ دانش) کے زمرہ میں شامل کر دیتی ہے۔ اس کے بعد وہ جو کچھ سوچتا ہے ٹھیک رُخ سے سوچتا ہے، جو کچھ کرتا ہے

صحیح ڈھنگ سے کرتا ہے، اس کا ہر قدم صحیح ارتقاء کا قدم ہوتا ہے، اور اس کی زندگی خوش کام و نیک انجام زندگی بن جاتی ہے۔ اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے اس رہنمائی کو اللہ رب العالمین کی سب سے بڑی نوازش ہی کہا جا سکتا ہے، جسے قرآن حکیم نے بالکل بجا طور پر، رحمت، اور 'نعمتِ کاملہ' فرمایا ہے، لیکن جس کے ایک بڑے حصہ (شریعت) کو اسرائیلی نادانوں نے اُس وقت جب ان پر دنیا پرستی اور خدا فراموشی کی موت طاری ہو گئی تھی، 'لعنت' قرار دے دیا تھا، اور آج کی 'متمدن' اور 'روشن خیال' دنیا اس سے بھی کچھ زیادہ کہہ رہی ہے۔ اسلام اِسی وحیِ الٰہی کا اصطلاحی نام ہے، اور توحید، رسالت اور آخرت کے عقائد اس کے بنیادی پتھر ہیں، جن پر خدا کی بندگی کا ایک پورا نظام فکر و عمل تشکیل پائے ہوئے ہے۔ یہ عقائد اور یہ نظامِ بندگی انسان کے پورے وجود کو حق کے سانچے میں ڈھال دینے اور خیر کا پیکر بنا دینے کا تنہا ذریعہ ہیں، کامل اور کافی و شافی ذریعہ۔

جاہلیت کی جوابی کارروائی

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس وحی اور اس رہنمائی کے عطا کیے جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جاہلیت اس کے آگے دم بخود ہو کر رہ گئی ہوگی، اور اب انسان اس کے حملوں سے محفوظ ہو گیا ہوگا۔ وہ اتنی بودی اور کم ہمت نہیں ہے کہ وحی و ہدایتِ الٰہی کا نام سُن کر از خود ڈگیں ڈال دیتی۔ اس کے میگزین میں اسلحوں کی کوئی کمی نہیں۔ وہ جس طرح انسان کی عقل کو گھیرے میں لے لیتی ہے اسی طرح اُس کی مدد اور رہنمائی کے لیے اوپر سے آنے والی اِس وحی الٰہی پر بھی ہلہ بول دیا کرتی ہے۔ اور اس کے اِس ہلے کا خاص نشانہ اس وحی کی بنیادی تعلیمات توحید، رسالت اور آخرت — ہوتی ہیں۔ کیونکہ وہ جانتی ہے کہ ہدایتِ الٰہی کی اِس آہنی فصیل کو توڑ دینے کے بعد ہی اس کی فاتحانہ پیش قدمی کے لیے راہ ہموار ہو سکے گی۔

جن لوگوں پر یہ حملے کامیاب ہو جاتے ہیں ان کی عقلیں حق و صداقت کے بارے میں ماؤف ہونے لگتی ہیں، اور اُن کے منھ ہدایتِ الٰہی کی طرف سے مڑنا شروع کر دیتے ہیں اور ادھر سے منھ مڑے نہیں کہ ضلالت پوری تیزی سے ان پر ٹوٹ پڑتی ہے۔ پھر وہ

جس قدر اس کی گرفت میں آتے جاتے ہیں اسی قدر فطرتِ سلیم کی روشنی سے محروم، دینی حقائق کے ادراک سے عاجز، اور حق شناسی کی صلاحیت سے بے بہرہ ہوتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ وقت آجاتا ہے جب ان کے دلوں کا زنگ آلود آئینہ سچائی کا کوئی عکس قبول کرنے کے لائق نہیں رہ جاتا، اور ان کا ذہن مادیت کے حصار کا قیدی بن کر رہ جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کے سامنے اگر انسانی زندگی کا کوئی ماورائی مقصد رکھا جائے، خالص اور مکمل خدا پرستی کی دعوت پیش کی جائے، رسالت کی ضرورت اور آخرت کی اہمیت بیان کی جائے، حقیقی علم کی نشاندہی کی جائے، اور اس طرح انہیں سچی فلاح کی راہ دکھائی جائے تو نہ صرف یہ کہ وہ ان باتوں کے ماننے پر تیار نہ ہو سکیں گے بلکہ انہیں معقول اور قابل فہم بھی نہ پائیں گے، ان پر حیرت کا اظہار کریں گے، دیوانے کی بڑ قرار دیں گے۔ اور پھر یا تو اِدّعائے دانش مندی کی ایک خاص ادا کے ساتھ زیرِ لب مسکرا کر رہ جائیں گے، یا ہاتھوں میں پتھر اٹھا لیں گے۔ ان کی سمجھ میں نہ آئے گا کہ وہ کیا سُن رہے ہیں۔ اپنی عقل و فہم کو ان اعلیٰ حقائق سے اس قدر بیگانہ اور اتنا نامانوس پائیں گے کہ سنتے ہی کانوں پر ہاتھ دھر لیں گے، اور فتویٰ صادر کر دیں گے کہ ان 'بے ہنگم' باتوں کا پیش کرنے والا یا تو دیوانہ ہے یا سحر زدہ ہے، شاعری کر رہا ہے یا جھوٹا اور مفتری ہے، اور ڈھونگ رچا کر اپنی کوئی خاص غرض پوری کرنا چاہتا ہے۔

تاریخ کی شہادتیں

مذاہب کی، اور انبیائی دعوتوں کی تاریخ اٹھا کر دیکھیے، ورق ورق پر یہی داستان لکھی ہوئی ملے گی اور بالکل ایک سے لفظوں میں ملے گی۔ کیونکہ جاہلیت کا مزاج ہمیشہ یکساں رہا ہے، اور اسلام کی فطرت بھی کبھی بدلنے والی نہیں۔ اس لیے ان دونوں میں جب بھی ٹکراؤ ہوا اس ٹکراؤ کی کیفیت اور نوعیت بھی سدا ایک ہی سی رہی، اور اس کا انجام بھی ایک جیسا رہا۔

۱۔ قومِ نوحؑ

تاریخ کا معلوم دور حضرت نوح علیہ السلام سے شروع ہوتا ہے۔ آپ صرف

'آدم ثانی' ہی نہیں ہیں، بلکہ اُن انبیاءؑ کے سلسلے کی پہلی کڑی بھی ہیں جن کی نبوتوں اور دعوتوں کا تاریخی ریکارڈ اس وقت محفوظ پایا جارہا ہے۔ آپؑ کی دعوت کی سرگذشت مختصراً یہ ہے:۔

حضرت نوحؑ نے جب اپنی نبوت کا اعلان کرکے دعوتِ حق کا پہلا اور بنیادی نکتہ لوگوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا کہ تمام جھوٹے اور خود ساختہ معبودوں کو چھوڑ کر صرف خدائے واحد کی بندگی کرو تو ان کے بڑوں اور سربراہوں (مَلأِ قوم) نے اسے سختی کے ساتھ رد کرتے ہوئے اپنے عوام کو تلقین کی کہ:۔

لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا

(نوح ۔۲۳)

اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑنا اور کسی حال میں بھی نہ ترک کرنا (حضرت) وَدّ اور سواع کو اور نہ (حضرت) یغوث کو، یعوق کو اور نسر کو۔

اور حضرت نوحؑ کو انہوں نے یہ جواب دیا کہ:۔

اِنَّا لَنَرٰىكَ فِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ

(اعراف ۔ ۶۰)

ہم تمہیں ضلالِ مبین (کھلی ہوئی گمراہی) میں مبتلا دیکھ رہے ہیں۔

یعنی ان 'دانش مندوں' کے نزدیک اللہ تعالیٰ کو لاشریک ماننا کوئی معمولی ضلال نہ تھا بلکہ 'ضلالِ مبین' تھا، ایسا ضلال تھا جس کے ضلال ہونے میں دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں، اور یہ بات دو دو چار کی طرح واضح تھی کہ اگرچہ اس عظیم کائنات کو پیدا اکیلے اللہ ہی نے کیا ہے لیکن اسے چلا رہے ہیں بہت سے خدا، اور بہت سے خدا ہی اسے چلا سکتے ہیں، اور یہ صریح نادانی اور گمراہی کی بات تھی کہ خدائی کے سارے اختیارات اور حقوق صرف ایک خدا کے لیے مختص سمجھ لیے جائیں، حضرت نوحؑ نے انہیں جواب دیا کہ امر واقعی وہ ہرگز نہیں ہے جو تم سمجھ اور کہہ رہے ہو بلکہ ٹھیک اس کے برعکس ہے۔ ضلالِ مبین میں میں مبتلا نہیں ہوں، بلکہ تم خود مبتلا ہو، اور اس لیے ہو کہ تمہاری عقل ماری گئی ہے اور تمہارے دل و دماغ پر جہل اور جاہلیت کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ (وَلٰكِنِّىْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ۔ ہود ۔ ۲۹) لیکن آنجنابؑ کی ساری فہمائشوں کے باوجود ان کے دلوں پر سے جاہلیت کا یہ پردہ اس وقت تک نہ ہٹ سکا جب تک کہ

اس کا اخلاقی نتیجہ ظہور میں نہ آگیا اور خدائے قہار کا عذاب ان پر برس نہ پڑا۔ اور بعضوں کی آنکھ پر تو یہ پردہ اُس وقت بھی پڑا ہی رہ گیا تھا، وہ اب بھی خدائے قادرِ مطلق کو کوہِ جُودی سے فروتر گمان کر رہے تھے۔

اسی طرح جب آپؑ نے اپنی رسالت پر ایمان لانے کا ان سے مطالبہ کیا تو اس کے جواب میں بھی اُسی انکار، اسی حیرت اور اسی استعجاب کا اظہار کیا گیا جو دعوتِ توحید کے جواب میں کیا گیا تھا۔ انھوں نے کہا، بالفرض معبود ایک ہی ہو اور اس نے چاہا بھی ہو کہ ہم انسانوں کے پاس اپنا کوئی پیغامبر بھیجے، تب بھی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہمارے ہی جیسے ایک آدمی کو اس نے اِس غیر معمولی منصب کے لیے منتخب کیا ہو؟ تم تو ہمارے ہی جیسے ایک بشر ہو۔ پھر کس منھ سے یہ دعویٰ کرتے ہو کہ میں خدا کا فرستادہ ہوں؟ اگر اللہ کو اپنا کوئی فرستادہ مقرر کرنا ہی ہوتا تو اس نے اپنے کسی مقرب فرشتہ کو مقرر کیا ہوتا (مَاهٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ..... وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً۔ المومنون۔ ۲۴) اور یہ 'دلیل' دے کر انھوں نے نہ صرف یہ کہ آپؑ کے نبی ہونے کو ناقابلِ فہم اور ناقابلِ قبول ٹھہرا دیا بلکہ پورے سلسلۂ رسالت کا اور نفسِ رسالت ہی کا انکار کر دیا۔ کیونکہ ایک حضرت نوحؑ ہی نہیں، سارے انبیاء بشر ہی ہوئے ہیں۔ اس لیے اگر بشریت کی بنا پر آپؑ کو نبی نہیں مانا جا سکا تو یہ صرف آپؑ ہی کی نبوت کا انکار نہیں تھا، بلکہ سبھی نبیوں کی نبوت کا اور نفسِ نبوت ہی کا انکار تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے انہیں صرف ایک حضرت نوحؑ ہی کی نہیں بلکہ پورے سلسلۂ انبیاء کی تکذیب کا مجرم کہا ہے (كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحٍ الْمُرْسَلِيْنَ شعراء۔ ۱۰۵)

پھر یہ انکار بھی انکارِ محض نہیں تھا، بلکہ تعجب بھرا انکار تھا۔ اُن کے اِسی تعجب پر تعجب ظاہر کرتے ہوئے حضرت نوحؑ نے فرمایا تھا:۔

اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۔ (اعراف ۶۳)	کیا تمہیں (میری نبوت کا انکار ہے) اور اس بات پر حیرت ہے کہ تمہارے رب کی طرف سے تمہارے ہی اندر کے ایک آدمی پر حق کی یاددہانی آئی ہے، تاکہ وہ تمہیں (آخرت سے) خبردار کرے اور تاکہ

تم خدا کی ناراضی سے بچ سکو اور توقع ہو کہ تم پر رحم کیا جائے؟

حضرت نوح ؑ کے اس ارشاد میں دعوتِ حق کے سارے ہی بنیادی عناصر موجود تھے، اور قوم کا اظہارِ تعجب ان سبھی باتوں پر تھا۔ آپ ؑ کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ جب اللہ تعالیٰ ہی تمہارا رب ہے تو اس کی ربوبیت صحیح معنوں میں ربوبیت ہو ہی نہیں سکتی تھی اگر وہ تمہاری اخلاقی اور روحانی ربوبیت اور پرورش کا بھی کوئی سامان نہ کرتا، جب کہ اس نے تمہاری جسمانی پرورش اور مادی ضرورتوں کی فراہمی کا اتنا وسیع، مکمل اور حکیمانہ نظام قائم کر رکھا ہے جس کا تم اپنی کھلی آنکھوں مشاہدہ کر رہے ہو۔ تمہاری اخلاقی اور روحانی تربیت کا یہی ضروری سامان تو ہے جو اللہ کے 'ذکر' یعنی اس کی وحی اور ہدایت کی شکل میں تمہارے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ اس 'ذکر' کو تم تک پہنچانے کے لیے اگر ایک انسان کو، اور خود تمہارے اپنے ہی اندر کے ایک فرد کو، منتخب کیا گیا ہے تو ایسا ہونا ہی چاہیے تھا۔ کیونکہ اس ذکر کی غرض و غایت اسی وقت پوری ہو سکتی تھی جب ضرورت کے مطابق اس کی تشریح اور تفہیم بھی ہوتی رہتی اور اس کی پیروی کا عملی نمونہ بھی تمہارے سامنے آتا رہتا۔ ورنہ اس کی مطلوبہ پیروی کا طریقہ اجمال کے دھندلکے میں بڑی حد تک چھپ کر رہ جاتا، اور اللہ کی بھیجی ہوئی تعلیمات کے سارے گوشے اور تقاضے تم پر ہرگز واضح نہ ہو سکتے۔ اور جب ان تعلیمات کے سارے گوشے اور تقاضے واضح نہ ہو سکتے تو ان کی پیروی کا حق بھی ادا نہ ہو سکتا۔ لہٰذا یہ تمہاری اپنی ہی ضرورت اور مصلحت تھی کہ تمہارے ہی جیسے جذبات و احساسات اور تمہاری ہی جیسی فطری ضرورتیں رکھنے والی کسی مخلوق کو اس منصبِ رسالت پر مامور کیا جاتا۔ اور یہ مخلوق بداہتہً انسانی مخلوق ہی ہو سکتی ہے۔ فرشتہ یا کوئی اور مخلوق نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ فرشتہ یا کوئی اور مخلوق نہ بشری ضرورتیں رکھتی ہے نہ انسانی جذبات اور احساسات کا ادراک کر سکتی ہے، اور جب وہ ان ضرورتوں اور جذبات و احساسات کا ادراک نہ کر سکتی تو تمہارے مسائل کو سمجھ بھی نہ سکتی۔ اور جب وہ نہ تمہاری فطری ضرورتوں اور مانگوں کو محسوس کر سکتی نہ ان ضرورتوں اور مانگوں کی بنا پر پیدا ہونے والے مسائل کو سمجھ سکتی تو ان کے سلسلے میں تمہاری ضرورت کے مطابق برحق رہنمائی بھی نہ کر سکتی۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ تم کو ایک بشر کے رسولِ خدا ہونے پر تعجب ہو۔ تعجب کی بات تو یہ ہوتی کہ تم انسانوں کی

رہنمائی کے لیے کسی انسان کو نہیں، بلکہ کسی فرشتے کو یا کسی اور مخلوق کو رسول بنا کر تمہارے پاس بھیج دیا جاتا۔

قوم کے انکار اور اظہارِ تعجب کے سارے زور و شور کے باوجود حضرت نوح علیہ السلام اپنی دعوتی سرگرمیوں میں برابر لگے ہی رہے، جیسا کہ ایک داعیِ حق کی حیثیت سے انہیں لگا رہنا ہی چاہیے تھا۔ انھوں نے لوگوں کے ذہن پر سے جہل اور ہٹ دھرمی کا زنگ کھرچ پھینکنے کی کوئی تدبیر اٹھا نہیں رکھی۔ ان کی عقلوں کو بھی جھنجھوڑتے رہے اور ان کے انسانی جذبات سے بھی اپیل کرتے رہے۔ سمجھاتے رہے اور برابر سمجھاتے رہے۔ آہستہ بھی سمجھایا اور بالجہر بھی سمجھایا۔ 'اعلان' کے ساتھ بھی سمجھایا اور 'اسرار' کے ساتھ بھی سمجھایا۔ مگر قوم کا رٹا رٹایا جواب یہ ہوتا کہ "یہ تو ایک پاگل آدمی ہے" (اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ۔ مومنون ۲۵) اور اس سے ان کا مدعا آنجناب علیہ السلام کو صرف ایک خاص انداز کی گالی دے دینا نہیں تھا، بلکہ دراصل وہ کہنا یہ چاہتے تھے کہ جس طرح کسی پاگل شخص کی باتیں سراسر بے عقلی اور بدعقلی کی ہوتی ہیں اور ان کے اندر کسی ربط، کسی شائستگی، اور کسی معقولیت کی تلاش فضول ہوتی ہے، اُسی طرح اِس شخص کی باتیں بھی معقولیت سے یکسر خالی ہیں۔ لیکن اس 'پاگل' اور 'مجنون' نے، جس کے 'جنون' پر ہزاروں ہوش مندیاں فدا ہوں، اِس منطقی گالی کا بھی کوئی نوٹس نہیں لیا، اور ان کی سوئی ہوئی عقلوں کو جگا دینے کے لیے برابر کوشاں ہی رہا۔ مگر یہ عقلیں تو غفلت کی نہیں، موت کی نیند سو چکی تھیں (اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ۔ اعراف۔ ۶۴) اس لیے ان کا آخری فیصلہ بھی اس کے سوا کچھ نہ ہو سکا کہ:۔

لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ (شعرا۔ ۱۱۶)	نوح! اگر تم (اب بھی اپنی 'بکواس' سے) باز نہ آئے تو ہم تم کو ضرور ہی پتھر مار مار کر ہلاک کر دیں گے۔

ظاہر ہے کہ بات جب یہاں تک پہنچ گئی تو اب کوئی ساعتِ منتظرہ بھی باقی نہیں رہ گئی تھی اس لیے اس سین کا پردہ گر گیا اور زمین سے امڈا ہوا اور آسمان سے ٹوٹا ہوا طوفانِ ہلاکت ہر طرف چھا گیا۔ وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۔ ہود۔ ۴۴)۔

(۲) قومِ ہودؑ (عاد)

قومِ نوحؑ کے بعد قومِ عاد دنیا کی ایک مشہور اور زبردست قوم کی حیثیت سے ابھر کر نمایاں ہوئی، اور حضرت نوحؑ کے بعد حضرت ہود علیہ السلام اللہ کے رسول کی حیثیت سے تشریف لائے۔ دونوں طرف پھر وہی صورتِ حال تھی۔ قوم سرتا پا جاہلیت میں غرق تھی۔ اس لیے آپؑ کی دعوت کا بلند ہونا تھا کہ ایک سخت کشمکش کا آغاز ہو گیا۔ اِدھر سے دینِ حق کی جو باتیں بھی پیش کی گئیں اُدھر سے اس کا جواب انکار، استعجاب، استہزاء اور اظہارِ غیظ کی شکل میں دیا گیا۔ دعوتِ حق کے ہر بنیادی نکتے کے بارے میں کہا گیا کہ یہ تو بڑی عجیب و غریب بات ہے! ایسے خیالات تو آج تک کبھی سننے ہی میں نہیں آئے تھے! ان کا ماننا نہ ماننا تو بعد کا مسئلہ ہے، پہلے تو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ باتیں کسی طرح قابلِ فہم ہیں بھی یا نہیں؟ آخر یہ کوئی سمجھ میں آنے والا دعویٰ ہے کہ ایک اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے نہ ہو سکتا ہے، اور اس خدا سے ہم حقیر انسانوں کا راست تعلق ہے، اس کی جناب میں اپنی گذارشیں پہنچانے کے لیے کسی شفیع کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر تمہارا یہ کہنا بھی کتنا عجیب ہے کہ تمام لوگوں کو مر کر مٹ ہو جانے کے بعد ایک روز از سرِ نو زندہ کیا جائے گا۔ ایسی لایعنی بکواس پر بہ سلامتیِ ہوش و حواس کوئی کیسے کان دھر سکتا ہے؟ ہمارے ایسے ایسے بزرگ تو اِن نام نہاد حقائق سے بے خبر گذرتے چلے گئے، مگر آج تم جیسے ایک معمولی شخص پر سب کچھ منکشف ہو گیا ہے! تم کہتے ہو کہ مجھے ان حقیقتوں کا علم خدا نے دیا ہے، مگر جو شخص خود بھی ہمارے ہی جیسا ایک بشر ہو اور جو عام لوگوں کی طرح کھاتا پیتا، سوتا جاگتا، بیمار پڑتا اور تکلیفیں جھیلتا اور اپنی ضروریات کے لیے بازاروں میں چلتا پھرتا ہو، وہ اگر یہ دعویٰ کرے کہ میرے پاس ربّ السمٰوٰت والارض کے پاس سے پیام آیا ہے اور میں اس کا سفیر اور نمائندہ ہوں، تو اس کے اس مہمل دعوے کو صبر کے ساتھ کون سن سکتا ہے؟ غرض علمِ حق کی ایک ایک بات ان جاہلیت مآبوں کے لیے ناقابلِ فہم اور موجبِ حیرت ثابت ہوئی۔ توحید کا پیغام سنا تو جھڑکتے ہوئے بولے:۔

اَجِئۡتَنَا لِنَعۡبُدَ اللّٰهَ وَحۡدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعۡبُدُ اٰبَآؤُنَا	کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ ہم اکیلے ایک خدا کی بندگی کریں اور ان سب معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی ہمارے اسلاف پرستش کرتے رہے ہیں؟
(اعراف۔ ۷۰)	
اَجِئۡتَنَا لِتَاۡفِكَنَا عَنۡ اٰلِهَتِنَا	کیا تم ہمارے پاس اس غرض سے آئے ہو کہ ہمیں بہکا کر ہمارے معبودوں سے برگشتہ کر دو؟
(احقاف۔ ۲۲)	

اور بالآخر صاف صاف کہہ دیا کہ:۔

مَا نَحۡنُ بِتَارِكِيۡۤ اٰلِهَتِنَا عَنۡ قَوۡلِكَ وَمَا نَحۡنُ لَكَ بِمُؤۡمِنِيۡنَ (اعراف)	ہم تمہارے کہنے سے اپنے معبودوں کو ہرگز نہیں چھوڑنے کے، اور نہ تمہاری باتیں کبھی مان سکتے ہیں۔

ایسا ہی ردِ عمل آپؑ کی نبوت اور آخرت کے بارے میں بھی ظاہر کیا گیا، جیسا کہ اُن کے اِس ردِ عمل پر حضرت ہودؑ کے اِس متعجبانہ اظہارِ خیال سے صاف واضح ہوتا ہے:۔

..... اَوَعَجِبۡتُمۡ اَنۡ جَآءَكُمۡ ذِكۡرٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ عَلٰى رَجُلٍ مِّنۡكُمۡ لِيُنۡذِرَكُمۡ ..... الخ	..... کیا (تم میری بات نہ مانو گے) اور تمہیں اس بات پر حیرت ہوئی ہے کہ تم ہی میں سے ایک شخص کے پاس تمہارے رب کی طرف سے ذکر آیا ہے تاکہ تمہیں (آخرت کی بازپرس سے) خبردار کر دے؟
(اعراف۔ ۶۹)	

اور نہ صرف یہ کہ ان کا ردِ عمل انکار اور تعجب کا رہا۔ بلکہ آگے چل کر اس نے چیلنج کی شکل اختیار کر لی۔ انہوں نے جیسے تنگ آکر کہا۔

فَاۡتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنۡ كُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِيۡنَ (احقاف۔ ۲۲)	اچھا تو (اب) لے ہی آؤ وہ عذاب جس کی ہمیں دھمکی دے رہے ہو اگر تم واقعی سچے ہو۔

مختصر یہ کہ ان کے نزدیک دینِ حق کی بنیادی تعلیمات میں سے ہر چیز ایک اعجوبہ

اور بعید از عقل تھی، اور ان کے خیال میں ایسی بے تکی، باتیں وہی شخص منہ سے نکال سکتا ہے جو احمق ہو اور جس نے جھوٹ بولنے کی قسم کھا رکھی ہو۔ چنانچہ انھوں نے بڑے جزم کے ساتھ کہہ بھی دیا:۔

إِنَّا لَنَرَاكَ فِي سَفَاهَةٍ وَإِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكَاذِبِينَ۔ (اعراف۔۶۶)	کوئی شک نہیں کہ ہم تمہیں حماقت میں مبتلا پا رہے ہیں، اور ہمیں یقین ہے کہ تم پکے جھوٹے ہو۔

جواب میں آنجناب ؑ نے انہیں پھر سمجھانے کی کوشش کی اور درد و سوز بھرے انداز میں فرمایا 'اے میرے لوگو! میں ہرگز مبتلائے حماقت نہیں ہوں۔ میرا کہنا یہی تو ہے کہ میرے اور تمہارے رب نے مجھ کو تمہارے پاس اپنا پیام بر بنا کر بھیجا ہے، تاکہ اس کی ہدایات کے مطابق تمہیں راستی کا اور فلاح و نجات کا راستہ بتا دوں۔ ذرا سنجیدگی کے ساتھ غور کرو کہ اس میں کیا بات حماقت کی ہے یا جھوٹ ہے؟ کیا اتنی واضح بات بھی تم سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہو کہ تم لوگوں کو بھلائی کی راہ دکھانا تمہارے رب کی ربوبیت کا لازمی تقاضا تھا اور تم خود اس کے محتاج بھی تھے۔ اور کیا میرے رسولِ برحق ہونے کی کھلی ہوئی نشانیاں تمہیں نظر نہیں آ رہی ہیں؟ میری پیش کی ہوئی تعلیمات کی معقولیت، میرا اب تک کا کردار، میری پیروی کے پاکیزہ نتائج، کیا یہ سب کچھ میرے صادق ہونے کی بیّن شہادت نہیں ہے'؟ مگر عقل کے اندھوں نے ان کی ایک سن کر نہ دی، اور ان کی تعلیمات کو بدستور ناقابلِ فہم ہی قرار دیتے رہے۔ بلکہ اب ایک قدم اور آگے بڑھ کر اس رائے تک پہنچ گئے کہ ہمارے کسی معبود نے اس شخص کی پے در پے گستاخیوں پر ناراض ہو کر اس کی عقل مار دی ہے، اور یہ صرف احمق ہی نہیں ہے بلکہ عقل باختہ اور مخبوط الحواس بن کر رہ گیا ہے (اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ۔ ہود۔۵۴) اور پھر ان مدہوشوں کو ہوش اسی وقت آ سکا جب سات راتوں اور آٹھ دنوں تک چلنے والی بادِ صرصر نے انہیں تہس نہس کر کے رکھ دیا (سورہ حاقہ۔ ۶-۷)

(۳) قومِ صالح ؑ (ثمود)

قوم عاد کے بعد اس کے بقایا، ثمود، نے حضرت ہود ؑ کی لائی ہوئی ہدایتِ الٰہی کی

امانت سنبھالی۔ مگر زیادہ مدت نہ گذری تھی کہ یہ امانت خیانت کی نذر ہونے لگی، اور رفتہ رفتہ یہ قوم بھی جاہلیت کی آغوش میں جا پڑی۔ حضرت صالح علیہ السلام اس کی ہدایت کے لیے بھیجے گئے، اور ایک بار پھر حق و باطل کا معرکہ گرم ہوگیا۔ نبوت سے پہلے حضرت صالح قوم کے چشم و چراغ سمجھے جا رہے تھے اور ان سے وہ بڑی امیدیں وابستہ کیے ہوئے تھی مگر توحید کی پکار بلند کرتے ہی وہ اس کے لیے قابلِ نفرت شخصیت قرار پا گئے۔ لوگوں نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے اُن سے کہا:۔

یَا صَالِحُ قَدْ كُنْتَ فِينَا	صالح! کل تک ہمیں تم سے بڑی امیدیں رہی
مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰنَآ	ہیں (لیکن اب یہ کیا ہو رہا ہے کہ) تم ہمیں
اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا	اُن معبودوں کی پرستش سے روک رہے ہو
(ہود۔ ۶۲)	جن کو ہمارے اسلاف پوجتے رہے ہیں؟

دعوتِ توحید ہی کی طرح آپؑ کے اعلان نبوت کو بھی فراڈ قرار دے دیا گیا، اور اس کی نسبت سے آپ پر یہ تبصرہ کیا گیا:۔

اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ	تم تو نرے سحر زدہ ہو، تم اس کے سوا اور
مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا۔	کچھ نہیں کہ ہمارے ہی جیسے ایک بشر ہو۔
(شعراء ۱۵۳، ۱۵۴)	

قوم کے اس تبصرے میں وہی ساری بوالعجبیاں موجود تھیں جو حضرت نوحؑ اور حضرت ہود علیہما السلام کی قوموں کے جوابات میں پائی جاتی رہی ہیں، اور جن کی بقدرِ ضرورت تفصیل آپ ابھی پڑھ چکے ہیں۔

(۴) قوم لوطؑ

حضرت صالح علیہ السلام کے بعد جن اور انبیاء کی بعثت ہوتی رہی، کم و بیش اسی طرح کے جوابوں اور تبصروں سے انہیں بھی "نوازا" جاتا رہا۔ یہاں تک کہ حضرت لوطؑ کا دور آیا۔ آپؑ کو روایتی مشکلوں، رکاوٹوں اور مخالفتوں کے علاوہ ایک اور عجیب و غریب

رکاوٹ سے بھی سابقہ پیش آیا۔ یہ رکاوٹ جاہلیت کے سُجھائے ہوئے اِس انتہا پسندانہ نظریے کی پیدا کی ہوئی تھی کہ آدمی کی آزادیِ عمل کو اخلاقیات کی زنجیر نہیں پہنائی جا سکتی۔ قومِ لوطؑ اس حیوانی نظریۂ آزادی کو پورے شرحِ صدر کے ساتھ اپنائے ہوئے تھی جس کے نتیجے میں وہ ایک گھناؤنی قسم کی اخلاقی غلاظت میں لت پت ہو کر رہ گئی تھی۔ اس لیے حضرت لوطؑ نے شرک اور کفر کی بداعتقادیوں کے ساتھ ساتھ اُس کی اِس عادتِ بد پر بھی زبردست تنقیدیں کیں۔ مگر چند ایک کو چھوڑ کر کسی نے بھی ان کی تنقیدوں اور نصیحتوں پر ذرہ برابر توجہ نہ کی۔ توجہ کرنا تو درکنار ان 'نکٹوں' نے الٹا ان کی 'ناک' کا مذاق اڑایا، اور اُن پر اور ان کے اہلِ ایمان ساتھیوں پر طنز کیا کہ "یہ بڑے پاک باز لوگ ہیں" (اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ۔ اعراف-۸۲) گویا ان کا کہنا یہ تھا کہ اگر لوطؑ کی اور ان کے پیروؤں کی پسند وہ نہیں ہے جو ہماری ہے تو نہ رہے، اور وہ اسے بری سمجھتے ہیں تو سمجھتے رہیں اس کا انھیں اختیار ہے۔ مگر وہ آخر دوسروں سے بھی ایسا ہی سمجھ لینے کا مطالبہ کرنے والے کون ہوتے ہیں؟ یہ تو ہر شخص کا اپنا ذاتی معاملہ ہے، اس میں انھیں دخل دینے کا حق کہاں سے پہنچتا ہے؟ شخصی آزادی کا یہی حیوانی نظریہ تھا جس نے بات طنز اور تمسخر سے آگے بڑھا کر جلاوطنی کے فیصلے تک پہنچا دی۔ قوم نے جب دیکھا کہ لوطؑ اپنی 'ضد' سے باز نہیں آرہے ہیں اور ہمیں اپنی 'نام نہاد' نصیحتوں سے برابر تنگ کرتے ہی چلے جا رہے ہیں تو اس کے اندر ضبط کا یارا نہ رہ گیا۔ ایک نے دوسرے سے کہا، بہت ہو چکا، اب اس عجیب وغریب 'مصیبت' سے نجات حاصل کر لینا چاہیے۔ لہٰذا اِن 'بکواسیوں' کو دیس نکالا دے دو (اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ۔ ایضاً) صاف ظاہر ہے کہ دوسرے انبیاءؑ کی قومیں جہاں بے عقلی اور بدعقلی ہی کا شکار تھیں، وہاں یہ ناہنجار قوم آگے بڑھ کر عقلی سڑاند کی لعنت تک میں گرفتار ہو چکی تھی، اور اس نے حیوانیت کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ جس بدنصیب قوم کو جاہلیت نے اِس حد تک اپنا 'معمول' بنا کر رکھ دیا تھا اور جس کی عقل اس قدر ماؤف، اور فطرت اس درجہ مسخ ہو کر رہ گئی تھی، اُس سے اس امر کی کیا توقع ہو سکتی تھی کہ وہ توحید اور آخرت اور خدا پرستی کی باتوں پر توجہ دے پائے گی۔ چنانچہ حضرت لوطؑ کی ہر تلقین اور رہر

تفہیم کو وہ برابر ٹھکراتی رہی، ٹھکراتی رہی، یہاں تک کہ سنتِ الہٰی نے اس کی رسی کھینچ لی اور ایک ہولناک انفجاری زلزلے نے اس کی بستی کو تلپٹ کر کے رکھ دیا۔ (جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا (ہود - ۸۲)

(۵) قومِ شعیبؑ

کچھ مدت کے بعد جب اہل مدین اور اصحاب الایکہ نے جاہلیت کی باگ ڈور سنبھالی تو رحمتِ حق نے ان کی اصلاح کے لیے حضرت شعیب علیہ السلام کو مامور کیا۔ یہ لوگ بھی اپنے پیش رووں سے کچھ مختلف نہ نکلے اور انہیں بھی جب حق کا تریاق پلانے کی کوشش کی گئی تو اس کی تلخی اور سمیت کی شکایت ہوگئی۔ قومِ لوطؑ کی طرح یہ بھی اعتقادی گمراہیوں کے ساتھ ساتھ ایک اور خاص اخلاقی عیب تجارتی بدعنوانیوں کے عیب، میں بڑی شہرت حاصل کیے ہوئے تھے۔ اس لیے حضرت شعیبؑ نے انہیں توحید اور آخرت پر ایمان لانے کی دعوت دینے کے ساتھ ہی ان کے اس عیب پر اظہارِ نکیر بھی کیا۔ لیکن نہ یہ دعوت ان کے حلق سے اتر سکی، نہ اِس اظہارِ نکیر کی کوئی معقول وجہ ان کی سمجھ میں آسکی۔ توحید کی دعوت کے جواب میں انہوں نے کہا:-

يَاشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ	اے شعیبؑ! کیا تمہاری یہ نماز تمہیں (وہم سے
تَاْمُرُكَ اَنْ نَتْرُكَ	یہ مطالبہ کرنے کا) حکم دے رہی ہے کہ ہم ان
مَايَعْبُدُ اٰبَاؤُنَا-	معبودوں کو چھوڑ دیں جنہیں ہمارے اسلاف
(ہود - ۸۷)	پوجتے رہے ہیں؟

"جنہیں ہمارے اسلاف پوجتے رہے ہیں" کہنے سے ان کا مدعا بس ایک تاریخی حقیقت کا یاد دلا دینا نہیں تھا، بلکہ اس جملے کے اندر دراصل ان کا اپنے مسلک کے حق میں ایک بہت بڑا استدلال پوشیدہ تھا۔ وہ کہنا یہ چاہتے تھے کہ ایسے عالی مقام بزرگوں کے مقابلے میں تمہاری حیثیت ہی کیا ہے؟ پھر ہم اس بات کو کیسے مان لیں کہ وہ تو راہِ راست سے ناآشنا تھے اور بس ایک تم واقف ہو؟ ان بزرگوں کا فلاں فلاں ہستیوں کو معبود ماننا

غلط تھا، اور تمہاری بات صحیح ہے؟

آپؑ کی نبوت کی بات سن کر بولے 'باولے ہو گئے ہو' تم پر جادو کر کے تمہاری عقل ماردی گئی ہے۔ جھوٹ بکتے ہو کہ اللہ رب العالمین کے فرستادے ہو' ہمارے ہی جیسا ایک معمولی بشر ہوتے ہوئے مالک الملک کے فرستادے کیسے ہو سکتے ہو؟ (اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِیْنَ وَمَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَاِنْ نَّظُنُّکَ لَمِنَ الْکٰذِبِیْنَ۔ شعراء ۱۸۶)
دعوت کے بنیادی نکات کو اس قوم نے جس طرح رد کیا، اور جن 'دلائل' کے ساتھ رد کیا، اس میں کوئی نیا پن نہ تھا، بلکہ تمام تر اُنہی طرفہ باتوں کا اعادہ تھا جو اس کی پیش رو جاہل قومیں اپنے پیغمبروں کی دعوت کے جواب میں کہتی رہی ہیں۔ البتہ حضرت شعیبؑ نے جب قوم کی کاروباری بے ایمانیوں پر بھی گرفت کی تو جاہلیت کا ایک نیا نظریہ سامنے آیا۔ اور اس کی وجہ سے دعوتِ حق کو بھی ایک نیا تجربہ ہوا۔ آپؑ کی اس گرفت پر صرف یہی نہیں ہوا کہ انھوں نے اپنی روش بدلی نہیں اور آپ کی نصیحت کو ماننے سے انکار کر دیا، بلکہ اس پر یہ اعتراض بھی کیا کہ یہ روٹی روزی کے معاملے میں اخلاق کو کہاں گھسائے دے رہے ہو؟ کیا ہم تمہارے اِس احمقانہ فلسفہ پر اپنے معاشی مفادات کو قربان کر دیں؟ ترازو کی ڈنڈی مارنے کی کارگر تدبیر سے جو فائدے ہمیں حاصل ہوتے ہیں، محض اس لیے چھوڑ دیں کہ آخرت میں اس سے نقصان ہوگا؟ اُس آخرت میں' جو بجائے خود کوئی سمجھ میں آنے والی چیز نہیں ہے؟ اور اگر بالفرض وہ کبھی آنے والی ہو بھی تو اس کی خاطر اپنی دنیا کو برباد کر دینا اور نقد کو 'نسیہ' پر نثار کر دینا کون سی عقل مندی ہے؟ بڑے 'حلیم' اور 'رشید' بننے چلے ہو۔ تمہاری نماز اگر توحید اور آخرت کا اور اخلاق وصفائی معاملات کا حکم دیتی ہے تو تم بطور خود اس پر عمل کرتے رہو۔ ہمیں کیوں مجبور کرتے ہو کہ اپنا مجرب طریقہ چھوڑ دیں؟ مذہب کا معاملہ ذاتی اور انفرادی معاملہ ہے' دوسروں پر اپنے 'مزعومات' کو مسلط کرنے کا تمہیں کیا حق ہے؟ (قَالُوْا یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُکَ تَاْمُرُکَ اَنْ نَّتْرُکَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا اِنَّکَ لَاَنْتَ الْحَلِیْمُ الرَّشِیْدُ۔ ہود۔ ۸۷) پیغمبرؑ نے اُن کی اِس کج فکری کو دور کرنے اور اس جاہلانہ تصورِ مذہب کو درست کرنے کی ہر ممکن کوشش کی' ان کے سوئے ہوئے ضمیر کو

جنجھوڑ جنجھوڑ کر جگانا چاہا۔ اللہ تعالیٰ سے استغفار کرنے کی نصیحت فرمائی۔ انجام سے ڈرایا۔ خدا کے قانونِ عدل کی بار بار یاد دلائی، اور اس کی سنتِ جزا و سزا سے بھی باخبر کیا۔ مگر آپؑ کی کوئی نصیحت، کوئی تلقین، کوئی تفہیم اور کوئی تہدید ان کے دماغ کے بند دروازوں کو کھول نہ سکی۔ وہ انکار پر انکار کرتے رہے، اور آخرت میں صاف صاف کہہ دیا کہ:۔

يَا شُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيرًا مِّمَّا تَقُولُ وَإِنَّا لَنَرَاكَ فِينَا ضَعِيفًا وَّلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنَاكَ (ہود۔ ۹۱)	شعیبؑ! تمہاری اکثر باتیں تو ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتیں، ہم دیکھتے ہیں کہ تم ہمارے درمیان ایک کمزور سے آدمی ہو، اگر تمہارا قبیلہ نہ ہوتا تو ہم تمہیں سنگسار کیے بغیر ہرگز نہ چھوڑتے۔

ان لوگوں کا یہ کہنا کہ "تمہاری اکثر باتیں تو ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتیں"، ظاہر ہے کہ ان کے اپنے قصورِ فہم کا اعتراف نہ تھا، بلکہ خود حضرت شعیبؑ کی عقل و فہم پر ایک گہرا طنز تھا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی یہ بات بجائے خود ایک امرِ واقعہ بھی تھی۔ وہ فی الواقع یہ نہیں سمجھ پا رہے تھے کہ شعیبؑ کیا کہہ رہے ہیں، اور یہ توحید و آخرت کے 'افسانے' کہاں سے سنا رہے ہیں۔ اور ان کے یہ نہ سمجھ پانے کی وجہ یہ تھی کہ جاہلیت نے اپنے مسلسل نفسیاتی عمل سے ان کی فہم و فکر کی دنیا ہی بدل ڈالی تھی، اور اس کے اندر حق کو پا سکنے کی کوئی صلاحیت ہی باقی نہیں رہنے دی تھی۔ جس طرح ایک پیدائشی اندھا ہزار سمجھانے کے باوجود یہ نہیں سمجھ پاتا کہ سفیدی کیا چیز ہوتی ہے اور سرخی کسے کہتے ہیں، اسی طرح شرک اور کفر اور خواہش پرستی کے چہ بچہ میں ڈوبے ہوئے لوگوں کے لیے یہ ممکن نہیں رہ جاتا کہ توحید اور آخرت اور رسالت کے اعلیٰ حقائق کو قابلِ فہم پا سکیں۔ اس لیے حضرت شعیبؑ کی جاہلیت زدہ قوم نے ان سے اگر "لَا نَفْقَهُ كَثِيرًا مِّمَّا تَقُولُ" کہا تھا تو از روئے واقعہ کچھ غلط نہیں کہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر اس قوم کا حال یہی ہوتا ہے جو جاہلی افکار و تصورات کی گود میں پلی بڑھی ہو۔ آپ نے اوپر کے صفحات میں پرانے زمانوں کی چند مشہور قوموں کے متعلق قرآن کریم کا جو یہ بیانِ واقعہ پڑھا ہے، اور ابھی آگے چل کر بعض اور قوموں کے بارے میں بھی پڑھیں گے، کہ ان کے لیے توحید اور آخرت اور رسالت، ہر چیز ایک اچنبھے کی بات ثابت ہوتی رہی، تو ان سب کا یہ اظہارِ

تعجب بھی دراصل اسی " لَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ " کا مظہر ہوتا تھا۔

(۶) قومِ فرعون

شب و روز کی گردش حسبِ معمول جاری رہی۔ یہاں تک کہ سرزمینِ مصر میں قبطی قوم کو عروج ملا، اور فرعونی خاندان کی حکومت قائم ہوگئی۔ یہ لوگ پوری طرح جاہلیت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ جب بنی اسرائیل کی اصلاح و ہدایت اور رہنمائی کے لیے اور فرعون کے مظالم سے انہیں نجات دلانے کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے تو قبطی قوم کو بھی حق کی دعوت دینے کی ذمہ داری ان کے سپرد تھی۔ انبیائی طریقِ دعوت کے مطابق حضرت موسیٰؑ نے قوم کے سربراہ کی حیثیت سے فرعون اور اس کے درباری امراء کو اپنا پہلا مخاطب بنایا۔ فرعون کے دربار میں جاکر اس کے سامنے اپنی نبوّت کا اعلان کیا اور توحید کی دعوت پیش کی۔ اس دعوت کا پیش ہونا تھا کہ واقعات کے پردے پر پھر وہی مناظر نمودار ہونے لگے، اور برابر ہوتے رہے، جو حضرت نوحؑ کے زمانے سے لے کر اب تک نمودار ہوتے چلے آرہے تھے۔ حضرت موسیٰؑ کو قبطیوں تک حق کا پیغام پہنچانے کا جو حکم دیا گیا تھا وہ ان لفظوں میں دیا گیا تھا:۔

اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ قَوْمَ فِرْعَوْنَ اَلَا یَتَّقُوْنَ (شعراء۔ ۱۰۔۱۱)	کہ ظالم قوم کے پاس جا — فرعون کی قوم کے پاس — کیا یہ لوگ (اپنے انجام سے) ڈر نہیں رہے ہیں؟

جس قوم کا اللہ تعالیٰ نے گویا نام ہی "اَلْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ (ظالم قوم) رکھ دیا ہو، اندازہ کیجیے کہ وہ حق سے کتنی دور، اور باطل و جاہلیت کی کیسی دلدادہ رہی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ اس دعوت کا جو جواب اس ظالم قوم نے دیا وہ توقع کے ٹھیک مطابق یہ تھا:۔

مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِیْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِیْنَ (قصص۔ ۳۶)	ہم نے تو ایسی باتیں اپنے پہلے کے بزرگوں کے بارے میں کبھی نہیں سنیں۔

اس چند لفظی جواب میں انکار بھی تھا، استعجاب بھی تھا، اور اس کی دلیل بھی تھی۔ دلیل یہ تھی کہ جب ایسے ایسے بزرگ نہ خدا کو ایک اور لاشریک مانتے تھے، نہ

قیامت اور آخرت کا تصور رکھتے تھے، اور نہ کسی عام آدمی کے فرستادۂ خدا ہو سکنے کے وہ قائل تھے، تو آج ایک معمولی شخص کی زبان سے نکلی ہوئی یہ نئی اور انوکھی باتیں کیسے مان لی جا سکتی ہیں؟ ماننا تو درکنار، ان کے تو معقول اور قابلِ غور ہونے کا امکان بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

خیر قوم تو اسی حد پر رک گئی، کہ وہ صرف 'ظالم' تھی، مگر فرعون صرف ظالم ہی نہیں ظالموں کا سردار، اور سردار ہی نہیں، بزعمِ خویش ان کا 'الٰہ' اور 'ربّ اعلیٰ' تھا۔ اس لیے وہ ظلم اور سرکشی کے آخری درجے تک جا پہنچا، اور اللہ تعالیٰ کی توحید اور لاشریک معبودیت کے انکار سے آگے بڑھ کر اس کی ہمہ گیر ربوبیت، معبودیت، آقائی اور حاکمیت، سب کچھ کا انکار کر بیٹھا۔ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام نے جب حکمِ الٰہی کی تعمیل کرتے ہوئے اس کے بھرے دربار میں جا کر اعلان کیا کہ:-

اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (شعراء - ۱۶) — بے شک ہم رب العالمین کے فرستادے ہیں۔

تو وہ فوراً بول اٹھا:-

وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ - (شعراء - ۲۳) — یہ رب العالمین کیا چیز ہے؟

اس کے اِس سوال میں استعجاب تو ضرور تھا، مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ دہریہ اور منکرِ خدا تھا۔ قرآن مجید کے اندر اس کے جن دوسرے اقوال کو مختلف مقامات پر نقل کیا گیا ہے، ان میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ وہ خالق و مالکِ کائنات ہی کا نہیں فرشتوں کا بھی قائل تھا (ملاحظہ ہو سورہ زخرف آیت ۵۳) اس لیے اس کے کہنے کا مطلب صرف یہ تھا کہ ملکِ مصر کی حد تک میں ہی سب کچھ ہوں، اس مملکت کا فرمانروائے مطلق بھی ہوں اور اس کے باشندوں کا معبود اور ربِّ اعلیٰ بھی ہوں۔ اور یہ اس کا قہر، اور جاہلیت کا سحر تھا کہ پوری قبطی قوم اس کے اس احمقانہ دعوے کے آگے سپر ڈالے ہوئے تھی، جیسے قرآن مجید نے یوں بیان فرمایا ہے کہ "اس نے اپنی قوم کو بے وزن بنا رکھا تھا اور وہ اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے تھی"، (فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ - زخرف ۵۴)

پس وہ رب العالمین اور فرماں روائے کائنات کی ہستی کا منکر نہیں تھا، بلکہ ایسے رب العالمین اور فرماں روائے کائنات کا منکر تھا، بلکہ یوں کہیے کہ منکر بنا ہوا تھا، جس کی ربوبیت اور فرمانروائی ملکِ مصر پر بھی اُسی طرح قائم ہو جس طرح باقی کائنات پر قائم ہے۔ اپنے اسی دعوے کی مناسبت سے قدرتی طور پر، اس کا خیال یہ تھا کہ میں کسی بیرونی ہدایت کا ہرگز محتاج نہیں ہوں۔ موسیٰؑ جھوٹ کہتا ہے کہ میں اللہ رب العالمین کا بھیجا ہوا نبی ہوں۔ میرے پاس کسی نبی کے آنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور اگر بالفرض باقی کائنات کے فرماں روا کو مجھ فرماں روائے مصر کے پاس اپنا کوئی ایلچی بھیجنا ہی ہوتا تو کسی ایسے عالی مرتبہ شخص کو بھیجتا جو اگر خود فرشتہ نہ ہوتا تو اسکے جلو میں کچھ فرشتے ضرور ہوتے، جو اس کے آگے ہٹو بچو کی منادی کرتے ہوئے چلتے، نیز امراء و شہزادگان کی طرح اس کے ہاتھوں میں سونے کے کنگن ہوتے۔ گویا بشر ہوتے ہوئے بھی وہ فوق البشر ہوتا۔ (سورۂ زخرف، آیت ۵۳) حماقت اور جاہلیت کا کمال دیکھیے کہ فرعون خود تو ایک بشر ہونے اور اپنے جلو میں کوئی ایک بھی فرشتہ نہ رکھنے کے باوجود 'معبود' اور 'رب اعلیٰ' ہو سکتا تھا، مگر حضرت موسیٰؑ اللہ تعالیٰ کے رسول نہیں ہو سکتے تھے! فرعون کی یہ باتیں، خصوصاً اس کا یہ دعویٰ کہ وہی اہلِ مصر کا الٰہ اور رب اعلیٰ ہے اور اس کا یہ سوال کہ 'رب العالمین کیا چیز ہے'، اس قدر بودا تھا کہ اس کی حقیقت کسی معمولی سمجھ رکھنے والے شخص پر بھی مخفی نہیں ہو سکتی، اس لیے اس کے اس جاہلانہ سوال کے جواب میں حضرت موسیٰؑ نے دو ہی ایک جملے کہے تھے کہ اس کی زبان تالو سے چپک کر رہ گئی، اور پھر اس کے بجائے کہ وہ اپنی اوقات پر نظر ڈال کر سیدھی طرح حق بات کو مان لیتا، اپنے موقف کی حمایت میں وہی 'لاجواب دلیل' پیش کر دی جسے ہر جبارِ عنید معقولیت کے میدان میں شکست کھا جانے کے بعد پیش کیا کرتا ہے۔ اس نے کہا "موسیٰ! اگر تم نے میرے سوا کسی اور کو اپنا رب بنایا تو میں یقیناً تجھے قید کر دوں گا۔" (لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِیْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ۔ شعراء - ۲۹)

یہ پرانے زمانوں کی چند تاریخی شہادتیں ہیں۔ ان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ خدا پرستی، آخرت اندیشی، نیکی، تقویٰ اور حسنِ خُلق کے پاکیزہ تصورات کو، جو عقلِ سلیم

کی محبوب متاع اور روحِ انسانی کی مرغوب غذا ہیں، آدمی بسا اوقات کتنی ناگواری اور ترش روئی کے ساتھ ٹھکرا دیا کرتا ہے۔ پھر ان شہادتوں سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اس احمقانہ رویّہ کی وجہ ہر دور میں، ہر جگہ اور ہر قوم کے ہاں ہمیشہ ایک ہی رہی ہے۔ انسان کی خود فراموشی، ذہنی پستی، فکری کجی، مزاجی فساد، باپ دادا کی اندھی تقلید، نفس پرستی اور جاہلی حمیت۔ یہی وہ نامبارک حجابات ہیں جو ہدایت کی روشنی کو ذہنوں کے اندر پہنچنے نہیں دیتے، اور آدمی کو اس سے بیگانۂ محض بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ ورنہ ممکن نہ تھا کہ انسان اُس حق سے، جس کے ساتھ اس کی اصل فطرت کو وہی تعلق ہے جو تعلق مقناطیس سے صاف لوہے کو ہوتا ہے، یوں اظہارِ بیزاری کرتا۔ چنانچہ اُن افراد کا حال بالکل دوسرا رہا جو اگرچہ جاہلیت کے اندھیرے میں گم پڑے تھے، مگر ان کے دل کی آنکھوں میں ابھی بینائی موجود تھی، اور ان کی فطرت قبولِ حق کی صلاحیت سے محروم نہ ہو پائی تھی۔ جب حق کی روشنی پھیلی تو وہ اس کی طرف دوڑ پڑے جس کے بعد نہ جاہلی معاشرے کا بندھن انہیں باندھ کر رکھ سکا نہ ذاتی مصالح و مفادات ان کے پاؤں کی بیڑی بن سکے، حتیٰ کہ وقت کا ظالم اقتدار بھی انہیں اپنے فیصلے سے باز نہ رکھ سکا۔ معاشرے نے جب دباؤ ڈالا تو ان کا جواب تھا" وَمَالِیَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِیْ فَطَرَنِیْ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ۔ یٰس۔۲۲" (آخر میں اس خدا کی بندگی کیوں نہ کروں جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور اسی کے پاس تم سب کو بھی لوٹ کر جانا ہے؟) اور جب ظالم اقتدار نے انہیں سولی پر چڑھا دینے کی دھمکی دی تو اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے" فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ۔ طٰہٰ۔۷۲" (جو کچھ تجھے کرنا ہو کرلے) ظاہر ہے کہ اُن بدنصیبوں کو اس طرح کی توفیق کیسے مل سکتی تھی جن کے اندر ذوقِ حق طلبی کا شائبہ بھی باقی نہیں رہ گیا تھا، اور جنہوں نے انسانیت اور نفسانیت کو ہم معنی سمجھ رکھا تھا۔

نے زیادہ سے زیادہ دور رہنا چاہا ہے، اس لیے اپنی دعوت پیش کرنے کے لیے اصل توجہ دلائل و شواہد پر رکھی ہے۔ جس عقیدے کی بھی تلقین کی ہے، اس کی حقانیت کو موثر، دل نشین اور مضبوط دلیلوں سے ثابت کیا ہے۔ یہ دلیلیں ہر طرح کی ہیں۔ عقلی بھی ہیں، فطری اور وجدانی بھی ہیں، اور تاریخی بھی ہیں، اور اس کثرت سے ہیں کہ قرآن کے تقریباً پانچویں چھٹے حصہ کو محیط ہیں۔ پھر ان کی نوعیت ایسی ہے کہ کسی دور کے اور کسی ذہنی سطح کے آدمی کے لیے بھی انہیں غیر کارگر نہیں کہا جا سکتا۔ دنیا کی کوئی آسمانی یا غیر آسمانی مذہبی کتاب ایسی نہیں پائی جا سکتی جس نے وعظ و نصیحت اور جذباتی اپیلوں سے آگے بڑھ کر اتنا پُرزور، اتنا موثر اور اتنا مُسکت استدلالی انداز بیان اختیار کیا ہو جیسا کہ قرآن حکیم نے کیا ہے۔

دلائل کے ساتھ اپنی دعوت کا پیش کرنا اس حقیقت کا ناقابلِ انکار ثبوت ہے کہ قرآن کا خطاب اور اس کی اپیل براہِ راست انسان کی عقل اور فطرت سے ہے۔ خود اس کی استدلالی آیتوں کے آخر میں جگہ جگہ اس بات کی صراحت بھی موجود ہے۔ مثلاً:-

۱- اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ (آل عمران - ۱۹۰)	بے شک آسمانوں اور زمین کی ساخت میں، اور شب و روز کی آمد و رفت میں عقل والوں کے لیے (توحید باری اور روزِ جزا کی) بہت سی دلیلیں ہیں۔
۲.... یُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ (نور - ۴۴)	.... اللہ رات اور دن کو (ایک دوسرے سے) پلٹتا رہتا ہے۔ اس امر واقعہ کے اندر اہلِ بصیرت کے لیے عبرت کا بڑا سامان ہے۔
۳.... اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰی (طٰہٰ - ۵۴)	.... یقیناً عقل والوں کے لیے اس کے اندر بہت سی نشانیاں ہیں۔
۴.... هَلْ فِیْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِیْ حِجْرٍ۔ (فجر - ۵)	.... ان چیزوں کے اندر اہلِ دانش کے لیے (توحید اور آخرت کی صداقت پر) کوئی شہادت ہے (یا نہیں؟)

بَدَءَ الْاِسْلَامُ غَرِیْبًا (۱)

(اسلام کا آغاز غربت کی حالت میں ہوا تھا)

اَلْاِسلام کی دعوت

ساتویں صدی عیسوی میں اللہ رب العالمین کا آخری ہدایت نامہ نازل ہوا، اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے آخری پیغمبر کی حیثیت سے مبعوث ہوئے۔ چونکہ یہ نبوت آخری نبوت تھی اور یہ ہدایت نامہ اللہ تعالیٰ کا آخری ہدایت نامہ تھا، اور ان دونوں باتوں کے قدرتی نتیجے کے طور پر وہ دین بھی اللہ کا آخری دین تھا جسے اِس نبوت نے اور اِس ہدایت نامہ نے پیش کیا تھا، اس لیے یہ دین کئی ایسی امتیازی خصوصیتوں کا مالک تھا جو پہلے کے کسی دین کو حاصل نہ تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دین کا نام 'اَلْاِسلام' رکھا، جب کہ پچھلے دینوں میں سے کسی کا بھی نام اسلام نہ تھا۔ وہ صرف معناً اسلام (خدا کے حضور کامل سرفگندی) تھے۔ اصطلاحًا اسلام نہ تھے۔ یہ شرف صرف اس آخری دین کے لیے اٹھا رکھا گیا تھا۔

اَلاسلام کی امتیازی خصوصیتوں میں سے ایک اہم خصوصیت اِس کی کتاب، 'قرآن' کے اندازِ دعوت کی بھی ہے۔ اس کے دعوتی کلام میں تحکم کا شائبہ تک نہیں ہے۔ اس نے کہیں یہ نہیں کہا ہے کہ چونکہ میں یہ دعوت پیش کر رہا ہوں اور اسے حق و منجانب اللہ بتا رہا ہوں، اس لیے اسے مان لو۔ ہاں اس نے وعظ و نصیحت کا انداز ضرور اختیار کیا ہے، مگر اس کی حیثیت بھی ثانوی رکھی ہے۔ کیونکہ محض وعظ و نصیحت جذبات کو متاثر تو ضرور کر لیتی ہے، لیکن عقلوں کے اطمینان کا اس میں کوئی سامان نہیں ہوتا۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو 'تحکم' اور 'نصیحتِ محض' میں حقیقی فاصلہ بہت کم رہ جاتا ہے۔ چونکہ تحکمی رویہ اختیار کرنے سے قرآن نے

۵ .... اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (روم-۲۴) — بلا شبہ اس میں سوجھ بوجھ سے کام لینے والوں کے لیے کئی دلیلیں ہیں۔

یہ اور اس طرح کی بے شمار آیتیں جہاں اس حقیقت کو نمایاں کرتی ہیں کہ قرآن عزیز نے انسان کو ایک صاحبِ عقل و فہم مخلوق ہونے ہی کی وجہ سے اپنی دعوت پر ایمان لانے کا مکلّف ٹھیرایا ہے، وہاں ان سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ جو کوئی اپنی عقل سے ٹھیک طور پر کام لے گا اس پر اس دعوت کی صداقت لازمًا منکشف ہو رہے گی، حق پسندی اور اخلاص کے ساتھ غور و فکر کرنے والا کوئی شخص اس توفیق سے محروم نہیں رہ سکتا۔

اندھا بہرا ماحول

ایک ایسی دعوت کے بارے میں، جس نے براہِ راست انسانی عقل کو خطاب کیا ہو اور اپنی صداقت پر اسے مطمئن کر دینے کے لیے تذکیر و تفہیم اور دلیل و برہان کی کوئی کوشش اٹھا نہ رکھی ہو، توقع تو بظاہر یہی رکھی جا سکتی تھی کہ اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا، اور دل و دماغ اس کے آگے جھک پڑیں گے۔ مگر اس طرح کی کوئی توقع جس طرح پہلے کبھی نہیں پوری ہو سکی تھی اسی طرح اِس بار بھی نہ ہو سکی۔ اور صرف اس وجہ سے نہ ہو سکی کہ معاشرے میں عقل و بصیرت کی بینائی کا قحط تھا۔ سورج جب نکلتا ہے تو ہر طرف روشنی پھیلی نظر آتی ہے، مگر اس روشنی سے فائدہ وہی لوگ اٹھا پاتے ہیں جن کی نگاہوں میں بینائی موجود ہوتی ہے۔ جن کی آنکھوں میں کالا پانی اتر آیا ہو، یا جن کی پتلیوں پر سفیدی کی موٹی تہ جم گئی ہو، ان کے لیے دنیا اندھیری کی اندھیری ہی رہ جاتی ہے۔ یہی معاملہ اندر کی آنکھوں کا بھی ہے۔ یہ آنکھیں اگر کسی وجہ سے اپنی بینائی کھو چکی ہوں، یا ان پر کوئی گہرا پردہ پڑ گیا ہو، تو کسی بھی نامانوس سچائی کا ان سے ادراک نہیں کرایا جا سکتا۔ اسلام جب آیا تھا اس وقت معاشرہ ایسے ہی اندھوں بہروں سے بھرا ہوا تھا۔ قرآنِ کریم نے ان کے اندھے بہرے پن کا نقشہ ان لفظوں میں کھینچا ہے:-

لَہُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَہُوْنَ بِہَا — ان کے (ایسے) دل ہیں جن سے وہ سمجھتے بوجھتے

وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا أُولٰئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ وَاُولٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُوْنَ۔

(اعراف - ۱۷۹)

نہیں، ان کے (ایسی) آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں، ان کے (ایسے) کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں۔ یہ لوگ چوپایوں کے مانند ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو یکسر غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ دعوتِ حق کے بارے میں غور و فکر کی ساری صلاحیتیں کھو بیٹھے ہیں۔ حقائق تک پہنچنے کے لیے انہیں قدرت نے جو آلات اور ذرائع عطا کیے تھے، ان سے سارے کام تو وہ لیتے ہیں، مگر وہی ایک کام نہیں لے پاتے جو اصل کام ہے، اور جب لینا بھی چاہتے ہیں تو رُخ اُلٹی سمت میں کر لیتے ہیں۔ انہیں آنکھ (یعنی قوتِ بینائی) اصلاً اس لیے دی گئی تھی کہ وہ اس کے ذریعہ حقائقِ عالم کا ٹھیک ٹھیک مشاہدہ کریں، کان (قوتِ سماعت) کے عطا کیے جانے کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ حق و صداقت کی باتوں کو غور اور توجہ سے سنیں، دل (قوت فہم) کے بخشے جانے کی اصل غایت یہ تھی کہ آنکھوں کے کیے ہوئے مشاہدات اور کانوں سے سُنی ہوئی باتوں کا سنجیدگی اور فرض شناسی کے جذبے سے جائزہ لے کر صحیح نتائج تک پہنچیں۔ مگر اس معاملہ میں انہوں نے چوپاؤں کی سی حیثیت اختیار کر رکھی ہے۔ خالقِ حکیم کے مہیّا کیے ہوئے ان ذرائعِ علم و تحقیق سے وہ کچھ ویسے ہی کام لے کر رہ جاتے ہیں جیسے کہ لایعقل مویشی اپنی آنکھوں اور کانوں سے لیا کرتے ہیں۔ ان مویشیوں کا حال یہ ہے کہ اگر ان کا چرواہا ان سے پکار کر کچھ کہتا ہے تو وہ مطلق نہیں سمجھ پاتے کہ کہنے والا فی الواقع کیا کہہ رہا ہے۔ صرف اتنا انہیں محسوس ہو کر رہ جاتا ہے کہ کوئی چیخ چِلا رہا ہے۔ اسلام کی دعوت کے باب میں ٹھیک یہی حال اِن اہلِ کفر کا ہے۔ انہوں نے اس کے حق میں اپنی دیکھنے، سننے اور سوچنے سمجھنے کی قوتوں کو بالکل ناکارہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ داعی کی باتوں کے معانی کا ان کے ذہنوں میں مطلق گذر نہیں ہوتا، صرف اس کے الفاظ کی آوازیں ہوتی ہیں جو ان کے کانوں کے پردے سے ٹکراتی اور پھر ہوا میں تحلیل ہو کر رہ جاتی ہیں۔ قرآن حکیم نے اُن کی اس ذہنی حالت کی منظر کشی اس طرح کی ہے:۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِىْ

اِن اہلِ کفر کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی

يَنۡعِقُ بِمَا لَا يَسۡمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً (بقرہ - ۱۷۱)

شخص ایسے جانوروں کو آواز دے رہا ہو جو پکار اور آواز کے سوا کچھ نہ سن سمجھ رہے ہوں۔

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے ان پر یہ عتاب آمیز تبصرہ کیا ہے:۔

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوۡنَ الۡقُرۡاٰنَ اَمۡ عَلٰى قُلُوۡبٍ اَقۡفَالُهَا (محمد - ۲۴)

تو کیا یہ لوگ قرآن پر غور و فکر کرتے ہی نہیں یا (ان کے) دلوں پر قفل پڑے ہوئے ہیں؟

اور امر واقعی صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے ان کی ذہنی کیفیت پر یہ تبصرہ کیا ہو، بلکہ ان کا خود بھی اپنے بارے میں یہی کہنا تھا کہ:۔

قُلُوۡبُنَا فِىۡۤ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدۡعُوۡنَاۤ اِلَيۡهِ وَفِىۡۤ اٰذَانِنَا وَقۡرٌ وَّمِنۡۢ بَيۡنِنَا وَبَيۡنِكَ حِجَابٌ (صفت - ۵)

جس چیز کی طرف تم ہمیں بلا رہے ہو اس کی طرف سے ہمارے دل پردے میں (محفوظ) ہیں اور ہمارے کانوں میں گرانی ہے، اور ہمارے اور تمہارے درمیان ایک روک حائل ہے۔

ان کا یہ کہنا اگرچہ طنز کی بنا پر تھا اور وہ تاثر یہ دینا چاہتے تھے کہ یہ دعوت ایسی لغو اور لایعنی ہے کہ اس کی چھوت سے خدا بچائے، اور یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہمارے دل و دماغ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہو پاتا، لیکن ان کا یہ طنز اور نقد اپنی جگہ پر، نفس حقیقت الامری ٹھیک وہی تھی جو وہ کہہ رہے تھے۔ ان کا خیال جس طرح سو فی صدی غلط اور احمقانہ تھا، اس طرح ان کی کہی ہوئی بات از روئے واقعہ سو فیصدی صحیح تھی۔

اندھے پن کی وجوہ

اِن لوگوں کے اِس عقلی اندھے پن کی وجوہ کیا تھیں؛ جس چیز پر انہیں شرم آنی چاہیے تھی وہ ان کے لیے فخر کا سرمایہ کیوں بن گئی تھی؟ جائزہ بتاتا ہے کہ اس کی بڑی وجہیں تین تھیں:۔

۱۔ پہلی وجہ تو لوگوں کا قومی اور خاندانی تعصب تھی۔ اس وجہ کی نشاندہی اُن کے اس اظہارِ فخر کے بیان [illegible] سطور سے ہوتی ہے جس کا تذکرہ ابھی گذر چکا ہے۔ ان کا یہ کہنا کہ اسلامی

دعوت کے بھرّے میں آجانے سے ان کے دل پردوں میں محفوظ ہیں، دراصل اس خیال پر مبنی تھا کہ وہ جس دین کے پیرو اور جن عقائد کے ماننے والے ہیں، وہ انہیں ان کے نامی گرامی اسلاف سے ورثے میں ملے ہیں، اور یہ ممکن نہیں کہ ہمارے یہ بزرگ کسی غلط راستے پر رہے ہوں۔ اس لیے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی باتوں کو اگر ہم کسی اعتناء کے قابل نہیں سمجھتے تو یہ ہماری عین سعادت مندی کا ثبوت ہے، اور ساتھ ہی اپنے دین سے ہماری سچّی وفاداری اور اخلاص مندی کی علامت بھی ہے۔ یہ بات انھوں نے صرف اشاروں میں اور بالواسطہ انداز ہی میں نہیں کہی تھی، بلکہ ہانکے پکارے اور صاف وصریح لفظوں میں بھی کہی تھی اور بار بار کہی تھی:۔

اِنَّا وَجَدْنَا اٰبَاءَنَا عَلٰٓی اُمَّۃٍ وَّاِنَّا عَلٰٓی اٰثَارِھِمْ مُّقْتَدُوْنَ (زخرف۔۲۳) ہم نے اپنے اسلاف کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم انہی کے نقش قدم پر چلنے والے ہیں۔

یہ تو اہلِ شرک وکفر کی بات تھی لیکن اہلِ کتاب کا حال بھی کچھ مختلف نہ تھا۔ وہ بھی اسلاف پرستی اور نسلی تعصب کے مرض میں بری طرح مبتلا ثابت ہوئے۔ اسلام کی دعوت کے معاملے میں ان کے پیشواؤں اور بڑوں کی، اپنے عوام کو زبردست ہدایت تھی کہ:۔

وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِیْنَکُمْ (آل عمران۔۷۳) اپنے دین کے پیرووں کے سوا کسی اور کی بات نہ ماننا۔

غرض اہلِ شرک وکفر رہے ہوں یا اہلِ کتاب، سب کے سب اپنے 'قومی ورثے' کو حق کا مدار بنائے ہوئے تھے! انہوں نے طے کر رکھا تھا کہ جو 'اپنی' چیز ہے اس پر بہر حال جمے رہنا چاہیے۔ 'باہر' کی کوئی شے ہمارے لیے کسی التفات کے لائق نہیں ہو سکتی، حتی کہ یہ دیکھنا بھی کہ وہ کیا اور کیسی ہے ضعیف الاعتقادی اور دینی وقومی بے غیرتی کی بات ہوگی۔ یہ اسی اندھے تعصب کا 'فیض' تھا کہ بنی اسرائیل کے لیے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت قابلِ قبول ہی نہیں، قابلِ برداشت بھی نہ ہو سکی۔ کیونکہ آپؐ بنی اسماعیل میں سے تھے۔ اسرائیلیوں کو اس بات پر غصہّ ہوا کہ نبوت خانوادۂ اسرائیل سے نکل کر بنی اسماعیل میں کیسے چلی گئی۔ اس لیے وہ اس بات پر اڑ گئے کہ اس غیر اسرائیلی نبوت کو ہرگز نہ تسلیم کریں گے۔ قومی اور خاندانی تعصب کی اس وبا نے قریش کے اندر اپنی کارستانی اس طرح دکھائی کہ اس بڑے قبیلے کی دوسری شاخوں

کو بنی قُصَیؔ کی شاخ کے خلاف، جس سے آپؐ کا خاندانی تعلق تھا، بھڑکا دیا، اور ان کے بہت سے لوگوں نے آپؐ کی نبوت کو تسلیم کرنے سے اس خیال کے تحت انکار کر دیا کہ اس نبوت کے نتیجے میں بنی قُصَی کی ہم سب پر برتری قائم ہو جائے گی جنگ بدر کے موقع پر ابو جہل کے ایک ساتھی اَخنس بن شریق، نے اس سے تنہائی میں پوچھا کہ 'سچ بتاؤ، تم محمدؐ کو سچا سمجھتے ہو یا جھوٹا'، جواب میں اس نے صاف طور سے اعتراف کیا کہ 'بخدا محمدؐ ایک سچّا آدمی ہے' وہ عمر بھر کبھی جھوٹ نہیں بولا' مگر جب لوآء اور سقایت اور حجابت اور نبوت سب کچھ بنی قُصَی کے حصے میں آجائے تو تم ہی بتاؤ باقی قریش کے لیے کیا بچا ہے' حضورؐ کے چچا ابو طالب جیسے شخص بھی اسلام صرف اس لیے قبول نہ کر سکے کہ اپنے آبائی مذہب سے ان کی متعصبانہ وابستگی نے انہیں اس کی اجازت نہیں دی۔ حالانکہ آپؐ کی ذات سے ان کی محبّت ضرب المثل تھی، اور وہ زندگی بھر آپؐ کے دشمنوں کے مقابلے میں آپؐ کے لیے ڈھال بنے رہے لیکن حضورؐ کی بار بار کی تلقینات کے باوجود لا الٰہ الا اللہ نہ کہہ سکے۔ ان کی موت کے وقت حضورؐ نے ایک آخری کوشش کی اور ان سے فرمایا کہ چچا جان! اب بھی لا الٰہ الا اللہ کہہ دیجیے، تاکہ کل میں خدا کے سامنے اس کی شہادت دے کر آپ کی مغفرت کی گذارش کر سکوں۔ ابو جہل وغیرہ شیاطین نے، جو موقع پر موجود تھے، ابو طالب کو مخاطب کر کے کہا کہ کیا موت کے خوف سے آپ اپنے والد بزرگوار، عبدالمطلب، کا دین چھوڑ دیں گے؟ ان لوگوں کا یہ تیر نشانہ پر لگ گیا اور ابو طالب کی آباء پرستی نے زور دکھایا۔ بولے میں عبدالمطلب ہی کے دین پر مر رہا ہوں[1] اس سے اندازہ کیجیے کہ عرب معاشرے میں قومیت کے جاہلی تعصب کی جڑیں کتنی گہرائی تک اتری ہوئی تھیں، اور اس نے لوگوں کی آنکھوں پر کیسی دبیز پٹی باندھ رکھی تھی۔

۲۔ دوسری بڑی وجہ اس عقلی اندھے پن کی، لوگوں کی بے لگام خواہش پرستی تھی۔ یہ خواہش پرستی ان کی رگ رگ میں سرایت کیے ہوئے تھی۔ ان کا نفس اپنی تسکین کے لیے جو طریقہ بھی ایجاد کرتا، ان کی عقلِ وفا کیش کا فرض ہوتا کہ اسے کوئی نہ کوئی خوش نما لباس

---

[1] سیرت ابن ہشام، جلد اول ص۴۱۸

پہنا دے، اس کے جواز اور استحسان کے دلائل فراہم کرے، اور اسے دل کش بنانے کے لیے وسائل ڈھونڈ نکالے شراب نوشی، قمار بازی، سود خوری، عریانی، فحاشی، رقص و سرود، جنسی انارکی، خوں ریزی و غارت گری اور قتلِ اولاد کی حرکتوں پر کہیں فطری استحقاق کا، کہیں معاشی فلاح کا، کہیں ادب لطیف کا، کہیں آرٹ کا، کہیں قومی انا کا اور کہیں مذہبی تقدس کا حسین غلاف چڑھا دیا گیا تھا۔ ان شیطانی خواہشوں اور قابلِ نفرت حرکتوں کے بوجھ تلے ان کی انسانی فطرت اس طرح دب کر رہ گئی تھی کہ اف تک نہ کر سکتی تھی۔ اسلام چونکہ ایسی چھوٹ دینے کا قطعی روادار نہ تھا اور اس طرح کی چیزوں پر سخت بندشیں لگا رہا تھا، اس لیے انھوں نے اسے رحمت سمجھنے کے بجائے اپنے لیے ایک بھاری مصیبت سمجھا۔ ان کے نزدیک اس کا یہ اتنا بڑا ظلم اور اتنا بڑا جرم تھا جسے وہ کسی حال میں معاف نہیں کر سکتے تھے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ انھوں نے اپنے نفس کو معبود کا مقام دے رکھا تھا، اور معبود کی ہستی وہ ہستی ہوتی ہے جس کی پسند کے خلاف کوئی بات سنی ہی نہیں جا سکتی۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کی حد سے بڑھی ہوئی حق دشمنی پر بہت زیادہ ملول ہوئے تو اللہ جل شانہٗ نے آپ کو سمجھاتے ہوئے فرمایا:-

أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهٗ هَوَاهُ أَفَأَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا	کیا تم نے ان لوگوں (کی ذہنی کیفیت، کو غور سے) دیکھا (بھی) جنھوں نے اپنا معبود اپنے نفس کی خواہشوں کو بنا رکھا ہے؟ تو کیا تم ایسے لوگوں کے نگراں ہو سکتے ہو۔؟
(فرقان: ۴۳)	

۳۔ تیسری وجہ لوگوں کی ماضی پرستی اور اپنے موروثی رسم و رواج کی اندھی پیروی تھی۔ ان خانہ ساز رسموں کو چھوڑنا ان کے لیے گویا گوشت سے ناخن کو جدا کرنا تھا۔ اس لیے یہ چیز ان کی فہم و بصیرت کے گلے کا ایک اور پھندا بنی ہوئی تھی، اور انہیں اس بات کی بالکل اجازت نہیں دے رہی تھی کہ اس کے خلاف وہ کوئی بات سُن سکیں۔

جن لوگوں کی آنکھوں پر تہ بہ تہ یہ تین موٹے پردے پڑے ہوئے تھے، وہ اگر جمالِ حق کا مشاہدہ نہ کر سکے تو یہ کوئی غیر متوقع بات نہ تھی۔ یہ تو ایسے امراض ہیں جو داروئے شفا

پا کر اور زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا کہنا ہے کہ :۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا وَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا (بنی اسرائیل - ۴۱)

ہم نے (تو) اس قرآن کے اندر طرح طرح سے (دین کے حقائق کو) بیان کر دیا ہے، تاکہ لوگ سمجھ جائیں، مگر یہ چیز حق سے ان کو اور زیادہ گریزاں بنائے جا رہی ہے۔

جاہلیت کا متوقع ردّ عمل

یہ تھا جاہلیت کی گہری تاریکیوں میں ڈوبا ہوا وہ اندھا بہرا معاشرہ جس میں اسلام کی پکار بلند ہوئی تھی۔ اس پکار کا بلند ہونا تھا کہ حالات کے پردے پر حسبِ معمول پھر وہی مناظر ابھر پڑے، اور مسلسل ابھرتے رہے، جو ایسے موقعوں پر ہمیشہ ابھرتے رہے ہیں۔ جاہلیت بپھر کر سامنے آ کھڑی ہوئی اور قدم قدم پر اسلام کی راہ روکنے لگی۔ اگرچہ دنیا اپنے ذہنی اور تمدنی نشو و نما کے اعتبار سے اب سنِ رُشد کو پہنچ رہی تھی مگر اسے جاہلیت کا اقبال ہی کہنا چاہیے کہ حق سے لوگوں کی بے رغبتی اور باطل سے والہانہ وابستگی میں کوئی کمی نہ آنے پائی تھی۔ پھر چونکہ یہ دعوت پچھلی دعوتوں کے برخلاف کسی ایک ملک یا قوم تک محدود نہ تھی، بلکہ ایک عالم گیر دعوت تھی، اس لیے اس کے خلاف جاہلیت کی مورچہ بندیاں بھی حدودِ عرب سے باہر دور دور تک قائم ہوتی رہیں۔ اس کے علاوہ یہ دعوت کوئی وقتی دعوت نہیں بلکہ ایک دائمی دعوت و تحریک تھی، اس لیے اِن مورچہ بندیوں کے کبھی ختم کر دیے جانے کا امکان بھی نہیں تھا۔ اِن وجوہ سے اسلام کے خلاف اٹھایا جانے والا طوفان اب تک کے سارے طوفانوں سے بہت زیادہ سخت بھی رہا اور بہت زیادہ وسیع بھی رہا، اور ایسا بھی رہا جو کبھی سرد پڑ جانے والا نہیں تھا۔

اسلامی عقائد پر اظہارِ تعجب

دینِ حق کے خلاف جاہلیت کے اس تاریخی معرکے کی ابتداء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلانِ نبوت کے ساتھ ہی ہو گئی تھی۔ آپؐ کی زبان سے یہ سنتے ہی کہ اللہ رب العالمین

نے مجھے اپنا نبی بنا کر مبعوث کیا ہے تاکہ اس کی ہدایات تم تک پہنچا دوں، جاہلیت کے پُرسکون ایوان میں کھلبلی مچ گئی اور اس نے اس 'فتنے' کا سر اٹھنے سے پہلے ہی اسے کچل ڈالنے کی مہم شروع کر دی۔ اپنی 'بیاضِ استدلال' کھولی، اور آپؐ کے اعلانِ نبوت کو جھوٹا ثابت کر دینے کے لیے یہ مشہور و معروف 'دلیل' پڑھ کر سنا دی:

اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا (بنی اسرائیل ۔ ۹۴)	کیا اللہ نے ایک انسان کو اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے؟

ہر طرف لوگ اسی طرح کی باتوں کے چرچے کرتے دکھائی دینے لگے:۔

عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ (ق ۔ ۲۰)	انہیں اس بات پر حیرت تھی کہ انہی کے اندر سے ایک خبردار کرنے والا ان کے پاس آیا ہے' اور ان منکروں نے کہا کہ یہ تو بڑی عجیب چیز ہے۔

منشا ان لوگوں کا بالکل واضح تھا۔ یہ لوگ بھی وہی بات کہہ رہے تھے جو عقل کے اندھے ہمیشہ کہتے رہے ہیں، یعنی یہ کہ اگر خدا کو اپنا کوئی رسول بھیجنا ہی تھا تو اس کے ہاں فرشتوں کی کوئی کمی نہیں تھی، وہ انہی میں سے کسی کو بھیجتا۔ کوئی انسان، اور وہ بھی ہمارے ہی جیسا ایک عام انسان، اس عظیم منصب کا اہل کیسے ہو سکتا تھا۔ یہ تو اللہ رب العالمین کی شان کے شایان بھی نہیں کہ ایک گوشت پوست سے بنی اور بہت ساری مادی ضرورتیں رکھنے والی مخلوق کو اپنا نمائندہ مقرر کرے۔ اس لیے یا تو تم جھوٹے ہو اور اللہ پر افتراء کر رہے ہو، یا آسیب زدہ اور مخبوط الحواس ہو، اور اسی عالم آسیب زدگی میں دوں کی لے رہے ہو۔ ورنہ یہ اعجوبہ آج تک نہیں سنا گیا کہ کسی بشر کو خدا نے کبھی اپنا ایلچی بنایا تھا۔

جب آپؐ نے توحیدؔ کا پیغام سنایا، ایک اللہ کے سوا ہر چیز کی پرستش سے منع کیا، بتوں کو لاشے اور ہر غیر اللہ کو بندۂ بے اختیار قرار دیا، تب بھی اظہارِ حیرت کا ایسا ہی طوفان اٹھا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کہا گیا:۔

اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ (ص ۔ ۵)	کیا اس شخص نے سارے معبودوں کی جگہ ایک ہی معبود بنا ڈالا ہے؟ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔

اور یہ کہ توحید کی یہ بات بجائے خود تو عجیب و غریب ہے ہی، اس لیے اور بھی عجیب ہے کہ دنیا اتنی لمبی عمر کے باوجود آج پہلی بار اُسے سن رہی ہے، اس لیے اِس کے محمدؐ کی 'ایجاد بندہ' ہونے میں کوئی شک نہیں :-

مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْآخِرَةِ ۚ إِنْ هٰذَا إِلَّا اخْتِلَاقٌ (ص - ۷)

ہم نے تو ایسی بات پچھلے مذہب میں کبھی نہیں سُنی۔ اس لیے یہ ایک نری گھڑی ہوئی چیز ہے۔

آخرت[۳] کا عقیدہ سامنے لایا گیا تو انکار، حیرت اور تمسخر کا پارہ آخری ڈگری تک چڑھ گیا۔ صرف اس عقیدے ہی کو نہیں بلکہ اسے پیش کرنے کی بنا پر خود آپؐ کی ذات کو بھی ایک انوکھا اور دلچسپ تماشا قرار دے دیا گیا، باہم خوش گپیاں ہونے لگیں اور ایک دوسرے سے کہنے لگا کہ :-

هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ إِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ إِنَّكُمْ لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ (سبا - ۷)

کیا ہم تمہیں ایک ایسا شخص بتائیں جو (یہ عجیب و غریب) خبر دیتا ہے کہ جب تم لوگ (گل سڑ کر) ریزہ ریزہ ہو چکے ہو گے تو از سرِ نو پیدا کیے جاؤ گے ؟

اور پھر مسلسل اِس عقیدۂ آخرت و قیامت کا مذاق اڑایا جاتا رہا۔ کبھی سر ہلا ہلا کر کہا جاتا "آخر وہ کب برپا ہوگی ؟" (مَتٰی هُوَ۔ بنی اسرائیل - ۵۱) کبھی پوچھا جاتا "وہ کب آکر لنگر انداز ہوگی ؟" (اَیَّانَ مُرْسٰهَا - نازعات - ۴۲)

غرض ماضی کے پجاریوں، حال کے شیدائیوں اور مستقبل سے غافلوں کے خیال میں دعوتِ حق کی بنیادوں میں سے کوئی ایک چیز بھی ایسی نہ تھی جو بداہتہً غلط نہ ہوتی، اور جو قابلِ تعجب ہی نہیں لائقِ استہزاء بھی نہ ٹھیرتی۔ ہر بنیاد ایک اعجوبہ، اور اس کی ہر دلیل دیوانے کی بڑ تھی۔ آپؐ کے نبی ہونے پر تعجب کا اظہار اور اس کا استہزاء، توحید کے عقیدے پر تعجب کا اظہار اور اس کا استہزاء، آخرت کی بات پر تعجب کا اظہار اور اس کا استہزاء۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کی نظر میں اِس دنیا کی مخلوق تھے ہی نہیں، نہ آپؐ کی کوئی بات انسان کے سمجھ سکنے کی بات تھی۔ حالانکہ یہ ساری باتیں عقل و فطرتِ سلیم کی طلب کا صحیح جواب

تھیں، اور ان کی حقانیت کو دلائل سے ثابت کردینے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا گیا تھا۔ مسلسل تیرہ برس تک کی دعوتی کوششیں انہی پر مرکوز رہیں، ان کی صداقت پر ہر پہلو سے روشنی ڈالی جاتی رہی، اور بار بار ڈالی جاتی رہی۔ پُراثر نصیحتوں، دل آویز ترغیبوں اور جھنجھوڑ کر رکھ دینے والی تنبیہوں سے بھی پوری طرح کام لیا گیا۔ مگر جن کے دل و دماغ نفسانیت اور جاہلیت کے غلام بن چکے تھے وہ کچھ بھی سننے اور سمجھنے کے لیے تیار نہ ہو سکے۔ کیونکہ وہ حق بیزاری کے اس مقام تک پہنچ چکے تھے جہاں سے واپسی ممکن ہی نہیں رہ جاتی۔ قرآن کریم کے بقول یہ ایسے لوگ تھے جن کے لیے اگر آسمان میں کوئی دروازہ کھول دیا جاتا اور دن کی روشنی میں انہیں اوپر چڑھا کر غیب کا مشاہدہ کرا دیا جاتا، تب بھی وہ کسی چیز پر ایمان لا کر نہ دیتے، اور ہر مشاہدے کے بارے میں کہہ دیتے کہ "ہماری تو نظر بندی کر دی گئی ہے، بلکہ ہم سب پر سحر کر دیا گیا ہے"۔ (اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ۔ حجر۔ ۱۵)

اسلامی تصوّرات سے اجنبیت کے مظاہرے

جس اسلام کی ایک ایک بنیادی تعلیم اس طرح ناقابلِ قبول اور ناقابلِ فہم، لائقِ تعجب اور لائقِ تمسخر ٹھہرا دی گئی تھی، اس کے تفصیلی افکار اور تصورات کے بارے میں وہ لوگ کوئی دوسرا طرزِ فکر کیسے اختیار کر سکتے تھے۔ کسی نظامِ فکر و عمل کے تفصیلی نظریات اس کے بنیادی افکار ہی کے پرتو ہوا کرتے ہیں، اور انہی کا مزاج ان کی صورت گری کرتا ہے۔ اس لیے فطری طور پر انہیں بھی اُسی نگاہ سے دیکھا جا سکتا ہے جس نگاہ سے اِن بنیادی افکار کو دیکھا جا رہا ہو۔ پورے اسلامی نظام کی تشکیل توحید اور آخرت اور رسالتِ محمدی کی اساس پر ہوئی ہے، اور یہی بنیادی عقائد اس کے ہر تصوّر، ہر فکر، ہر اخلاقی قدر اور ہر نقطۂ نظر کا سرچشمہ ہیں۔ ان بنیادی عقائد سے جن دل دادگانِ جاہلیت نے اپنے اندر کوئی انس نہیں پایا تھا، جو ان سے برابر وحشت ہی کھاتے رہے تھے اور جو انہیں اظہارِ حیرت اور مذاق کا نشانہ بنائے ہوئے تھے، انہوں نے قدرتی طور پر اسلام کے تفصیلی افکار و تصوّرات کو بھی نامعقول ہی قرار دیا، اور کم و بیش ہر چیز سے بے گانگی ہی کا مظاہرہ کیا۔ چند متعین مثالیں لیجیے تاکہ

اس ارشادِ نبوی نے نہ صرف یہ کہ دانائی کا پورا تصور واضح کر دیا ہے، بلکہ اس کے عملی مظاہر کو بھی، جو قرآن کریم کی مذکورہ بالا آیتوں میں اصولاً اور مجملاً بیان ہوئے تھے، اچھی طرح روشن کر دیا ہے۔ "موت کے بعد والی زندگی کے لیے عمل کرنے" کا صاف مطلب یہ ہے کہ جب دین و ایمان کا تقاضا یہ ہو کہ دنیا کے فوری مفادات اور مصالح کو پسِ پشت ڈال دیا جائے تو پھر کسی لیت و لعل سے کام نہ لیا جائے، اور دین کے مطالبے کو بہرحال پورا کیا جائے، اور پروردگار کی خوشنودی، جان و مال اور راحت و آرام کا جو نذرانہ بھی طلب کر رہی ہو اسے بلا دریغ پیش کر دیا جائے۔

جن لوگوں کے اعصاب پر جاہلیت سوار تھی وہ اس تصورِ دانش مندی کی تاب نہ لا سکتے تھے نہ لا سکے۔ اسلام کے کھلے ہوئے منکروں کی تو خیر کوئی بحث ہی نہیں، اس بلند نظری کا اعتراف کر سکنا ان کے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ لیکن وہ لوگ بھی کچھ مختلف نہ ثابت ہو سکے جو اہلِ کتاب میں سے ہونے کے باعث خوب جانتے تھے کہ صاحبِ ایمان ہونے کے کیا معنی ہوتے ہیں۔ انہی اہلِ کتاب میں ایک شاطر گروہ ایسا بھی تھا جو قرآن اور رسالتِ محمدی پر ایمان نہ رکھنے کے باوجود مصلحتاً یہ ظاہر کرتا رہتا تھا کہ وہ بھی ملتِ اسلامیہ میں شامل ہے، حتیٰ کہ الفاظ کی جادوگری سے مسلمانوں کو بھی وہ اس وہم میں مبتلا کیے رکھنا چاہتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو وہ بھی تسلیم کیے ہوئے ہیں۔ مگر یہ شتر گربگی بہت دنوں تک نہ چھپ سکتی تھی نہ چھپ سکی۔ اس لیے ان سے مطالبہ ہوا کہ "جس طرح کا ایمان اور لوگ لائے ہیں اسی طرح کا (صاف اور صریح) ایمان تم بھی لاؤ"، (اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ)، مگر ان کا جواب یہ تھا کہ:-

اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ۔ کیا ہم (بھی) اُسی طرح کا (ناعاقبت اندیشانہ) ایمان لائیں جس طرح کا احمق لوگ لائے ہوئے ہیں۔ (بقرہ - ۱۳)

اور اس جواب کے پیچھے ان کا یہ نظریۂ دانش مندی کام کر رہا ہوتا کہ نبوت محمدی پر ایمان کا ہانکے پکارے اظہار کر کے اور اسلام کے دعوتی محاذ پر علانیہ کھڑے ہو کر ہم اُس حشر سے دوچار ہونے سے رہے جس سے ناعاقبت اندیش اور زمانہ ناشناس مسلمان دوچار ہیں۔ جب اس قماش کے لوگ دیکھتے کہ مخلص اور حنیف مسلمان اسلام دشمن طاقتوں کے

صورت حال اچھی طرح واضح ہو کر سامنے آجائے :۔

۱۔ حقیقی دانش مندی

سب سے پہلے راست فکری اور دانش مندی کے مسئلہ کو لیجیے، جو انسانی زندگی کی راست روی اور کامیابی کی شاہ کلید ہے۔ اسلام نے دانش مندی اس امر کو قرار دیا ہے کہ آدمی کی نگاہ ہر آن خدا کی مرضیات پر جمی رہے اور وہ کوئی ایسی روش نہ اختیار کرے جو اسے رضائے الٰہی کی فکر سے غافل بنا دینے والی یا اس کی ناخوشی کا موجب بن جانے والی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ایک سے زائد بار تلقین فرمائی ہے کہ "اے عقل والو! میرا تقویٰ اختیار کرو" (.... فَاتَّقُوْنِ يَا اُولِي الْاَلْبَابِ ۔ بقرہ ۔ ۱۹۷) تلقین کے یہ الفاظ اس حقیقت کی کھلی ہوئی نشاندہی کرتے ہیں کہ قرآن کریم کے نزدیک صحیح دانش مندی یہی ہے کہ آدمی ہمہ وقت اپنے پروردگار کی خوشنودی کا طالب بنا رہے۔ پروردگار کی خوشنودی کی ہمہ وقتی طلب اس کی ہمہ وقتی یاد کو مستلزم ہوتی ہے۔ اس لیے ایک اور ارشادِ الٰہی نے دانش مند اُن لوگوں کو فرمایا ہے جو "کھڑے، بیٹھے اور لیٹے (ہر حال میں) اللہ کو یاد رکھتے ہیں" (.... لِاُولِي الْاَلْبَابِ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ ... الخ ۔ آل عمران ۔ ۱۹۰) اور چونکہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی یہ طلب، طلب برائے طلب نہیں ہوتی بلکہ اس لیے ہوتی ہے کہ کل قیامت کے دن آدمی خدا کی عدالت میں سرخ رو ٹھیر سکے، اس لیے یہ رضا طلبی خطا پوشی کی دعاؤں اور عطا بخشی کی التجاؤں میں تحلیل ہوتی رہتی ہے۔ اور قرآن حکیم کا اندازِ بیان بتاتا ہے کہ یہی دعا و التجا دانش مندانہ روش کا نقطۂ عروج ہوتی ہے (رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۔ ایضاً)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فکر و عمل کے اسی انداز کو اپنے لفظوں میں اس طرح بیان فرمایا ہے :۔

اَلْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهٗ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ [1] — عقل مند وہ ہے جو اپنے نفس کو مطیع بنا کر رکھے اور موت کے بعد والی زندگی کے لیے عمل کرے۔

---

[1] ترمذی، جلد ثانی، ابواب صفۃ القیامہ ۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد ۔ جلد ثانی ۔

مقابلے میں اپنا سب کچھ داؤ پر لگائے ہوئے ہیں تو اپنی حالت پر شرم کرنے کے بجائے ان کی حالت پر ماتم کرتے، اور ادعائے دانش مندی کی ایک خاص شان کے ساتھ ان پر یہ تبصرہ کرتے کہ "ان (سادہ لوحوں) کو ان کے دین نے فریب خوردہ بنا رکھا ہے" (غَرَّ هٰؤُلَاءِ دِيْنُهُمْ۔ انفال۔ ۴۹) ان کا وہ جواب اور یہ تبصرہ صاف بتا رہا ہے کہ اسلام کا تصورِ دانش مندی ان کی نگاہ میں کیا حیثیت رکھتا تھا؟ وہ نہ صرف یہ کہ اسے قبول نہ کر سکے، بلکہ سرے سے یہی نہ محسوس کر سکے کہ اسے دانش مندی کہا کیسے جا سکتا ہے۔ گویا ان کا کہنا یہ تھا کہ یہ اسلام بھی عجیب دین ہے جس نے تباہی کی روش کو فلاح کی صراطِ مستقیم قرار دے رکھا ہے اور زندگی کا نام کافور رکھ چھوڑا ہے۔

۲۔ دولت و اقتدار کی حیثیت

اسلام نے کہا دنیا کی خوش حالی اور جاہ و اقتدار کا خدا کی محبوبیت سے کوئی تعلق نہیں ہے، یہ چیزیں ہرگز اس امر کی علامت نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے خوش ہے جن کے پاس یہ پائی جاتی ہیں۔ اللہ کی محبوبیت تمام تر آدمی کے ایمان و عمل پر موقوف ہوتی ہے۔ ایک شخص دولت اور اقتدار نہ رکھنے کے باوجود اس کی نظروں میں باعزت ٹھیر سکتا اور اس کا محبوب و مقرب قرار پا سکتا ہے، اور دوسرا دولت کے خزانے اور اقتدار کی شان و شوکت رکھتے ہوئے بھی اس کا مغضوب و مبغوض ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یہ دنیا افراد کے لیے دارالعمل ہے، دارالجزا نہیں ہے۔ یہاں انہیں عمل کرنا ہے، جس کا پورا بدلہ ان کو آخرت میں ملے گا۔ اس زندگی میں وہ خوش حال ہوں یا بدحال، ان میں سے کوئی بھی حالت ان کے اعمال کا نتیجۂ کامل نہیں ہوتی نہ کسی کا خوش حال ہونا اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ خدا اس کے عمل سے راضی ہے اور اس وجہ سے وہ اس کا محبوب بندہ ہے، نہ کسی کا بدحال ہونا اس امر کی دلیل ہوتا ہے کہ خدا اس کی روش سے خوش نہیں ہے، اس لیے اس نے اسے اپنی نظرِ کرم سے محروم کر دیا ہے۔ اس کے بخلاف رزق کی فراخی اور تنگی کی بات ہو یا سیاسی اور سماجی مرتبے کی بلندی اور پستی کی بات، دونوں کا رشتہ ایک خاص مصلحت اور حکمت کے تحت نافذ شدہ قانونِ آزمائش سے جڑا ہوا ہے، جس کی خاطر

انسان کے خالق نے اس کی تخلیق کی ہے۔ اور یہ پورا کارخانۂ عالم اس حقیقت کا شاہد ہے۔

چونکہ انسانی زندگی کا یہ سب سے اہم اور بنیادی نکتہ تھا اس لیے قرآنِ حکیم نے اس کی بار بار یاددہانی کی، تخلیقِ انسانی کی غایت اور قانونِ آزمائش کی حکمت پر تفصیل کے ساتھ اور مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالی، اور اسے لوگوں کے ذہن کے اندر اتار دینے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ مگر جاہلیت کی بنائی ہوئی ذہنیت اسے قبول نہ کر سکی، اور اس کے سکھائے ہوئے اِس نظریے پر مضبوطی سے جمی رہی کہ دولت و اقتدار اور خدا کی محبوبیت دو لازم و ملزوم چیزیں ہیں، جو جتنا ہی بڑا صاحبِ مال و اقتدار ہے اتنا ہی بڑا محبوبِ حق ہے، اور ناداری و مسکینی محبوبیتِ خداوندی سے محرومی کی علامت ہے۔ اپنے اسی نظریے کی بنا پر وہ حق و صداقت کو حق و صداقت کی حیثیت سے جانچنے کے بجائے دولت و اقتدار کی کسوٹی پر پرکھا کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنی نبوت کا اعلان کیا تو انھوں نے اسے حیرت کے ساتھ اس لیے بھی سنا کہ آپؐ کی دنیوی حیثیت ان کے خود ساختہ معیار کے مطابق نہ تھی۔ انہوں نے کہا، اور بار بار کہا کہ اوّلاً تو خدا کا رسول کوئی فرشتہ ہونا چاہیے تھا، لیکن اگر کسی انسان ہی کو اس منصب پر مامور ہونا تھا تو ضروری ہے کہ وہ کوئی عام سطح کا انسان نہ ہوتا، بلکہ ایسی غیر معمولی حیثیت رکھنے والا انسان ہوتا جس کے حالات اللہ رب العالمین کے ساتھ قائم ہونے والی اُس کی اِس عظیم نسبت سے مطابقت رکھتے۔ مثلاً اس پر کھلم کھلا فرشتوں کا نزول ہوتا،[۱] اس کے لیے غیب سے خزانے برسا کرتے،[۲] اس کے پاس شاندار و پُر بہار باغ ہوتے جس سے وہ اپنے کام و دہن کو لذتیں بخشتا رہتا[۳] اور اگر وہ اتنا بھی فوق البشر نہ ہوتا تو کم سے کم ایسا تو بہرحال ہونا چاہیے تھا کہ وہ کوئی بڑا آدمی ہوتا، کسی قوم کا رئیس ہوتا، کسی نامور قبیلے کا سردار ہوتا، صاحبِ مال و جاہ ہوتا۔ لیکن یہاں تو معاملہ بڑا عجیب ہے۔ ایک عام قسم کا شخص اٹھتا ہے اور خدائے ذوالجلال کا فرستادہ ہونے کا دعویٰ کر دیتا ہے، جب کہ سرداری، دولت مندی اور شخصی عظمت کوئی بھی باعثِ توقیر شے اسے چھو کر بھی نہیں گزری ہے۔ سارے جہان کے لیے رحمت ہونے کا مدعی ہے اور خود کا حال یہ ہے کہ بازار سے سودا سلف لا دینے کے لیے اسے ایک غلام یا خادم تک

---

[۱] سورۂ الانعام۔ ۸ [۲] و [۳] سورۂ الفرقان۔ ۸

میسر نہیں، اس لیے اپنے سارے کام اسے خود ہی کرنے پڑتے ہیں[1] بھلا ایسا شخص خدا کا سفیر کیسے ہو سکتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا کہ وہ کسی آدمی ہی کو اپنی پیغامبری کے شرف سے نوازے تو سیکڑوں سرداروں اور رئیسوں کی موجودگی میں ایسے عام درجے کے آدمی پر اس کی نگاہِ انتخاب کیسے پڑ سکتی تھی۔ ان کے متعجبانہ اعتراض کے الفاظ سنیے:۔

أَؤُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْ بَيْنِنَا — کیا ہمارے درمیان میں سے اسی شخص پر ذکر (یعنی قرآن) نازل ہوا ہے۔؟ (ص - ۸)

اور یہ کہ

لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ـ — یہ قرآن دونوں (مرکزی) بستیوں (یعنی مکہ اور طائف) کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں نازل کیا گیا؟ (زخرف - ۳۱)

غرض آپؐ کی نبوت کے خلاف ان کی بڑی دلیل یہی تھی کہ آپؐ نہ مال و زر رکھتے ہیں نہ جاہ و اقتدار اور اسی "دلیل" کی روشنی میں وہ جب آپؐ کو دیکھتے تو آپس میں طنز بھرے انداز سے کہتے:۔

أَهٰذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ — کیا یہی وہ صاحب ہیں جو (اپنی نبوت کے زعم میں) تمہارے معبودوں پر نام دھرتے ہیں؟ (انبیاء - ۳۶)

اور پھر جب ان مادہ پرست جاہلوں کی نگاہ اصحابِ نبیؐ پر پڑتی تو ان کے تعجب اور اعتراض میں اور تیزی پیدا ہو جاتی، ان کی ظاہری خستہ حالی اور بے نوائی پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:۔

أَهٰؤُلَاءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْ بَيْنِنَا أَلَيْسَ اللّٰهُ بِأَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ — کیا یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے ہمارے درمیان میں سے چن کر اپنی نوازشوں کے لیے مخصوص کیا ہے؟ کیا اللہ اپنے شکر گزاروں سے بخوبی واقف نہیں ہے؟ (انعام - ۵۳)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحابؓ پر ان لوگوں کے یہ تبصرے برابر جاری رہے، اور دنیوی ساز و سامان اور جاہ و عظمت کو وہ بدستور اللہ تعالیٰ کی محبوبیت کی نشانی قرار دیتے رہے۔ قرآن کریم کی کوئی تفہیم حقیقت ان کی نگاہ میں بلندی نہ پیدا کر سکی۔ جس صداقت سے انہوں نے پہلے دن اظہارِ بیگانگی کیا تھا اس سے آخر تک بیگانہ ہی رہے۔

---

[1] فرقان - آیت - ۷

یہاں تک کہ فتحِ مکہ کا یوم سعید آگیا، اور حالات کے انقلاب نے زبردستی ان کی آنکھیں کھول دیں۔

۳۔ صلاح اور فساد کے سرچشمے

انسانیت کی سعادت اس بات پر موقوف ہے کہ معاشرہ فساد (بگاڑ) سے محفوظ، اور اس کے جراثیم سے پاک رہے، اور اس میں امن و صلاح کا دور دورہ ہو۔ تھوڑے سے شر پسندوں کو چھوڑ کر کوئی شخص بھی ایسا نہیں ہوتا جو اس چیز کا خواہش مند نہ ہو۔ مگر ظاہر ہے کہ کسی اچھائی کی صرف خواہش اس کے وجود کی ضمانت نہیں ہوسکتی۔ یہ خواہش اسی وقت پوری ہوسکتی ہے جب اس کے لیے اچھی اور کارگر تدبیریں بھی اختیار کی جائیں۔ اسلام نے سماج کے امن و صلاح کی نعمت سے بہرہ ور ہونے کی واحد شکل یہ بتائی کہ لوگوں کے اندر خدا اور آخرت پر سچا ایمان، اور معاشرے پر خدا کے قانون کا بے لاگ نفاذ ہو اور یہ بات اس نے اس لیے فرمائی کہ معاشرے میں امن و صلاح کے قیام کے لیے دو چیزیں بالکل ناگزیر ہوتی ہیں: ایک[۱] تو صحیح اور عادلانہ قوانین، دوسرے[۲] ان قوانین کا لوگوں کے دلوں میں سچا احترام۔ اور یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں جنہیں پروردگارِ عالم کے دین کے سوا اور کوئی طاقت مہیا نہیں کرسکتی۔ انسان کا دماغ چاہے جتنی بھی کوشش کرے، وہ نہ تو ایسے قانون ہی بنا سکتا ہے جو ہر پہلو سے ٹھیک، منصفانہ اور معتدل و متوازن ہوں اور ان میں انسانی فطرت کے سارے گوشوں کی اور زندگی کی ساری مصلحتوں کی صحیح صحیح رعایت ملحوظ ہو، اور نہ عوام کے اندر ان کی پیروی کا سچا جذبہ ہی پیدا کرسکتا ہے۔ صحیح اور منصفانہ اور متوازن قانون وہ اس لیے نہیں بنا سکتا کہ سارے اہتمامات کے باوجود وہ نفس کے وقتی، ذاتی، قومی، طبقاتی اور گروہی رجحانات کی گرفت سے کبھی پوری طرح آزاد ہو ہی نہیں سکتا۔ کوئی نہ کوئی مخصوص اور نامحمود میلان اسے راہِ راست سے ہٹا دینے کے لیے بہرحال زور لگاتا رہے گا۔ تعلّی کی بات دوسری ہے، لیکن فطری حقیقت یہی ہے کہ بشر جب تک بشر ہے، اس سطح سے اوپر ہرگز نہیں اٹھ سکتا۔ اسی فطری حقیقت کا قرآن حکیم نے اظہار کیا تھا جب اس نے چند معاشرتی قوانین دے کر فرمایا تھا:-

وَاللّٰهُ یُرِیۡدُ اَنۡ یَّتُوۡبَ عَلَیۡکُمۡ وَیُرِیۡدُ الَّذِیۡنَ یَتَّبِعُوۡنَ الشَّهَوٰتِ اَنۡ تَمِیۡلُوۡا مَیۡلًا عَظِیۡمًا (نساء - ۲۷)

اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم پر رحمت کی نگاہ کرے، مگر جو لوگ اپنے نفس کی خواہشوں کے پیچھے چل رہے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم (حق وعدل کی شاہراہ سے) ہٹ کر دور نکل جاؤ۔

جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا، امن وصلاح کے لیے صرف یہی ضروری نہیں ہے کہ معاشرے میں اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے قوانینِ عدل کا نفاذ ہو، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ یہ نفاذ بالکل بے لاگ ہو، نہ اس میں کوئی جھول ہو، نہ تذبذب ہو، اور نہ کسی وقتی مصلحت اور رواداری کے نام پر دوسرے قانونوں یا رسموں کی ان میں کوئی آمیزش کرلی گئی ہو۔ "باغبان" کے ساتھ "صیاد" کو بھی خوش رکھنے کی پالیسی چاہے کتنی ہی خوش کُن کیوں نہ سمجھی جائے، مگر اس کا انجام کبھی خوش آئند نہیں ہو سکتا۔ آشیانے کا سکون بھی چھنے گا، اور قفس کی تنہائی بھی راس نہ آسکے گی۔ اس لیے قرآن نے بار بار تلقین کی ہے کہ مسلمِ حنیف بن کر رہو۔ مگر جنہوں نے جاہلیت کے ہاتھوں میں ہاتھ دے رکھے تھے وہ اس صاف اور سیدھی سی حقیقت سے اپنے کو ہم آہنگ نہ کرسکے۔ ان کی یہ ناہم آہنگی صرف عملی ہی نہیں تھی، بلکہ فکری اور نظریاتی بھی تھی۔ ان کی اس روش پر قرآنِ حکیم نے انہیں جو تنبیہ اور ملامت کی، اور پھر اس تنبیہ پر جو اُن کا ردعمل سامنے آیا، وہ خود قرآن ہی کے بیان کے مطابق یہ تھا:-

وَاِذَا قِیۡلَ لَهُمۡ لَا تُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ قَالُوۡۤا اِنَّمَا نَحۡنُ مُصۡلِحُوۡنَ۔ (بقرہ - ۱۱)

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ملک (و معاشرے) میں بگاڑ نہ پیدا کرو تو کہتے ہیں کہ ہم تو (امن و) صلاح پیدا کرنے والے لوگ ہیں۔

یہ اہلِ کتاب میں کا وہی گروہ تھا جس کا تذکرہ ابھی اوپر آچکا ہے، اور جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو تسلیم نہ کرنے کے باوجود لفظوں کی بازی گری کے پردے میں نبیؐ اور اصحابِ نبیؐ کو اس دھوکے میں مبتلا رکھنا چاہتا تھا کہ وہ انہی کے ساتھ ہیں۔ لیکن ان کی بات چھپی نہ رہ سکی۔ جب ان سے مطالبہ کیا گیا کہ مخلص اہلِ ایمان کی طرح تم بھی نبیؐ کی مکمل پیروی کا اعلان کرو تو وہ اس کے لیے تیار نہ ہوسکے، اور اپنی خود ساختہ شریعت پر جمے رہے۔ اُن کی اس روش کو اللہ تعالیٰ

نے اِفساد فی الارض سے تعبیر کیا اور اس سے باز آجانے کی انہیں تلقین کی۔ اِس پر اُن کا جواب یہ رہا کہ 'افساد فی الارض کے جرم کا ارتکاب تو اُن لوگوں سے سرزد ہو رہا ہے جن کا اصرار ہے کہ سبھی لوگوں کو اپنے سارے طور طریقوں اور ضابطوں کو چھوڑ کر بس قرآنی احکام اور اسلامی شریعت کی پابندی قبول کرلینی چاہیے، اور یہ کھلی ہوئی ٹکراؤ اور تناؤ کی پالیسی ہے، جب کہ ہمارا کہنا ہے کہ ہر گروہ اور طبقے کو اپنے اپنے طریقوں پر چلنے دیا جائے، جو واضح طور پر باہمی صلح و آشتی اور امن وصلاح کی روش ہے، اور ہم اسی پر کاربند ہیں، اس لیے ہم تو خدا کی سرزمین کے سچے مصلح گروہ ہیں، ہمیں مفسد کیسے کہا جاسکتا ہے؟ قرآن کریم نے ان کے اس خوشنما اور دل فریب پالیسی بیان پر نقد کرتے ہوئے فرمایا:-

اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ الْمُفْسِدُوْنَ	سنو! یہی وہ لوگ ہیں جو پکے مفسد ہیں،
وَلٰکِنْ لَّا یَشْعُرُوْنَ (بقرہ-۱۲)	مگر یہ حقیقت کا شعور نہیں کر پا رہے ہیں۔

مدعا اس تنقید کا یہ تھا کہ یہ لوگ ظاہر کے سکون کو حقیقی امن وصلاح سمجھتے ہیں، اور خواہشاتِ نفس کے تراشے ہوئے رنگا رنگ طور طریقوں کی 'ہم وجودیت'، کو معاشرے کی صلاح و فلاح کی ضمانت قرار دیتے ہیں لیکن اگر ان کی بصیرت کی آنکھیں موند نہ گئی ہوتیں تو دیکھتے کہ اس طرح کا معاشرہ دراصل بارود کی ایسی ڈھیر پر ہوتا ہے جس کو سوکھی گھاس سے ڈھک دیا گیا ہو۔ کچھ نہیں معلوم کب اور کدھر کوئی چنگاری پڑ جائے اور گرد و پیش کو جلا کر رکھ دے امن و امان اور صلاح و فلاح کا ضامن صرف خدا کا قانونِ عدل ہوتا ہے۔ دوسرے تمام قوانین و ضوابط کی عین فطرت میں فساد اور بگاڑ موجود ہوتا ہے۔ ان سے صلاح اور بناؤ کی توقع وہی کرسکتا ہے جس کی نگاہیں صرف سطح پر دوڑ پھر کر رہ جاتی ہیں۔ ایسے لوگ اپنے منھ سے مصلح ضرور ہوسکتے ہیں، مگر حقیقت کے اعتبار سے ان سے زیادہ خطرناک مفسد شاید ہی کوئی ہوسکتا ہو۔

آیت کا آخری ٹکڑا اس امرِ واقعی کو پوری طرح عیاں کر دیتا ہے کہ صلاح و فساد کے اسلامی تصور سے یہ لوگ یکسر بے گانہ تھے، اور ساری کوششوں کے باوجود وہ اس کے معترف نہ بن سکے، حتیٰ کہ اس کی بات تک ان کی سمجھ میں نہ آسکی۔

۴۔ پابندِ حق قوم پروری

انسان بہت سے فطری رشتے رکھتا ہے۔ اسلام چونکہ دینِ فطرت ہے، اس لیے اس نے ہر فطری رشتے کے حقوق تسلیم کیے ہیں، اور ان کا پاس و لحاظ رکھنے کی زبردست تاکیدیں کی ہیں۔ کوئی شخص سچا مسلمان نہیں ہو سکتا اگر وہ ان حقوق کو پورا نہ کرے۔ مگر ایک رشتے کو چھوڑ کر، جو آدمی اپنے خالق و پروردگار سے رکھتا ہے، کوئی رشتہ ایسا نہیں جس کے حقوق غیر محدود اور غیر مشروط ہوں۔ بلکہ ہر ایک کے حقوق کی کچھ ناگزیر حدیں ہیں، جن کے اندر رہ کر ہی انہیں پورا کیا جا سکتا ہے۔ یہ حدیں حق و عدل کی حدیں ہیں۔ جس طرح کسی رشتے کے واجبی حقوق کا ادا نہ کرنا فرض ناشناسی ہے، اسی طرح ان حدود سے تجاوز کر جانا ظلم اور فساد ہے۔

ان رشتوں میں قومیت کے رشتے کو بڑی نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ قومیت کا جذبہ ہمیشہ انسانی تاریخ پر غیر معمولی اثرات ڈالتا رہا ہے۔ یہ بے قابو ہو کر بالعموم جاہلیت کا قافلہ سالار بن جایا کرتا ہے۔ اس لیے دنیا کی تاریخ میں فتنہ و فساد اور ظلم و طغیان کی جتنی داستانیں اس کی بدولت مرتب ہوتی رہی ہیں، ان کی کوئی نظیر نہیں پائی جا سکتی۔ اسلام نے پوری قوت سے اس کی باگیں کھینچیں، تاکہ وہ اپنی حد میں رہے۔ اس نے کہا اپنی قوم سے ضرور محبت رکھو، اس کی خدمت اور خیر خواہی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھو، یہ ہرگز کوئی عیب کی بات نہیں کہ آدمی اپنی قوم کی عزت میں چار چاند لگانے کی کوشش کرے، اور یہ عین مطلوب و محمود بات ہے کہ قوم کا پشت و پناہ بنا جائے۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے لفظوں میں:

خَيْرُكُمُ الْمُدَافِعُ عَنْ عَشِيْرَتِهٖ[1]	تم میں سب سے بہتر شخص وہ ہے جو اپنے قبیلہ کی حمایت اور مدافعت کرے۔

مگر ساتھ ہی اس کا کہنا یہ بھی ہے کہ قوم قوم ہے، خدا نہیں ہے، کہ اس کے حقوق ہر قید و شرط سے آزاد ہوں، اور اس کی ہر حال میں حمایت کی جائے۔ اس کی حمایت اسی وقت تک صحیح

---

[1] ابوداؤد، جلد دوم۔ باب فی العصبیۃ۔

[illegible]

مہلک وار سے کسی قوم کا بچا رہنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ لیکن عرب میں اس کی کارستانی ساری حدوں کو پار کر گئی تھی۔ قبیلہ اور قوم کے مقابلے میں نہ کوئی حق حق تھا نہ کوئی انصاف انصاف تھا۔ قوم ہر چیز سے عظیم تر تھی۔ اس لیے وہاں کے انجام ناشناس قوم پرستوں کے لیے اسلام کے پابندِ حق تصورِ قومیت کو مان لینا ممکن نہ ہو سکا۔ مان لینے کی بات تو الگ رہی، وہ اس کی معقولیت کا ادراک بھی نہ کر سکے۔ چنانچہ واقعات بتاتے ہیں کہ ایسے لوگ اس تصور سے آخر تک بے گانہ رہے، بیگانہ ہی نہیں نالاں بھی رہے۔ بدر کے میدان میں ابوجہل نے جنگ شروع ہونے سے پہلے جو اضطراب بھری دعا مانگی تھی، ذرا اس کے الفاظ سنیے:-

اَللّٰھُمَّ اَقْطَعُنَا لِلرَّحِمِ وَ آتَانَا بِمَا لَا یُعْرَفُ فَاَحِنْہُ الْغَدَاۃَ[1]	اے اللہ! دونوں گروہوں میں جو زیادہ قاطعِ رحم اور زیادہ غلط کار رہے، اسے کل صبح تباہ کر کے رکھ دے۔

اندازہ کیجیے اس کمالِ جہل کا، یہ دعا اُسی اللہ سے مانگی جا رہی ہے جس کے دین کی دعوت کا قلع قمع کر دینے کے لیے قریش کا غرقِ آہن لشکر مدینہ کے قریب تک چڑھ آیا ہے، اور دعا وہ شخص کر رہا ہے جس نے مسلمانوں کا مکہ میں جینا دوبھر کر کے انہیں گھر بار چھوڑ کر نکل جانے پر اس کے باوجود مجبور کر دیا تھا کہ وہ بھی اس کی اپنی ہی قوم (قریش) کے افراد تھے۔ اُس وقت تو اسے اس کا ذرا احساس نہیں ہوا تھا کہ صلہ رحمی بھی کوئی چیز ہے اور قومی رشتہ کا بھی کوئی حق ہوتا ہے، مگر آج وہی شخص نبیؐ اور اصحابِ نبیؓ کو اصل قاطعِ رحم قرار دے رہا ہے، اور اسے رحمی رشتہ کی حرمت یاد آ رہی ہے، اور یاد بھی اس شان سے آ رہی ہے کہ اس کے مقابلہ میں خود خدا اور اُس کے دین کے رشتہ کی بھی کوئی اہمیت اس کی نگاہ میں نہیں رہ گئی تھی۔

قوم کو سب کچھ سمجھے رہنے کا یہی جاہلی نظریہ تھا جس کے تحت قریش کے ایک اور بڑے سردار، عُتبہ بن ربیعہ، نے عین حرم مکہ کے اندر حضورؐ سے صلح کی بات پیش کر کے دورانِ گفتگو کہا تھا کہ:-

"بھتیجے! تم ہمارے درمیان جو خاندانی عظمت اور نسبی شرافت رکھتے ہو وہ تمہیں معلوم ہی ہے۔ مگر تم اپنی قوم پر ایک بڑی آفت لائے ہو، جس کے ذریعہ تم نے جماعت میں تفرقہ

---

[1] سیرت ابن ہشام۔ جلد اوّل ص ۶۲۸ (طبع جدید)

ڈال دیا ہے اور ساری قوم کو بے وقوف ٹھیرایا ہے۔۔۔۔۔ اب ذرا میری سنو، کچھ تجویزیں تمہارے سامنے رکھتا ہوں ان پر غور کرو۔ شاید ان میں سے کوئی تمہیں پسند آجائے"۔ ؎۱

گویا ان مدعیانِ عقل و دانش کے نزدیک قوم کے سامنے حق اور دین و خدا پرستی کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ معبود قوم تھی نہ کہ قوم کا پیدا کرنے والا! پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اسلام کے پابندِ حق تصورِ قومیت کو قابلِ فہم پاتے۔

۵۔ دین کی جامعیت

اسلام نے دنیا کو یاد دلایا کہ انسان کے خالقِ حکیم نے اسے بے مقصد نہیں پیدا کیا ہے، بلکہ اپنی عبادت اور بندگی کے لیے پیدا کیا ہے، اور خدا کی بندگی یہ ہے کہ پوری زندگی اس کی ہدایات اور مرضیات کے مطابق گذاری جائے۔ یہ بندگی کوئی بندگی نہیں کہ بس عبادت گاہ میں اللہ کی پرستش کرلی جائے، یا اس کے ساتھ کچھ اور بھی مذہبی رنگ کی رسمیں انجام دے لی جائیں، اور پھر باقی پوری زندگی من مانے طریقے سے بسر کی جاتی رہے۔ یہ نہائی چوتھائی قسم کی بندگی نہ تو اللہ تعالیٰ کے معبودِ مطلق ہونے کی حقیقت سے میل کھاتی ہے، نہ اس کے نازل کیے ہوئے دین اور ہدایت نامہ سے مطابقت رکھتی ہے۔ پھر اس غرض سے اس نے جب زندگی کے ایک ایک گوشے میں خدا پرستی کا رنگ بھرنا چاہا اور انسانوں کے سبھی افکار و اعمال پر حق و صداقت کی بندشیں لگانا شروع کیں تو جاہلیت کے پروردوں نے اس پر بڑے تعجب کا اظہار کیا، اور اس کا مذاق اڑانے پر اتر آئے۔ مذہب کا جو جاہلی تصوّر ان کے ذہنوں پر چھایا ہوا تھا، اور جس طرح وہ اسے زندگی کا ایک ضمیمہ سمجھنے کے عادی ہو چکے تھے، اس کے مقابلے میں جب وہ دیکھتے کہ یہ 'نیا' دین آزادیِ نفس کے ایک ایک ناکے پر پہرہ بٹھا رہا ہے، قدم قدم پر جزا و سزا کا قانون سنا رہا ہے، زندگی کے پھیلے ہوئے مسائل کو گن گن کر ایک مربوط اور مستحکم نظام کے شیرازے میں باندھتا جا رہا ہے، اور حیاتِ انسانی کا کوئی گوشہ نہیں جس پر وہ حاوی نہ ہو جانا چاہتا ہو، تو انہیں وحشت سی ہونے لگتی، اور دین کے اس انقلابی مفہوم سے جس کے اندر نفس اور جاہلیت کی دراندازی کے لیے

؎۱ ایضاً ص ۲۹۳۔

کوئی رخنہ باقی نہیں رہنے پا رہا تھا، سخت اجنبیت محسوس کرتے، اور اپنے آپ کو اس طرح ہر طرف سے بندھا دینے پر مسلمانوں کی 'بے عقلی' کا ماتم کرتے اور ان پر آوازے کستے۔ بعض لوگوں نے حضرت سلمان فارسیؓ سے ازراہِ طعن سوال کیا:۔

قَدْ عَلَّمَكُمْ نَبِيُّكُمْ كُلَّ شَيْءٍ حَتَّى الْخِرَاءَةَ۔[1]	دیکھو جی! سنا ہے کہ تمہارے پیغمبر نے تمہیں ہر چھوٹی بڑی چیز کی، حتیٰ کہ استنجاء کے آداب تک کی تعلیم دی ہے؟

اس طرح کے سوالات سے صاف واضح ہوتا ہے کہ ان 'روشن خیالوں' کے نزدیک وہ مذہب کوئی معقول مذہب ہو ہی نہیں سکتا تھا جو پرستش گاہوں سے لے کر تہذیب و تمدن تک کے سارے مسائل کو، اور نجی زندگی سے لے کر اجتماعی زندگی تک کے تمام معاملات کو اپنے احکام کا تابع بنا کر رکھنے پر مصر ہو۔ ان کو اس بات میں تو کوئی حرج نہیں دکھائی دیتا تھا کہ اولاد اپنے باپ کی مرضیات کی کلیتہً پابند بن کر رہے، نہ اس امر میں کوئی نامعقولیت نظر آتی تھی کہ رعایا کو اپنے حکمراں کی بے چون و چرا اطاعت کرنی چاہیے۔ مگر خدائے بزرگ و برتر کا، جو انسان کا مجازی نہیں بلکہ حقیقی خالق بھی ہے، اس کا اصل مالک و پروردگار بھی ہے، اس کا حقیقی حکمران اور معبود مطلق بھی ہے، ——— یہ حق ان کے لیے ناقابلِ فہم تھا کہ اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے انسان کو وہ اپنا مکمل بندہ بن کر رہنے کو کہے۔ لیکن ان کا یہ اندازِ فکر کچھ خلافِ توقع بھی نہیں تھا۔ جو لوگ صدیوں سے مذہبیت کا مطلب یہ جانتے اور مانتے چلے آ رہے تھے کہ اپنے ہاتھوں کے تراشے ہوئے بتوں کو کبھی کبھی سجدے کر لیا کریں، ان پر کچھ اونٹوں اور بھیڑ بکریوں کی بھینٹ چڑھا دیا کریں، قربانی کے جانوروں کا خون معبد کی دیواروں پر لتھیڑ دیا کریں، خانہ کعبہ کے پاس کچھ سیٹیاں بجا دیا اور تالیاں پیٹ دیا کریں اور یہ ان کی نماز ہو جایا کرے، مذہبی رنگ کے کچھ میلے ٹھیلے کر لیا کریں، اور پھر زندگی کے باقی سارے لمحات لوٹ مار، قتل و غارت، عیاشی اور فحاشی مے نوشی اور سود خوری کے لیے وقف رہیں ——— ایسے لوگوں کے حلق سے اسلام کا وہ تصورِ مذہب نیچے کیسے اتر سکتا تھا جس میں اس قسم کی من بھاتی آزادیاں یکسر مفقود تھیں؟

---

[1] ترمذی جلد اوّل۔ ابواب الطہارۃ۔

اس لیے اگر ان لوگوں نے اس سے کامل اجنبیت کا مظاہرہ کیا تو یہ کوئی خلاف بات نہ تھی۔

۶۔ عبادات میں شائستگی کا لحاظ

اسلام نے اپنے دینِ فطرت ہونے کے تقاضے کہیں، کسی معاملے میں بھی، فراموش نہیں ہونے دیے ہیں۔ شرم و حیا کو، جو انسانیت کا ایک قیمتی جوہر اور فطرت کا ایک دل کش حسن ہے، اس نے جو اہمیت دی ہے اس کا اندازہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس ارشاد سے لگایئے:

.... وَالْحَیَاءُ شُعْبَۃٌ مِّنَ الْاِیْمَانِ[1] .... شرم و حیاء ایمان کا ایک جزو ہے۔

جو چیز ایمان کا جزو ہو، ایمان کا تقاضا ہے کہ اسے کبھی پسِ پشت نہ ڈالا جائے، اور اُس وقت تو اور بھی نہ ڈالا جائے جب خود ایمان ہی کے کسی اور جزو یا عملی تقاضے کو انجام دیا جا رہا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ نماز کے بارے میں، جو سب سے بڑا تقاضائے دین و ایمان ہے، حکم ہے کہ صرف ستر پوشی ہی کے ساتھ نہیں بلکہ حسبِ توفیق پورا لباس پہن کر ادا کی جائے۔ اس حکم کے الفاظ یہ ہیں:۔

خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ (اعراف۔ ۳۱) ہر نماز کے موقع پر اپنا سامانِ زینت (یعنی لباس) پہنے رہو۔

لباس کو 'زینت' کے لفظ سے تعبیر کر کے واضح طور پر اس بات کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے کہ نماز کے موقع پر پہنا جانے والا یہ لباس شائستگی اور ستھرا پن بھی لیے ہوئے ہو۔

جاہلیت نے اپنے معمول کے مطابق شرم و حیا کے اس اعلیٰ و اشرف انسانی وصف کو بھی نہیں بخشا، اور کمال یہ ہے کہ اُس نے اِس حیا کُشی کے لیے خود مذہبیت اور عبادت ہی کو اپنا آلۂ کار بنا لیا۔ لوگوں کو فریب یہ دیا کہ خدا کی پرستش کے وقت بندے کو دُنیوی علائق سے زیادہ سے زیادہ بے تعلق اور بلند رہنا چاہیے۔ تاکہ ظاہر ہو کہ آدمی واقعی معنوں میں دنیا سے کٹ کر اپنے معبود سے جُڑ گیا ہے۔ لباس چونکہ انہی علائق میں سے ایک ہے اور دنیوی وابستگی کی علامت ہے، اس لیے عبادت کے موقع پر اسے بھی اتار دینا چاہیے۔ خالص مذہبیت اور

---

[1] مسلم جلد اول۔ کتاب الایمان۔

خدا سے کامل وابستگی کے اِس جاہلانہ نظریہ سے بھلا عرب جیسی غرقِ جاہلیت قوم محفوظ کیسے رہ سکتی تھی۔ چنانچہ یہی نظریہ تھا جس کے تحت مشرکینِ عرب خانہ کعبہ کا طواف ننگے ہو کر کیا کرتے تھے۔ 'خدارسی' اور 'مذہبی تقدس' کے اس حیاکُش ڈھونگ پر نہ ان کی فطرت کو اُبکائی آتی نہ اخلاقی حس میں کوئی چبھن ہوتی۔ اسلام نے جب اُن کی اِس روش پر نکیر کی تو یہ نکیر ان کی سمجھ سے بالاتر ثابت ہوئی، انہوں نے پورے سکون کے ساتھ یقین کے لہجے میں جواب دیا:-

وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللّٰهُ أَمَرَنَا بِهَا۔ (اعراف۔ ۲۸)

ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے اور اس کا ہمیں اللہ (ہی) نے حکم دیا ہے۔

جس جاہلی رسم پر وہ اپنے اسلاف کی سنّت ہی کی 'دلیل' نہیں رکھتے تھے، بلکہ خدا کی ہدایت اور مرضی کی سند بھی رکھنے کے مدعی تھے، اسے وہ کسی کے کہنے سے مذموم کیسے سمجھ سکتے تھے؟

۷۔ وحدتِ بنی آدم

اسلام نے سارے انسانوں کو ایک ماں باپ کی اولاد بتایا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:-

خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ (نساء۔ ۱) اللہ نے تم سب کو ایک جان سے پیدا کیا ہے۔

چونکہ تمام انسانوں کی اصل ایک ہے، اور سب کے سب آپس میں ایک ہی گھرانے کے افراد کی حیثیت رکھتے ہیں، اس لیے نسل یا رنگ یا وطن یا قومیت کی بنا پر ان کے درمیان کوئی اونچ نیچ نہیں ہو سکتی اور رسولِ خدا کے لفظوں میں تمام انسان کنگھی کے دندانوں کی طرح برابر ہی ہوں گے۔ جب حقیقت یہ ہے تو رنگ یا نسل یا وطن یا قومیت کی بنا پر کسی کو کسی پر فضیلت بھی حاصل نہیں ہو سکتی، نہ اِن میں سے کوئی چیز فخر کی موجب بن سکتی ہے۔ ہادیِ برحق صلی اللہ علیہ وسلم کے اس شہرۂ آفاق اعلان نے اس طرح کے سارے جھوٹے اور بے اصل واہموں کی جڑ کاٹ کر رکھ دی ہے:-

اَلنَّاسُ بَنُوْ اٰدَمَ وَاٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ[1] تمام انسان آدمؑ کی اولاد ہیں، اور آدم مٹی سے بنائے گئے تھے۔

---

[1] ترمذی۔ جلد دوم۔ ابواب التفسیر

اور یہ کہ:-

یَا اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّ رَبَّکُمْ وَاحِدٌ لَا فَضْلَ لِعَرَبِیٍّ عَلیٰ اَعْجَمِیٍّ وَّ لَا لِاَعْجَمِیٍّ عَلیٰ عَرَبِیٍّ وَلَا لِاَسْوَدَ عَلیٰ اَحْمَرَ وَلَا لِاَحْمَرَ عَلیٰ اَسْوَدَ اِلَّا بِالتَّقْوٰی[1]

لوگو! تم سب کا ایک ہی رب ہے تقوی اور خدا ترسی کے سوا کسی اور بنا پر نہ تو کسی عربی کو کسی عجمی (غیر عربی) پر کوئی برتری حاصل ہے نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر، نہ کوئی کالا کسی گورے سے افضل ہے نہ کوئی گورا کسی کالے سے۔

یہ انقلابی اعلان کسی قیاسی نظریے کا یا کسی مصلحی رائے کا اعلان نہ تھا، بلکہ یقین کی زبان سے بلند ہونے والا ایک عقیدے اور ایمان کا اعلان تھا۔ جس وقت اور جس ماحول میں اس اعلان کی زلزلہ انگیز آواز گونجی تھی' اس کا حال یہ تھا کہ جدھر دیکھا جاتا لوگ نسلی، خاندانی اور وطنی پندار کے نشوں سے سرشار نظر آتے۔ اس لیے انہوں نے اس اعلان کو' قدرتی طور پر' بہرے کانوں سنا، اور اپنے لیے اس کے قابلِ قبول ہونے کا وہ تصور تک نہ کرسکے۔ قریش کے نام نہاد شرفاء کو یہ صورت حال ایک آنکھ نہ بھاسکی کہ یہ 'نیا' دین ادنی حیثیت کے لوگوں اور غلاموں تک کو صاحبِ حسب لوگوں کو سطح پر لا کھڑا کر رہا ہے۔ انہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت تھی کہ آخر ہم آپ کی مجلس میں آپ کی باتیں سننے کیسے آسکتے ہیں جب کہ وہاں بے وقعت اراذل بیٹھے ہوا کرتے ہیں۔ حضرت خبّابؓ بیان کرتے ہیں کہ اقرع بن حابس تمیمی اور عُیَینہ بن حصن فزاری حضورؐ کے پاس آئے، دیکھا کہ آپؐ صہیبؓ، بلالؓ، عمارؓ کی اور میری معیت میں کمزور طبقہ کے کچھ مسلمانوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان دونوں نے ہم سب کو حقارت بھری نظروں سے دیکھا، پھر حضورؐ کے پاس پہنچ کر آپؐ سے علیحدگی میں گفتگو کی، اور کہا "ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے ساتھ گفتگو کے لیے ایک ایسی مخصوص مجلس منعقد کیا کریں جو عربوں کی نگاہ میں ہمارے شرف کا اظہار کرنے والی ہو۔ ان کے مختلف وفود آپؐ کے پاس آیا کرتے ہیں، ہمیں اس بات سے عار محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہمیں ان غلاموں کے ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھیں[2]"۔ اسی ایک مثال سے اندازہ کرلیجیے کہ اسلام کے تصورِ مساوات سے لوگوں کی نظریاتی

---

[1] بیہقی۔ [2] ابن ماجہ بحوالہ تفسیر قرطبی، جلد ۶، صـ ۴۳۲۔

اور مزاجی بے گانگی کس انتہاء کو پہنچی ہوئی تھی۔

۸۔ قانونی مساوات

سارے بنی آدم کی وحدت اور مساوات کے فطری نتیجے کے طور پر، اسلام کی نگاہ میں قانونی مرتبہ بھی سب لوگوں کا یکساں تھا۔ اس کی معدلت گاہ میں نہ کوئی چھوٹا تھا نہ کوئی بڑا۔ سب کی جان، مال اور ناموس کو برابر کا احترام حاصل تھا، اور خدا کا قانون سبھی پر یکساں طور پر نافذ ہو رہا تھا۔ جاہلیت کے تیار کیے ہوئے معاشرے کے سامنے جب یہ عادلانہ نقطہ نظر آیا تو وہ حیرت اور غصّے سے چیخ پڑا۔ وہ تو صدیوں سے اس اصول پر عمل کرتا چلا آ رہا تھا کہ افراد کے مرتبے دولت، طاقت اور حسب ونسب کی ترازو میں تولے جائیں گے، اور کسی معزز قبیلے کے ایک فرد کی جان کسی ادنیٰ درجے کے قبیلے کی بیسیوں جانوں کے برابر ہوگی۔ چنانچہ کسی بڑی ناک والے خاندان کے ایک شخص کے قصاص میں ضروری ہوتا کہ قاتل کے ساتھ ساتھ اس کے خاندان کے متعدد دوسرے لوگوں کی بھی گردنیں اڑا دی جائیں، ورنہ قصاص، قصاص نہ ہوگا۔ اعلیٰ و ادنیٰ کے درمیان یہ ظالمانہ امتیاز صرف کفار و مشرکین ہی کی حد تک محدود نہ تھا، بلکہ خدا کی شریعت رکھنے والے اہلِ کتاب کے یہاں بھی معروفِ عام کا درجہ حاصل کیے ہوئے تھا۔ مثلاً ان کا ایک دستور یہ تھا کہ اگر کوئی بڑے مرتبہ کا آدمی چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے، اور اگر کوئی معمولی حیثیت کا آدمی چوری کرتا تو اس پر حد جاری کرتے[1]۔ اسی طرح اگر صاحبِ جاہ و مال شخص زنا کا ارتکاب کرتا تو اس کو صرف کوڑے مارنے اور چہرہ کالا کر دینے کی سزا دی جاتی، لیکن یہی گناہ جب کسی عام آدمی سے سرزد ہوتا تو اس کو حکم شرع کے مطابق سنگسار کر دیا جاتا[2]۔ اہلِ کفر و شرک اور اہلِ کتاب ہی نہیں، خام کار اور خام ذہن نومسلموں کے لیے بھی اس عظیم تصورِ مساوات کا ہضم کرنا مشکل ہوتا، اور بعض تو الٹے پاؤں پھرے بغیر نہ رہ سکے۔ خلیفۂ دوم کے عہد میں ایک نومسلم رئیس، جبلہ بن ایہم غسّانی، حج کو آیا۔ طواف کے دوران طائف کے ایک شخص کا اس کی چادر پر پاؤں پڑ گیا۔ اس نے غصّہ سے بپھر کر اسے ایک ایسا زناٹے کا طمانچہ رسید کر دیا کہ غریب کی

---

[1] بخاری، جلد دوم۔ کتاب الحدود۔ [2] تفسیر قرطبی، جلد ششم

ناک زخمی ہوگئی۔ مظلوم نے حضرت عمر فاروق رضؓ سے فریاد کی۔ آپ نے جبلہ کو مخاطب فرما کر اس سے کہا کہ "یا تو اس مظلوم سے درخواست کرکے اس سے اپنا جرم معاف کرا لو، یا پھر قصاص کے لیے تیار ہو جاؤ" جبلہ یہ فیصلہ سن کر حیرت زدہ رہ گیا، اور پھر یہ حیرت زدگی ارتداد تک پہنچ گئی۔ گویا اس کا کہنا تھا کہ مجھے اس "اندھیر" کا وہم و گمان بھی نہ تھا، جس دین کا قانون شریف اور رذیل میں تمیز نہ کرتا ہو اس کے دائرے میں رہنا عقل اور انسانیت کی توہین ہے!

۹۔ سماجی مساوات

نسلی اور قانونی مساوات ہی کی طرح اسلام نے سماجی مساوات کا بھی اصول نافذ کیا، اور انسانیتِ عامّہ کی سطح کو ہموار کرتے ہوئے سماجی اونچ نیچ کو بھی پیروں تلے روند ڈالا۔ اس عظیم انقلاب کا سب سے نمایاں اور حیرت انگیز مظاہرہ اس وقت ہوا جب سرکارِ رسالت ﷺ نے عرب کے سب سے اونچے خاندان کی بیٹی، سردارِ قریش، عبدالمطلب کی نواسی، اور اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کی شادی ایک ایسے شخص سے، جو عزت و عظمت کے درجات کی جاہلی تعیین کے اعتبار سے سب سے نچلے درجے پر آتا تھا، یعنی آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے کر دی، تاکہ اسلام کے بلند ترین تصورِ مساوات کو دنیا ایک جیتی جاگتی حقیقت کے روپ میں سر کی آنکھوں سے دیکھ لے۔ اس غیر معمولی انقلابی اقدام پر وہ جاہلی معاشرہ آپے سے باہر ہوگیا جس کی بنیاد ہی شریف اور وضیع، عالی نسب اور پست نسب، آقا اور غلام کی تقسیم در تقسیم پر رکھی ہوئی تھی۔ وہ اس خیال سے پریشان ہو اٹھا کہ کہیں یہ وبا پھیل نہ جائے، اور حسب نسب کی قیمتی متاعوں کو نہس نہس کرکے نہ رکھ دے۔ بالخصوص عورتوں نے تو اس کے خلاف زبردست چرچے شروع کر دیے۔ خود حضرت زینب رضؓ کو ورغلانے اور عار پر عار دلانے لگیں، اور انہیں اتنا برانگیختہ کر دیا کہ آخر کار زوجین میں منافرت پیدا ہوگئی، اور طلاق تک نوبت پہنچ گئی۔

قیدیوں کا معاملہ بھی سماجی معاملات ہی کا ایک جزو ہے، لیکن جاہلی معاشرہ اس کا کوئی تصور ہی نہیں رکھتا تھا۔ اس کے نزدیک قیدی نہ کسی حق کا حقدار تھا نہ کسی انسانی

روپے کا مستحق تھا۔ اپنا پیٹ بھرنے کے لیے بھی بسا اوقات اسے در در کی بھیک مانگنی پڑتی تھی۔ اسلام آیا تو اس نے بتایا کہ قیدی بھی انسان ہی ہوتے ہیں، اور معاشرے کے دوسرے لاچار طبقوں، فقرا، مساکین اور یتامیٰ کی طرح ان کو بھی باعزت طریقے سے کھلانا پلانا چاہیے۔ اور پھر اس طرزِ عمل کو ایمان کی ایک اہم صفت قرار دے کر اس کی اہمیت کو کہیں کہیں پہنچا دیا۔ (وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ مِسْکِیْنًا وَّیَتِیْمًا وَّ اَسِیْرًا۔ دہر۔ ۸) اس ہدایتِ خداوندی کے مطابق جب حضرات صحابہؓ کرام نے بدر کے قیدیوں کو روٹیاں کھلائیں، اور خود کھجوروں پر اکتفا کیا، تو انہوں نے شرم کے مارے گردنیں جھکا لیں، اور حیرت زدہ ہو کر اپنے دلوں سے پوچھنے لگے کیا آسمان کے نیچے قیدی کے ساتھ یہ برتاؤ بھی ہوتا ہے!

۱۰۔ خود ساختہ رسموں کی بیخ کنی

دوسرے تمام جاہلی معاشروں کی طرح عرب کا معاشرتی نظام بھی خود ساختہ رسوم کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ کھانے پینے میں، مجلسی طور طریقوں میں، وراثت کے اور نکاح و طلاق کے معاملات میں من گھڑت ضابطے رائج تھے، اور انہیں مذہبی تقدس کا سا احترام حاصل تھا، اس لیے ان کا توڑنا ناقابلِ معافی جرم سمجھا جاتا تھا۔ انہی ضابطوں میں سے ایک مسلّم ضابطہ یہ بھی تھا کہ متبنّیٰ (لے پالک) اصل بیٹے کا حکم رکھتا ہے، اور اس کی بیوہ یا مطلقہ عورت سے نکاح کرنا اسی طرح ناجائز ہے جس طرح اصل بیٹے کی بیوی سے ناجائز ہوتا ہے۔ حضرت زینب بنتِ جحش رضی اللہ عنہا کو، جیسا کہ اوپر ابھی گذر چکا، ایک آزاد کردہ غلام سے نکاح کر دیے جانے اور پھر طلاق مل جانے سے پیہم صدمات پہنچے تھے۔ ان صدمات کا مداوی صرف ایک طریقہ سے ممکن تھا، اور وہ یہ کہ انہیں ام المومنین کا عظیم مرتبہ عطا ہو جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود اسی انداز میں سوچ رہے تھے مگر کفار و منافقین کی جاہلانہ ذہنیت کا متوقع ردعمل سنگِ گراں بن کر راہ میں حائل تھا۔ آپؐ کو بخوبی اندازہ تھا کہ اگر انہوں نے یہ قدم اٹھایا تو یہ لوگ، جو ہمہ دم تاک ہی میں رہتے ہیں، آسمان سر پر اٹھائے بغیر نہ رہیں گے، اور اسے اسلامی دعوت کے خلاف ایک زبردست حربہ بنا لیں گے۔ رسولِ خدا کا بشری ذہن تو

یہ سوچ رہا تھا، اور اپنی جگہ بالکل بجا سوچ رہا تھا، مگر خود خدا کی حکمتِ بالغہ کی نگاہ اس سے اوپر تک دیکھ رہی تھی۔ اس لیے آپؐ کو حکم ہوا کہ اس گہرے جمے ہوئے جاہلانہ خیال اور خلافِ حقیقت رواجی ضابطے کی بیخ کنی کا قدم بلا جھجک اٹھا دو۔ دوسری رسموں کی طرح اس رسمِ بے اصل کو بھی مٹانا تو ہے ہی۔ سو اس کا اس سے بہتر موقع اور اس سے بہتر طریقہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ان رسم پرستوں کی ذرا پروا نہ کرو، اور وہ کام بہرحال کر ڈالو جو تم سوچ رہے ہو اور جو اس وقت تمہارے کر ڈالنے کا ہے" وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللّٰهُ أَحَقُّ أَن تَخْشَاهُ۔ احزاب۔ ۳۷" (تم اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے ہو جسے اللہ ظاہر کر دینے والا ہے۔ تم لوگوں سے ڈر رہے ہو، حالانکہ اللہ اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ اس سے ڈرو) آخر کار جب اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضورؐ نے حضرت زینبؓ کو امہات المومنین میں شامل کر لیا تو وہی کچھ ہو کر رہا جس کا آپؐ کو اندیشہ تھا، اور اس سے بھی زیادہ سخت طوفان اٹھ کھڑا ہوا جیسا حضرت زیدؓ سے اُن کا نکاح کر دیے جانے پر اُٹھا تھا۔ کفار اور منافقین نے آپؐ پر طعنوں کی بوچھار کر دی، اور کہتے پھرے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی بہو سے بھی نکاح کر لینے میں تامّل نہیں کیا۔ ان کورچشموں کی نگاہ حقیقتِ واقعی اور من مانے رواج کے فرق کو دیکھ ہی نہیں پاتی تھی۔ اپنی خانہ ساز شریعت کے یہ اندھے پیرو اس روشن حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے کسی طرح تیار نہیں تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صُلب اور ہے اور حارثہ کی صلب اور تھی۔ حارثہ کی صلب سے پیدا ہونے والے زیدؓ، حارثہ ہی کے بیٹے مانے جا سکتے ہیں، پیار اور شفقت کے لہجے میں انہیں بیٹا کہہ دینے سے وہ فی الواقع بھی حضورؐ کے بیٹے نہیں ہو جا سکتے ہیں۔ مجازی استعمالات سے حقیقتیں بدل نہیں جایا کرتیں، وہ بہرحال اپنی جگہ برقرار رہتی ہیں۔ اور قوانین و ضوابط حقائق ہی کو پیش نظر رکھ کر بنائے جاتے ہیں، مجازات کو بنیاد بنا کر نہیں بنائے جاتے۔ جو لوگ ہٹ اور ضد میں اتنی دور جا چکے تھے کہ اتنی موٹی سی بات بھی وہ مان کر نہ دے سکے، ان سے کیا توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ حضورؐ کے اس اقدام کی حکمت اور غایت کو سمجھ سکیں گے، اور یہ تسلیم کریں گے کہ یہ قدم آپؐ نے کسی بشری جذبے کے تحت نہیں اٹھایا ہے، بلکہ ایک اہم تشریعی ضرورت اور اصلاحی

مقصد سے اٹھایا ہے، اور اس کا اٹھانا آپ کے منصبِ رسالت کا عین مقتضا تھا۔ کیونکہ آپؐ کی بعثت کا مدعا پورا ہی نہیں ہو سکتا تھا اگر معاشرے کے اندر پائی جانے والی خود ساختہ اور بے اصل رسمیں اپنی جگہ برقرار رہ جاتیں۔ آپؐ رحمۃٌ للعالمین بن کر تشریف لائے تھے۔ اس عظیم منصب کے فرائض میں یہ بات بھی شامل تھی کہ انسان کو اُن زنجیروں سے آزادی دلادیں جو اُس نے خود اپنی ناسمجھی سے اپنے پاؤں میں ڈال رکھی تھیں، اور اُن بوجھوں کو اس کے سر سے اتار دیں جنہیں اس نے خود اپنے اوپر لاد رکھا تھا، اور ان کے نیچے بری طرح پس رہا تھا۔ پھر آپؐ آخرالزماں بھی تھے۔ آپؐ کے بعد کوئی اور نبی آنے والا نہیں تھا کہ اس بے جا رسم اور جاہلی نظریے کا خاتمہ اُس کے لیے چھوڑ دیا جاتا۔ اس وجہ سے اور بھی ضروری تھا کہ نافہموں کے کسی متوقع شوروغوغا کی کوئی پروا نہ کی جاتی، اور حق کی تلوار بے نیام ہو کر اس جاہلی بندش کو بہرحال کاٹ پھینکتی۔ اور یہی آپؐ نے کیا۔ مگر اتنی سیدھی سی بات ان کی سمجھ میں نہیں آسکی، اور آ اس لیے نہیں سکی کہ رواج پرستی ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنے مزعومہ نظریوں اور رواجوں کو شریعت کی حیثیت دے رکھی تھی۔ ان کے مقابلے میں خدا کے احکام کو وہ بدعت تصوّر کرتے تھے۔ اس لیے اسلام کے دیگر احکام کی طرح اس حکم کو بھی انہوں نے اپنے لیے باعثِ تنفّر ہی پایا اور اس سے ہرگز مانوس نہ ہو سکے۔

۱۱۔ خدا کی لامکانیت

اسلام نے جب اس نقشِ حقیقت کو اُجاگر کیا کہ اللہ کسی جگہ میں محصور نہیں، وہ لامکاں ہے، تو جاہلیت کے پرستاروں کے پست اور تنگ ذہن میں اس کی سمائی نہ ہو سکی۔ جس کا کھلا ہوا مظاہرہ تحویلِ قبلہ کا حکم آنے پر ہوا۔ پہلے بیت المقدس ہی اہلِ اسلام کا بھی قبلہ رہا۔ ۲ھ میں اللہ تعالیٰ کی ہدایت آنے پر خانۂ کعبہ قبلہ قرار پایا گیا۔ اس ہدایت کے دیے جانے سے پہلے بھی، اور اس کے دیے جانے کے موقع پر بھی، اس کی وجہ اور اس کی حکمت اور ضرورت لوگوں کو اچھّی طرح سمجھا دی گئی تھی۔ مگر تحویلِ قبلہ کا یہ حکم اُن اہلِ کتاب کے لیے بھی ناقابلِ فہم ثابت ہوا جنہیں تورات خدا کی ذات و صفات کا علم صاف صاف دے چکی تھی۔ اِسے ان کے ذہن کی

تاریکی سمجھیے یا ان کی ظاہر پرستی، کہ تحویل کا اعلان سنتے ہی انہوں نے تیوریاں چڑھالیں اور کہنا شروع کر دیا کہ یہ کیا تماشا ہے؟ کیا خداوندِ دو جہاں بھی جگہیں بدلا کرتا ہے؟ کیا بیت المقدس سے نکل کر وہ اب کعبہ میں آ بیٹھا ہے؟ قرآن حکیم نے اُن کے اِس بچکانہ اظہارِ تعجب پر مغز اور پوست کا فرق واضح کرتے ہوئے سمجھایا کہ کسی مقام کا قبلہ ہونا نہ پہلے کوئی مقصود بالذات شے تھا، نہ اب ہے، مشرق اور مغرب سب خدا ہی کے ہیں، جس سمت بھی تم رخ کرو گے وہاں خدا موجود ہوگا (لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ۔ بقرہ - ۱۱۵) اس لیے کسی سمت کو بطورِ خود دوسری سمتوں پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ نہ کسی خاص سمت میں خدا محصور رہے، اور نہ کسی طرف رخ کرنا بجائے خود نیکی اور تقویٰ اور خدا پرستی کا کام ہے۔ فضیلت اور تقدس تمام تر اللہ کے حکم اور اس کی پسند کو حاصل ہے۔ اس لیے کسی خاص سمت کو اگر کوئی فضیلت مل سکتی ہے تو اس کے حکم اور اس کی پسند کے طفیل ہی مل سکتی ہے۔ کل تک اگر کسی مصلحت کی بنا پر اللہ رب العالمین کا حکم اور اس کی پسند یہ تھی کہ بیت المقدس کو قبلہ بنایا جائے، تو اس وقت تک بیت المقدس ہی کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنا صحیح، برحق، ضروری اور نیکی و خدا پرستی کا کام تھا۔ آج سے اس کا حکم اور اس کی پسند، کسی حکمت اور بالاتر مصلحت کے سبب، چونکہ یہ ہے کہ خانۂ کعبہ کو قبلہ بنا لیا جائے تو اب نیکی اور خدا پرستی اسی کی طرف رُخ کرنے میں ہے (لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ.... الخ۔ بقرہ - ۱۷۷) لیکن یہ ساری افہام و تفہیم بے نتیجہ رہی۔ اور بے نتیجہ اس لیے رہی کہ یہ لوگ کتاب و شریعت رکھنے کے باوجود اس کی روح سے بے بہرہ ہو چکے، اور صفاتِ الٰہی کا صحیح تصور کھو بیٹھے تھے۔ ممکن ہے کہ کہنے کی حد تک وہ خدا کو زمان و مکان اور جسم و جسمانیت کی قیود سے بالاتر مانتے رہے ہوں، مگر یہ ماننا شعوری کم، اور روایتی زیادہ تھا۔ فی الواقع وہ سخت ظاہر بیں بن چکے تھے قبلہ کی تبدیلی کی بات سمجھ نہ سکنے کی ایک بڑی وجہ ان کی یہی ظاہر بینی تھی۔ وہ سمتِ قبلہ کو صرف ایک سمت سمجھنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کی ذات سے خصوصی اور دائمی تعلق رکھنے والی مقدس سمت تصور کیے بیٹھے تھے۔ اپنے اندرون کی اس کم نظری کے باعث وہ اسلام اور قرآن کی بات سے اجنبیت کا مظاہرہ آخر تک ترک نہ کر سکے۔

جب صاحبِ کتاب لوگوں کا یہ حال تھا تو دوسروں سے حقیقت بینی کی کیا توقع ہو سکتی تھی۔ چنانچہ منافقین نے بھی اس موقع پر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ اہلِ کتاب کا واویلا تو ان کی اپنی صفوں ہی تک محدود رہا، مگر اُن منافقوں کو، جو اپنے کو امت مسلمہ کے اندر شمار کرائے ہوئے تھے، پیروانِ اسلام کے ذہنوں میں بھی شکوک اور وساوس کی تخم ریزی کا زریں موقع مل گیا جس سے انہوں نے پورا فائدہ اٹھایا۔ سادہ مزاج مسلمانوں کے کانوں میں پھونکتے پھرے کہ یہ طرفہ ماجرا سمجھ میں نہیں آتا۔ قبلہ نہ ہوا، خدائے ذوالجلال کی 'سیمابیت' کا کھلونا بن گیا! آج تک اس نے بیت المقدس کی طرف رخ کرکے ہم سے نمازیں پڑھوائیں، اب فرمان جاری ہوتا ہے کہ جس طرف اب تک بیٹھ کیا کرتے تھے اب سے اس طرف منہ کیا کرو، اور بیت المقدس کو چھوڑ کر کعبہ کی سمت رُخ کرکے نماز پڑھا کرو۔ تو کیا اب تک کی ساری نمازیں اللہ کے لیے نہیں، کسی اور کے لیے تھیں؟ یہ غوغا اتنی شدت اور کثرت سے جاری رہا کہ کتنے ہی کمزور ایمان والے مذبذب، اور کتنے ہی منافق کھلے منکر بن کر رہ گئے۔

۱۲۔ غربا پروری

اسلام نے جہاں زندگی کے ایک ایک شعبے اور مسئلے کے بارے میں ہدایات نافذ کیں، وہاں اپنا ایک خاص معاشی نظام بھی جاری کیا۔ اس نظام کے مقاصد میں سے سب سے مقدم مقصد معاشرے سے بھوک اور ناداری کا خاتمہ تھا۔ اسلام کی آمد کے وقت ملک میں جو معاشی نظام قائم تھا اور جن کاروباری روایات پر عمل ہو رہا تھا، ان کی عمارت خود غرضی، استحصال اور سنگ دلی پر کھڑی تھی۔ غریبوں اور بے کسوں پر رزق کے دروازے گویا بند ہی تھے، پیسہ ان کے ہاتھوں تک پہنچنے کا راستہ مشکل ہی سے پاتا تھا، جب کہ ہاتھ سے نکل جانے کے راستے ہر طرف کھلے ہوئے تھے۔ دوسری طرف طاقت وروں اور امیروں کے ہاتھوں میں وہ صرف آنا جانتا تھا، جب کہ رزق کے ذرائع پر ان کی اجارہ داری بھی قائم تھی جو ظالمانہ حد تک سخت تھی۔ اسلام کا معاشی نقطۂ نظر اس رائج الوقت نظامِ معیشت کی عین ضد تھا۔ وہ عادلانہ ہی نہیں بلکہ غریب پرورانہ بھی تھا۔ اس نے دولت مندوں کی اس بات پر سخت

ملامت کی کہ وہ اپنی دنیا میں مست، اور ناداروں کے حال سے بے پروا رہتے ہیں۔ اور انہیں جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اس بات پر اکسایا کہ غریبوں کی خبر گیری کیا کرو، انہیں بھوکا ننگا ہرگز نہ رہنے دو۔ اور جہاں تک اس کے اپنے پیروؤں کا تعلق تھا، ان کو تو اس نے اس اخلاقی تلقین کے ساتھ ساتھ اس امر کا قانوناً بھی پابند کر دیا کہ اپنے مال کا ایک مقررہ حصہ لازماً معاشرے کے نظم اجتماعی کے حوالہ کیا کریں، تاکہ اسے حاجت مندوں میں تقسیم کر دیا جایا کرے۔ "تُوخَذُ مِنْ اَغْنِيَاءِهِمْ وَتُرَدُّ فِي فُقَرَاءِهِمْ"[1] (یہ مالِ زکوٰۃ مال داروں سے لے کر انہی کے غریب بھائیوں کو لوٹا کر دے دیا جائے گا) ظاہر ہے کہ اس معاشی نظام کے اس غیر معمولی مطالبے کی تاب لانا خودغرض اور زر پرست جاہلی معاشرے کے لیے آسان نہ تھا۔ اس لیے اس کی سخت مخالفت کی گئی، اور اس مخالفت کے لیے ایسی منطق پیش کی گئی کہ اس کی داد نہیں دی جاسکتی۔ اِس عادلانہ اور غریب پرورانہ نظام کو کھلا ہوا احمقانہ نظام قرار دیا گیا، اور اس کے 'احمقانہ' ہونے کی دلیل یہ پیش کی گئی کہ:-

اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَاءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗ (یٰس۔ ۴۷)	کیا ہم ان لوگوں کو کھلائیں پلائیں جن کو اللہ چاہتا تو خود کھلا دیتا۔

اور اس نادر فلسفہ طرازی کے بعد اہلِ اسلام کی بابت فیصلہ صادر کر دیا گیا کہ:-

اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (ایضاً)	تم مسلمان تو کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا ہو۔

اس منطق کا مدعا یہ تھا کہ اگر خدا کی پسند یہی ہے، جیسا کہ مسلمان کہتے ہیں، کہ بھوکوں کو کھلایا اور ننگوں کو پہنایا جائے، تو اسے خود ایسا کرنے سے کس نے روک دیا ہے؟ وہ تو قادرِ مطلق اور رزاقِ عالم ہے۔ جب اس نے انہیں خود کھانے کپڑے سے محروم رکھا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ انہیں ان نعمتوں کا مستحق ہی نہیں سمجھتا۔ اب جسے اس نے اپنی عطا و بخشش کا مستحق نہ قرار دیا ہو، اسے کھلانے پلانے اور کپڑے پہنانے کی جسارت ہم کیوں کریں؟ جس کام کو وہ صحیح نہ سمجھے، اسے ہم ایک نیک کام سمجھ لیں، یہ تو بڑی عجیب بلکہ گستاخی کی حرکت ہوگی۔

---

[1] بخاری، جلد اوّل۔ باب وجوب الزکوٰۃ۔

ان لوگوں کی اس عجیب و غریب منطق پر انہیں سمجھانے کی پوری کوشش کی گئی، وضاحت سے بتایا گیا کہ حقیقت نفس الامری وہ بالکل نہیں ہے جو تم نے اپنے ذہنوں میں بٹھا رکھی ہے۔ نہ کسی غریب کی غربت کے معنی یہ ہیں کہ خدا اس سے خوش نہیں ہے اور اسے منظور رہی نہیں کہ اس شخص کو زندگی کی ضرورتیں فراہم ہوں، نہ کسی کی دولت مندی اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ وہ خدا کا محبوب اور اس کی نوازشوں کا مستحق ہے۔ ناداری اور خوش حالی دونوں ہی چیزوں کا تعلق خدا کے قانونِ آزمائش سے ہے۔ ناداری میں مبتلا کر کے وہ آدمی کے جذبۂ صبر کو، اور دولت دے کر جذبۂ شکر کو آزماتا ہے (نَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً۔ انبیاء ۳۵) دولتمند کو جو دولت عطا ہوتی ہے وہ اس کا اصل مالک نہیں ہوتا، اصل مالک تو اس دولت کا عطا کرنے والا خدا ہی ہوتا ہے۔ اور جس کو یہ دولت ملی ہوتی ہے وہ حقیقتاً اس کا صرف 'امین' ہوتا۔ امین کا کام امانت کے مال کو اصل مالک کی مرضی کے مطابق خرچ کرنا ہوتا ہے۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق اسے اپنے تصرف میں نہیں لا سکتا۔ اللہ تعالیٰ جو کچھ کسی کو عطا کرتا ہے' اس کے بارے میں اس کی مرضی یہ ہوتی ہے کہ وہ اس میں سے اپنی ضرورت کے مطابق لے کر باقی ماندہ حصہ اس کے دین کے کاموں میں اور غریب بندگانِ خدا پر صرف کرے۔ یہ ان غریبوں پر اس کا کوئی احسان نہ ہوگا، بلکہ ان کے حق کی ادائی ہوگی۔ (وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ۔ ذاریات۔ ۱۹) یہ 'حق' اس کی تحویل میں صرف اس لیے امانۃً دے دیا گیا ہوتا ہے کہ اس کے جذبۂ امانت داری کی آزمائش ہو' دیکھا جائے کہ وہ ایک سچے اور فرض شناس امین کی طرح غریبوں کے حصہ کا یہ حق انہیں پہنچا دیتا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں پہنچاتا تو خائن قرار پائے گا اور اس خیانت کی پاداش اسے بھگتنی ہوگی ۔۔ مگر بات کے سمجھانے کی یہ ساری کوششیں صحرا کی آواز بن کر رہ گئیں۔ جاہلیت کے خود غرض اور دولت پرست مریدوں کی اوندھی کھوپڑی میں اخلاق اور انسانیت کا یہ سیدھا سادا نظریہ کسی طرح بار نہ پا سکا۔ وہ اسے بدستور ایک عجیب و غریب خیال آرائی ہی قرار دیتے رہے۔

۱۳۔ سود کی ممانعت

اسلام نے اپنے معاشی نظام میں سود کی کوئی گنجائش نہیں رکھی اور اس کی مکمل ممانعت کر دی۔

اس نے ایسا اس لیے کیا کہ سود خواری فرد اور معاشرہ ، دونوں کے حق میں انتہائی ضرر رساں ہوتی ہے۔ فرد کا ضرر یہ ہے کہ سود کھانے سے اس کی انسانیت مرجاتی اور اس کی نفسیات پر خود غرضی سنگ دلی اور زرپرستی کا کابوس سوار ہو رہتا ہے۔ معاشرے کا ضرر یہ ہے کہ اس کے نادار ارکان کی معاشیات تباہ ہو جاتی ہیں۔ دولت مندوں کی طرف سے انہیں کوئی تعاون ملنے کے بجائے الٹا اپنے معمولی سرمایوں کو بھی ان کے حوالے کرتے رہنے پر مجبور رہنا پڑتا ہے۔ اس وجہ سے اسلام نے ابتداء ہی سے سود کی مذمت کرنی شروع کر دی تھی، اور بالآخر اسے قطعی حرام اور کلیتہً غیر قانونی کاروبار قرار دے دیا۔ اسلام کا یہ معاشی اقدام جاہلی ذہنیت والوں کے لیے بالکل بے تکا اور نا قابلِ فہم ثابت ہوا، اور اس پر ان لوگوں نے یہ تبصرہ کیا :۔

إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا (بقرہ ۔ ۲۷۵) بیع تو سود ہی جیسی چیز ہے۔

قرآن مجید نے ان لوگوں کا یہ تبصرہ نقل کرنے سے پہلے انہیں اُس شخص سے تشبیہ دے رکھی ہے جسے شیطان کی چھوت نے مخبوط الحواس بنا دیا ہو۔ اُن کا یہ قول ان کے مخبوط الحواس ہونے کی کھلی ہوئی دلیل ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ عام تجارت اور سودی کاروبار کے نفسیاتی ، اخلاقی اور معاشی فرق کو سمجھنے سے قاصر رہے ، بلکہ بیع اور ربوا میں الٹی تشبیہ کا انداز اختیار کر کے اپنے عقلی فساد اور اخلاقی دیوالیہ پن کو ننگا بھی کر گئے۔ بجائے اس کے کہ اپنے محبوب سودی کاروبار کو جائز ثابت کرنے کے لیے اسے بیع وشرا کے مماثل قرار دیتے اور بیع کی اباحت کو اصل تسلیم کر کے اور سود کو اسی جیسی چیز ٹھیرا کر اس کے جواز پر دلیل لاتے، انہوں نے سود ہی کو مباح الاصل قرار دے رکھا تھا، اور بیع کو اس لیے جائز بتاتے تھے کہ وہ بھی سود ہی جیسی چیز ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ سود کی حلت تو ان کے نزدیک بالکل قطعی، بدیہی اور مسلّمہ تھی، اور اس کے جواز کو ثابت کرنے کی بالکل کوئی ضرورت نہیں تھی۔ البتہ تجارتی کاروبار کا معاملہ اتنا واضح نہیں تھا۔ اس لیے اس کے جواز کے لیے یہ دیکھنے کی ضرورت پڑی کہ وہ بھی سودی کاروبار ہی جیسی کوئی چیز ہے یا نہیں ہے؟ دیکھنے سے چونکہ انہیں یہ نظر آیا کہ اس کی نوعیت بھی سود ہی جیسی ہے، اس لیے وہ بھی جائز قرار پایا ــــ یہ تھا ان لوگوں کا اندازِ فکر۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ جاہلیت جب کسی کے دل ودماغ کو اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے تو وہ عقل وفطرت کی شاہراہ سے

کتنا دور جا پڑتا ہے، اور پھر دینِ فطرت کے مزاج سے اس کی بے گانگی کس انتہاء کو پہنچ جاتی ہے۔

حاصلِ بحث

یہاں حالات اور واقعات کا استقصاء مقصود نہیں، اور استقصاء کچھ آسان بھی نہیں۔ کیونکہ اسلام کی ابتدائی تاریخ اسلامی تعلیمات سے لوگوں کی اجنبیت کے مظاہروں سے بھری پڑی ہے۔ اس کے بنیادی عقائد سے لے کر تفصیلی افکار تک میں مشکل ہی سے کوئی ایسی چیز تھی جو پیروانِ جاہلیت کے لیے بے تکی اور ناقابلِ فہم نہ ثابت ہوئی ہو۔ جو چند واقعات بطور مثال پیش کیے گئے ہیں وہ اس حقیقت کو واضح کر دینے کے لیے بالکل کافی ہیں۔ ان کی روشنی میں اسلام اور جاہلیت کے معرکے کا منظر آنکھوں کو صاف دکھائی دے جاتا ہے، اور ان سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اسلام کی دعوت کو سن کر جاہلیت کی غلام اور نفس کی پجاری دنیا کا کیا حال ہوا ہوگا؛ کس طرح اس نے بات بات پر منہ بنایا ہوگا؛ اور حیرت و استعجاب کے کتنے قہقہے بلند کیے ہوں گے؛ اور پھر یہ نظری اندازہ تقریباً چشم سر کا مشاہدہ بن جاتا ہے جب اس تاریخی واقعہ کی یاد بھی ذہن کے پردے پر ابھر آتی ہے کہ اسلام کی آواز پر لبیک کہنے والے اور قرآنی تعلیمات کے پیکر میں ڈھل جانے والے اہلِ ایمان بھی وحشت بھری نظروں سے دیکھے جا رہے تھے اور خود اپنے گھروں میں اجنبی بنا کر رکھ دیے گئے تھے۔ ہر طرف سے ان پر آوازے کسے جاتے، ہر مجلس میں ان کی 'حماقتوں' پر تبصرے ہوتے، ہر راستے میں اُن کو طنز بھرے اشاروں کا نشانہ بنایا جاتا۔ قرآن کریم کا بیان ہے کہ:۔

إِنَّ الَّذِينَ أَجْرَمُوا كَانُوا مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا يَضْحَكُونَ ۝ وَإِذَا مَرُّوا بِهِمْ يَتَغَامَزُونَ ۝ وَإِذَا انْقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمُ انْقَلَبُوا فَكِهِينَ ۝ وَإِذَا رَأَوْهُمْ قَالُوا إِنَّ هَٰؤُلَاءِ لَضَالُّونَ ۝ (المطففین۔ ۲۹-۳۲)

مجرم لوگ ایمان والوں پر ہنستے تھے۔ جب اُن کے پاس سے گذرتے تو (ازراہِ طعن و تمسخر ان کی طرف) اشارے کرتے ہوئے گذرتے، اور جب اپنے اہل و عیال کی طرف لوٹتے تو (نشاط سے) چہکتے ہوئے لوٹتے۔ اور جب انہیں دیکھتے تو کہتے بلاشک و شبہ یہ گم راہ لوگ ہیں۔

جب اسلام پر ایمان لانے والوں کو اس حد تک مذاق کا موضوع بنالیا گیا تھا تو سوچیے خود اسلام کی 'پرسش' کا کیا حال رہا ہوگا؟ اصل 'مجرم' تو وہی تھا، اور اس کا کوئی بھی 'جرم' ایسا نہ تھا جو ان کی نگاہ میں قابلِ معافی ہوتا۔ بات یہ ہے کہ کسی فکر یا رویّے کو نہ ماننے کے تین درجے ہوتے ہیں۔ ابتدائی درجہ تو یہ ہے کہ آدمی اس پر سنجیدگی اور گہرائی سے غور کر کے فیصلہ کرے کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ بس ایک نیم سنجیدہ اور سرسری نظر ڈال کر یہ نتیجہ اخذ کرلے کہ یہ غلط ہے۔ اور انتہائی درجہ یہ ہے کہ وہ اسے سرسری غور وفکر کا بھی مستحق نہ سمجھے اور چھوٹتے ہی کہہ دے کہ اس کے صحیح اور معقول ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ جاہلیت کا مزاج جب پختہ ہو چکا ہوتا ہے تو آدمی دینِ حق کے بارے میں یہی انتہائی طرزِ عمل اختیار کرتا ہے۔ عرب کے ائمۂ جاہلیت کا مزاج و مذاق ایسا ہی بن چکا تھا۔ اس لیے اُن کے ٹیڑھے ذہن میں دعوتِ حق کی کوئی اہم بات اُسی طرح نہیں اتر پاتی تھی جس طرح گول خانے میں چوکھٹی چیز نہیں گھس پاتی، اور اُن کی جاہلیت کی ڈسی ہوئی عقل کفر و شرک، فسق اور نفس پرستی، مادیت اور بدطینتی کی روحانی تلخی کا احساس اُسی طرح کھو بیٹھی تھی جس طرح سانپ کے ڈسے ہوئے کو نیم کی پتیوں کی کڑواہٹ محسوس نہیں ہو پاتی۔

حالات کی ایک جامع اور بلیغ تعبیر

اسلام کی ابتدائی تاریخ کے ان حالات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تین لفظوں کے ایک مختصر سے بلیغ جملے میں اس طرح بیان فرمایا ہے:-

بَدَءَ الِاسْلَامُ غَرِیْبًا[1] — اسلام کا آغاز ایسے حالات میں ہوا تھا کہ وہ دنیا کے لیے یکسر 'غریب' تھا۔

'غریب' کے معنی عربی زبان میں اُس معنی سے بہت کچھ مختلف ہیں جو اِس لفظ کے اردو زبان میں ہیں۔ اردو میں غریب کے عام اور مشہور معنی مفلس اور نادار کے ہیں، اور کبھی کبھی 'مسافر' کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح جب وہ 'عجیب' کے لفظ کے ساتھ

---

[1] مسلم، جلد اوّل، باب ان الاسلام بدء غریبًا۔

اس کے مرادف کے طور پر بولا جاتا ہے اس وقت اس کے معنی 'انوکھے' کے بھی ہوتے ہیں لیکن عربی زبان میں اس کے معنی مفلس اور نادار کے تو بالکل نہیں ہیں، البتہ 'مسافر' کے ضرور ہیں مگر یہ معنی بھی دراصل مجازی ہیں، حقیقی نہیں ہیں۔ حقیقی معنی اس کے نرالے، بیگانے، اجنبی اور نامانوس کے ہیں، اور یہی اصل معنی اس ارشادِ نبوی میں مراد ہیں۔ 'مسافر' کے معنی اس لیے مراد نہیں ہوسکتے کہ ایسی شکل میں نہ تو اس ارشاد کے اندر کوئی خاص معنویت پیدا ہوسکتی ہے نہ ادب کا ذوق ہی اسے تسلیم کرسکتا ہے۔ پھر غریب کے معنی اگر مسافر کے ہوتے ہیں تو اس کی وجہ بھی یہی ہوتی ہے کہ وہ ایک اجنبی ماحول میں ہوتا ہے اور وہاں کے لوگوں کو اس سے اور اس کو ان سے کوئی اُنس نہیں ہوتا، یہ ان کے لیے اور وہ اس کے لیے بکسر بیگانہ ہوتے ہیں۔ لیکن اصل اجنبیت اور بے گانگی شکل صورت، وضع قطع، قومیت اور وطنیت کی نہیں ہوتی، بلکہ افکار و نظریات، پسند و ناپسند اور مذاق و مزاج کی ہوتی ہے۔ ایک آدمی اپنے ہم وطنوں، ہم قوموں اور قرابت داروں کے اندر رہتے ہوئے بھی اپنے کو تنہا اور بے گانہ پا سکتا ہے اگر اس کا ذہن و ذوق ان کے ذہن و ذوق سے میل نہ کھاتا ہو اور اس کے افکار و تصورات ان کے افکار و تصورات سے بالکل جداگانہ ہوں۔ پس اسلام کے 'غریب' ہونے کا مطلب جس طرح یہ نہیں ہے کہ جب اس کی ابتدا ہوئی تھی اس وقت اس کے عملی معنی افلاس کے تھے اور اس کے ماننے والے سب کے سب مفلس تھے، اسی طرح یہ بھی نہیں ہے کہ اسلام کی ابتداء مسافرت یا خانہ بدوشی کی حالت میں ہوئی تھی۔ بلکہ اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ جب وہ آیا تھا اس وقت اپنی بے آمیز فطریت اور خالص خقلیت، اپنے عقائد اور تصورات، اپنے مزاج، اپنی پسند کے معیار اور اپنی قدروں کے اعتبار سے دنیا کے لیے بالکل نرالا، سراپا اجنبی اور بیگانۂ محض تھا، اس کی ایک ایک بات لوگوں کو عجیب معلوم ہوتی تھی، ہر چیز انوکھی، اوپری اور نامانوس دکھائی دیتی تھی۔ صورتِ حال ایسی تھی گویا لوگ مریخ کے ہوں اور دنیا کی زبان میں ان سے خطاب کیا جارہا ہو۔

اوپر جن واقعات کا، اور اسلامی تعلیمات کے خلاف اہلِ عرب کے جن مظاہراتِ اجنبیت کا تذکرہ کیا گیا ہے، وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشادِ گرامی کی تاریخی شہادت بھی ہیں اور اس کے مدعا کی عملی شرح بھی ہیں۔

بَدَءَ الْاِسْلَامُ غَرِیبًا (۲)

صحابۂ کرام کا عبوری دورِ تربیت

اسلام اپنے ابتدائی دور میں جس حالتِ 'غربت' سے دوچار رہا تھا، اس کی داستان اتنے ہی پر ختم نہیں ہو جاتی جو اب تک بیان ہوئی، بلکہ اس کا سلسلہ دراز ہو کر حضراتِ صحابہؓ کے ابتدائی حالات تک جا پہنچتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے مطلوبہ ذہنی سانچے سے اُس وقت کے رائج اندازِ فکر و نظر کی دوری حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ اس لیے جاہلیت کے اندھے پیرووں کا معاملہ تو الگ رہا، اُن حق شناسوں کو بھی، جو اس جاہلیت کے گھٹا ٹوپ اندھیرے سے نکل آئے تھے اور جنہیں اللہ کے دین پر بنیادی طور سے پورا شرحِ صدر حاصل ہو چکا تھا، اس دین کے تفصیلی تقاضوں سے اچھی طرح روشناس ہو جانے میں ابتداءً بہت کچھ دشواریاں پیش آتی رہیں، اور اس کی فکر کی بے نظیر بلندیوں کے سامنے وہ بھی کبھی کبھی ٹھٹھک کر کھڑے ہو جاتے رہے۔ اور برسوں کی تربیتی کوششوں کے بعد ہی مزکّیِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ذہنوں کو آئینہ بنا سکے۔

اگرچہ اس امرِ واقعی کی تفصیل میں جانا اور واقعات کی شہادت پیش کرنا کوئی خوشگوار بات نہیں، مگر موضوعِ گفتگو کا حق ادا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ تھوڑے سے واقعات، بطور مثال، بہر حال سامنے رکھ لیے جائیں۔ تا کہ ان کی روشنی میں یہ حقیقت واضح طور سے دیکھ لی جا سکے کہ اسلام صرف غیروں ہی کے لیے غریب اور اجنبی نہ تھا، بلکہ اس کے یگانے بھی بسا اوقات اس کی مکمل شناخت سے قدرے قاصر پائے جاتے رہے تھے، اور اس کا پوری طرح مزاج شناس

بن جانے کے لیے انہوں نے خاصا وقت لیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ غیروں نے اسلام کو جو غریب اور ناقابلِ فہم قرار دیا تھا تو اُس کی وجہ بالکل دوسری تھی اور نوعیت بھی یکسر مختلف تھی۔ اس معاملہ میں اُن سے حضراتِ صحابہؓ کرام کا کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ اُن لوگوں نے اسلام سے جس بیگانگی کا مظاہرہ کیا تھا وہ ہر طرح سے مکمل بیگانگی تھی اور تمام تر جاہلی تمیت، عقلی اندھے پن اور ضد پر مبنی تھی، جب کہ اِن حضرات کی طرف سے ہونے والے مظاہراتِ بیگانگی جزوی حیثیت کے، اور نسبتاً بہت معمولی قسم کے تھے، جن کے پیچھے کسی غلط جذبے کا شائبہ تک موجود نہ ہوتا تھا، بلکہ صرف یہ فطری حقیقت ہوتی تھی کہ انسان کسی اونچی تعلیم کے بنیادی اصولوں کو سچے دل سے مان لینے کے بعد بھی اس کے تفصیلی تقاضوں کے سمجھ پانے کے لیے لازماً مزید تفہیم کا محتاج رہتا ہے۔ چونکہ یہاں بحث صرف بیگانگی اور غربت کے نفس وجود سے ہے، اور امرِ واقعہ یہی ہے کہ اس کا وجود ابتداءً اہلِ ایمان کے اندر بھی کسی نہ کسی حد تک پایا گیا تھا جس ان کے ذہنوں کو صاف کر دینے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خاصی توجہ کرنی پڑی تھی، اس لیے حقیقتِ حال کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے مناسب ہی نہیں، ضروری بھی ہے کہ اس سلسلے میں ذرا تفصیل سے کام لیا جائے۔ یعنی حقائق اور واقعات کے حوالے سے دیکھ لیا جائے کہ اس اجنبیت اور بیگانگی کی نوعیت کیا تھی؟ اور حضرات صحابہؓ کی طرف سے وقتاً فوقتاً فکری نارسائیوں کے اور دین کے تقاضوں سے جزئی اجنبیت کے جو مظاہرے ہو جاتے تھے وہ کیا اور کیسے تھے؟ اس جائزے کے بعد ہی ارشادِ نبوی بَدَءَ الْاِسْلَامُ غَرِیْبًا کا پورا مدعا واضح ہو کر سامنے آ سکے گا، اور ساتھ ہی اس کا بھی اندازہ ہو جائے گا کہ اسلام کا توحیدی مزاج کتنا پاکیزہ اور حنیف ہے، اور اس کی تعلیمات کتنی فکر آزما ہیں۔ اس کے علاوہ یہ حقیقت بھی روشنی میں آ جائے گی کہ جب جاہلیت کے ہاتھ سے میدان نکل جاتا ہے، اس وقت بھی وہ زیرِ زمین کہیں نہ کہیں خفیہ پناہ گاہوں میں چھپی بیٹھی رہ جانا چاہتی ہے، تا کہ جہاں تک ہو سکے اسلام کو غربت کی حالت سے کلیتہً باہر نکل آنے سے روکے رکھے۔

۱۔ کوئی بھی انسان قوانینِ طبیعی سے بالاتر نہیں

اسلام کی بنیادی تعلیمات — توحید، رسالت اور آخرت — سے تو اِن قدوسیوں

کوکسی طرح کی اجنبیت محسوس کرنے کا کوئی سوال اور امکان ہی باقی نہیں رہ گیا تھا۔ کیونکہ قرآنِ حکیم نے اِن تعلیمات کو اُن کے دلوں اور دماغوں کے اندر اتار دینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ خصوصاً جاہلیت کے سب سے بڑے ستون، شرک، پر پے در پے اتنی اور ایسی کاری ضربیں لگائی تھیں کہ ان کے ذہنوں میں اس کا دور دور تک کوئی نشان تک باقی نہ رہ گیا تھا۔ موسوی امت تو دو دو جلیل القدر پیغمبروں کی آغوشِ تربیت میں رہتے ہوئے بھی ایک مشرک قوم کے بتوں اور مجسموں کو دیکھ کر للچا اٹھی تھی، مگر اصحابِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذوقِ توحید اتنا پاکیزہ اور غیور تھا کہ وہ کسی بت یا مظہرِ شرک کو ایک آنکھ دیکھنا بھی گوارا نہ کر سکتے تھے لیکن اسلام کے تصورِ توحید کی بلندیاں اور لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے معنی کی نزاکتیں اتنی بے کراں ہیں کہ اس کے دور کے تقاضوں کا پوری طرح شناسا بن جانا ان کے لیے بھی کچھ آسان نہ تھا۔ مثال کے طور پر بشریت کے مرتبہ و مقام کی بات کو لے لیجیے۔ اسلام نے جہاں پتھروں اور درختوں جیسی ادنیٰ مخلوقات کے سامنے جھکی ہوئی پیشانیوں کو اٹھا کر اونچا کر دیا تھا، وہاں بڑی سے بڑی انسانی ہستیوں کو بھی عبدیت کے عجز و نیاز کی عام سطح پر لا اتارا تھا، اور صاف طور سے واضح کر دیا تھا کہ خدا نے کسی شخص کو بھی پیدائشی طور پر کوئی امتیازی حیثیت نہیں عطا کی ہے، سب اس کے یکساں درجے کے بندے ہیں، اور اس کی سنت سبھی کے لیے ایک ہے، فطرت کے قوانین کسی شخصیت کا احترام نہیں کیا کرتے، اگر کسی کو کوئی خاص شرف حاصل ہوتا ہے تو وہ محض حسنِ بندگی کے نتیجے میں حاصل ہونے والا شرف ہوتا ہے، ورنہ بالذات عزت و عظمت صرف اُسی ایک ہستی کے لیے مخصوص ہے، باقی ساری موجودات بے چارۂ محض ہیں، اور اس بے چارگی میں سب برابر کے شریک ہیں۔ لیکن دنیا بلند قامت شخصیتوں کو بشریت کی سطح سے کچھ نہ کچھ برتر سمجھنے کی ہمیشہ سے عادی رہی ہے، اور اس ذہنیت کے جراثیم بڑے سخت جان اور بڑے بے پناہ ہوتے ہیں۔ حضرات صحابہؓ تک کے ذہنوں میں بھی انہوں نے خاموشی کے ساتھ جمے اور چھپے رہنے کی کوشش کی، اور پھر ہوتے ہوتے ہی فنا ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یک سالہ لختِ جگر، حضرت ابراہیم، نے جس دن وفات پائی، اتفاق سے اس دن سورج گرہن بھی لگا تھا۔ بعض اصحابؓ کو اسی عام ذہن کے مطابق یہ گمان ہوا کہ یہ گرہن جگر گوشۂ رسولؐ کی

وفاتِ حسرت آیات کے باعث لگا ہے۔ حضورؐ نے سُنا تو بلا تاخیر اس خیال کی اصلاح کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے، اور لوگوں کو جمع کر کے فرمایا:۔

اِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَا یَنْکَسِفَانِ لِمَوْتِ اَحَدٍ وَّ لَا لِحَیَاتِہٖ فَاِذَا رَاَیْتُمْ فَصَلُّوْا وَادْعُوا اللّٰہَ [۱]	حقیقت یہ ہے کہ چاند اور سورج میں کسی کی موت یا حیات کی وجہ سے گرہن نہیں لگا کرتا جب تم لوگ گرہن لگا دیکھو تو نماز پڑھو اور اللہ سے دعائیں مانگو۔

اور یہ کہ:۔

وَ لٰکِنَّھُمَا اٰیَتَانِ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰہِ [۲]	یہ سورج گرہن اور چاند گرہن اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں۔

اس ارشاد کا مدعا یہ ہے کہ کوئی انسان، خواہ وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، کائنات کے نظام پر کوئی حق یا اثر نہیں رکھتا۔ جس قانونِ قضا و قدر کے تحت ایک بھکاری مرتا ہے اور زمین و آسمان اس کا ماتم نہیں کرتے، اُسی قانون کے تحت وقت کا سلطان، بلکہ پیغمبر بھی وفات پاتا ہے اور چاند سورج اس کے غم میں ماتمی لباس نہیں پہنا کرتے۔

شخصی عظمت کے بارے میں غلو کا یہی چھپا ہوا تخیل تھا جس نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے موقع پر حضرت عمرؓ جیسے صاحبِ نظر کو بھی تھوڑی دیر کے لیے متاثر کر لیا تھا۔ اگرچہ قرآن حکیم بار بار یاددہانی کرا چکا تھا کہ کوئی فردِ بشر بھی زندگی اور موت کے قانون سے مستثنیٰ نہیں ہے، چھوٹا ہو یا بڑا، موت سب کو آنی ہے۔ اور جہاں تک حضورؐ کی ذاتِ گرامی کا تعلق ہے، اس کے بارے میں تو تعین اور صراحت کے ساتھ فرمایا جا چکا تھا کہ "اے نبیؐ! یقیناً تم بھی مرنے والے ہو" (اِنَّکَ مَیِّتٌ۔ زمر۔ ۳۰) اور اس "اِنَّکَ مَیِّتٌ" کے فیصلے کے ظہور کے لیے کسی وقت کی تعیین بھی نہیں کی گئی تھی، حتیٰ کہ اس کا بھی کوئی یقین نہیں دلایا گیا تھا کہ دین کے دشمنوں کی مغلوبیت اور ہلاکت کا جو وعدہ آپ سے کیا گیا ہے اس کے پورے ہونے تک آپؐ وفات نہ پائیں گے، بلکہ صاف صاف کہہ دیا گیا تھا کہ "جس عذاب کی دھمکی ہم ان (کفار) کو دے رہے ہیں اس کا

---

[۱] و [۲] بخاری، جلد اول۔ ابواب الکسوف

کوئی حصہ چاہے ہم دا ے نبیؐ) تمہارے جیتے جی دکھا دیں گے چاہے اس سے پہلے ہی تمہیں اٹھا لیں گے۔ ﴿وَ اِنْ مَّا نُرِیَنَّكَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّیَنَّكَ﴾... الخ۔ رعد ۴۰

لیکن یہ سب کچھ جاننے کے باوجود یہ جاں گداز حادثہ حضرت عمرؓ کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگیا، اور اس خبر کو سُن کر وہ جذبات کی شدت میں تھوڑی دیر کے لیے بھول سے گئے کہ قضائے الٰہی کے سامنے پست و بالا سب ایک سطح پر ہیں، اور حیرت کے عالم میں یہ خیال کر بیٹھے کہ اتنی عظیم اور غیر معمولی ہستی عام انداز میں کیسے گذر جا سکتی ہے۔ پیغمبرانہ عظمت کا جو نقش ذہن میں بیٹھا ہوا تھا، اس کی بنا پر وہ اپنے کو یہ باور کر لینے پر آمادہ نہیں کر پا رہے تھے کہ حضورؐ رحلت فرما گئے ہیں۔ یہاں تک کہ تلوار اٹھا کر بولے "جو کوئی کہے گا کہ حضورؐ وفات پا گئے اس کی گردن مار دوں گا"۔[1] "آپؐ تو اسی طرح آسمان پر زندہ اٹھا لیے گئے ہیں جس طرح حضرت عیسیٰؑ اٹھا لیے گئے تھے"۔[2] اس وقت صبر و تحمل کا وہ پیکر اٹھا جو توحید کی روح کو جذب کر لینے میں انبیاءؑ کے مقام کے قریب پہنچا ہوا تھا۔ اس نے بشریت کے مقام اور الوہیت کے مقام کے فرق پر روشنی ڈالتے ہوئے لوگوں سے کہا :-

مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَاِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ وَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ يَعْبُدُ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ حَیٌّ لَا يَمُوْتُ[3]	جو کوئی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پوج رہا تھا اسے معلوم ہونا چاہیے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) وفات پا گئے۔ اور جو کوئی اللہ کی پرستش کر رہا تھا اسے یقین رکھنا چاہیے کہ اللہ زندہ ہے، وہ کبھی نہ مرے گا۔

پھر قرآن کریم کی یہ آیت پڑھی :-

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاِئنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ	محمدؐ صرف ایک رسول ہیں، جن سے پہلے بہت سے اور رسول ہو گذرے ہیں۔ تو کیا اگر وہ وفات پا جائیں، یا شہید کر دیے جائیں تو

---

[1] شمائل ترمذی، باب فی وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ [2] الملل والنحل للشہرستانی۔ جلد اول۔ المقدمۃ الرابعۃ۔ [3] بخاری، جلد دوم باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

وَمَنْ یَّنْقَلِبْ عَلٰی عَقِبَیْهِ فَلَنْ یَّضُرَّ اللّٰهَ شَیْئًا وَسَیَجْزِی اللّٰهُ الشّٰکِرِیْنَ۔ (آل عمران۔ ۱۴۳)

تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ جو کوئی الٹے پاؤں پھر جائے گا وہ اللہ کا کچھ نہ بگاڑے گا۔ اور اللہ شکر گذاروں کو (بہتر) صلہ دے گا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی زبان سے یہ سننا تھا کہ حضرت عمرؓ کی آنکھیں کھل گئیں اور انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی چیز ان کو ہوش میں لا گئی ہے، اور یہ کہ گویا یہ آیت آج ہی نازل ہوئی ہے۔

اسی امر کی ایک اور مثال لیجیے حضرت ابنِ عباس روایت کرتے ہیں کہ:۔

اِنَّ رَجُلًا قَالَ لِلنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّم مَا شَاءَ اللّٰهُ وَشِئْتَ [1]

ایک شخص نے دورانِ گفتگو حضورؐ سے کہا "جو کچھ اللہ نے چاہا اور آپؐ نے چاہا"

حضورؐ نے یہ سنتے ہی انہیں تنبیہہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

اَجَعَلْتَنِیْ لِلّٰهِ نِدًّا؟ مَا شَاءَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ [1]

کیا تم نے مجھے اللہ تعالیٰ کا ہمسر بنا دیا؟ یوں کہا کرو کہ جو کچھ تنہا اللہ نے چاہا۔

۲۔ نیکی اور اجر و ثواب کا وسیع تصوّر

قرآنِ کریم نے دین کا جو وسیع تصور پیش کیا ہے وہ کسی باخبر شخص سے مخفی نہیں۔ وہ کبھی[1] "وَلَهٗ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ"۔ (آل عمران۔ ۸۳) کہہ کر کائنات کے اندر وقوع میں آنے والے کسی بھی طبعی عمل اور حرکت کو 'اسلام'، اور خدا کی طاعت قرار دیتا ہے۔ کبھی[2] "یُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ" (جمعہ۔ ۱) فرما کر واضح کرتا ہے کہ چاند تاروں کی نورپاشیاں، سورج کی حرارت رسانیاں، شب و روز کی آمد و رفت، سیاروں کی گردش، زمین کی روئیدگی، آگ کی تپش، پانی کی روانی، غرض موجوداتِ عالم کے ہر جزو کا عمل اللہ کی 'تسبیح' ہے، اور کبھی[3] "مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (ذاریات۔ ۵۶) کہہ کر آدمی کی صرف ایمانی صفات اور معروف عبادات ہی کو نہیں، بلکہ اس کے اُن سبھی اعمال کو'

---

[1] نسائی۔

جنہیں اُس نے اللہ کی ہدایات کے مطابق اور اسی کی رضا کو مدّ نظر رکھ کر انجام دیا ہو، 'عبادت' کے کام ٹھیراتا ہے۔ 'اسلام'، 'تسبیح'، اور 'عبادت' کے اِن وسیع ترین مفہوموں کو پوری طرح ذہن کی گرفت میں لینے کے لیے حضرات صحابہؓ کو بھی بعض اوقات استعجاب کے مرحلوں سے گذرنا پڑا تھا۔ مثال کے طور پر ایک بار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے 'صدقہ' اور نیکی کے کاموں کو بیان کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ:۔

...وَفِي بُضْعِ أَحَدِكُمْ صَدَقَةٌ[1] ... تمہارا اپنی بیویوں سے لطف اندوز ہونا بھی 'صدقہ' ہے۔

صحابہ کرام نے متعجب ہو کر پوچھا:۔

يَا رَسُولَ اللهِ! أَيَأْتِي أَحَدُنَا شَهْوَتَهُ لَهُ فِيهَا أَجْرٌ[2]

اے اللہ کے رسولؐ! آدمی تو اس طرح محض اپنی خواہشِ نفس پوری کرتا ہے، کیا یہ بھی اجر اور نیکی کا کام ہے؟

ارشاد ہوا:۔

أَرَأَيْتُمْ لَوْ وَضَعَهَا فِي حَرَامٍ أَكَانَ عَلَيْهِ فِيهَا وِزْرٌ؟ فَكَذَلِكَ إِذَا وَضَعَهَا فِي الْحَلَالِ كَانَ لَهُ أَجْرٌ[3]

کیا تم نے اس حقیقت پر بھی نظر ڈالی کہ اگر کوئی شخص غلط جگہ پر اپنی یہ خواہش پوری کرتا ہے تو وہ گناہ گار ہوگا یا نہیں؟ پس اسی طرح جب وہ صحیح جگہ یہ خواہش پوری کرتا ہے تو اجر کا سزاوار ٹھیرتا ہے۔

ارشاد نبوی کا مدعا یہ ہے کہ اسلام کے نزدیک آدمی کے اعمال میں 'دنیوی' اور 'مذہبی' کی تفریق نہیں ہے۔ اس کا ہر وہ عمل دینی عمل اور اجر و ثواب کا موجب ہے جسے حدودِ شرع کا لحاظ رکھتے ہوئے اور اللہ کا حکم یا اس کی اجازت سمجھ کر انجام دیا گیا ہو۔ اسی طرح اس کا ہر وہ عمل، حتٰی کہ نماز اور زکوٰۃ بھی، دنیوی عمل ہے جسے حدودِ شرع سے بے پروا ہو کر اور اللہ کی رضا کو نظر انداز کر کے کیا گیا ہو۔ اس لیے جس طرح نماز اور زکوٰۃ اور روزہ اور حج کارِ ثواب ہیں، اسی طرح ایک دنیوی نوعیت کا کام، یہاں تک کہ زن و شو کی باہم لطف اندوزی بھی، اجر و ثواب ہی کا کام ہے اگر اس کے پیچھے شرعی حدود کی رعایت کی نیت اور جذبہ موجود ہو۔

---

[1]، [2]، [3] مسلم۔ جلد اول۔ باب بیان اسم الصدقۃ یقع علی کل نوع من المعروف۔ کتاب الزکوٰۃ۔

حقیقت یہ ہے کہ آدمی کے سارے کام اُسی ایک سلسلے کی مختلف کڑیاں ہوتے ہیں جس کا ایک سرا دنیا کے عام معاملات سے جڑا ہوتا ہے اور دوسرا سرا روحانیات سے مربوط ہوتا ہے۔ ان میں دینی اور غیر دینی کی تفریق کرنا اسلام کے ہمہ گیر اور باہم مربوط نظام بندگی کے فہم سے عاجز رہ جانے کی دلیل ہے۔

دین اور دین داری کا یہی انقلابی اور بے عدیل تصور ہے جس کی بنا پر اپنے قریب ترین ضرورت مند عزیزوں پر، حتیٰ کہ اپنی بیوی تک پر کیے ہوئے انفاق کو دوسروں پر کیے ہوئے انفاق کے مقابلہ میں زیادہ اجر کا موجب قرار دیا گیا ہے۔ حضورؐ فرماتے ہیں:-

دِيْنَارٌ اَنْفَقْتَهٗ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَدِيْنَارٌ اَنْفَقْتَهٗ فِيْ رَقَبَةٍ وَدِيْنَارٌ تَصَدَّقْتَ بِهٖ عَلٰى مِسْكِيْنٍ وَّدِيْنَارٌ اَنْفَقْتَهٗ عَلٰى اَهْلِكَ اَعْظَمُهَا اَجْرًا الَّذِيْ اَنْفَقْتَهٗ عَلٰى اَهْلِكَ [1]

ایک دینار وہ ہوتا ہے جسے تم نے اللہ کی راہ میں دیا ہو، ایک وہ ہوتا ہے جس کو تم نے کسی غلام کو آزادی دلانے میں خرچ کیا ہو، ایک دینار وہ ہوتا ہے جسے تم نے کسی غریب پر صدقہ کیا ہو، اور ایک دینار وہ ہوتا ہے جسے تم نے اپنے اہل وعیال پر خرچ کیا ہو۔ ان سب میں اجر کے لحاظ سے سب پر فوقیت اس دینار کو حاصل ہے جس کو تم نے اپنے اہل وعیال پر خرچ کیا ہو۔

اسی طرح کی اور بھی بہت سی حدیثیں ہیں جو اس بات کی صراحت کرتی ہیں کہ اپنے اقارب کی مدد کا ثواب دوسروں کی مدد کے ثواب سے زیادہ بڑا ہوتا ہے۔ دین داری، نیکی، اور اجر و ثواب کے اس تصور کی نظیر شاید ہی کہیں اور پائی جاتی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ابتداءً حضراتِ صحابۂ کرام اس بات کے محتاج رہے کہ اس غیر معمولی تصور کو ان کے ذہنوں میں اچھی طرح راسخ کر دیا جائے۔

۳۔ رحم و شفقت ایک بڑی محمود صفت ہے

اسلام کی ایک خاص اور امتیازی شان، جو اس کے بے شمار احکام سے علانیہ ظاہر

[1] مسلم، جلد اول، باب فضل الصدقۃ علی العیال والمملوک۔

ہوتی ہے، یہ بھی ہے کہ وہ انسان کے لطیف جذبات کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ جاہلیت نے ان جذبات میں سے بہتوں کو ناپسندیدہ قرار دے رکھا تھا خصوصاً رحم اور شفقت کی صفت تو اس کی نگاہ میں آدمی کی کمزوری کی علامت تھی، اور ثقاہت، وقار اور بڑے پن کے خلاف سمجھی جاتی تھی۔ اگر کوئی نمایاں شخصیت کا مالک انسان اس جذبے کا مظاہرہ کرتا تھا تو لوگوں کو اس پر حیرت ہوتی۔ ذہن کی اس بے اعتدالی کا ظہور، پرانے اثرات کے تحت، بسا اوقات اہلِ ایمان سے بھی ہو جایا کرتا تھا۔ حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ :-

قَبَّلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الْحَسَنَ بْنَ عَلِیٍّ وَعِنْدَہٗ الْاَقْرَعُ بْنُ حَابِسٍ التَّمِیْمِیُّ جَالِسٌ فَقَالَ الْاَقْرَعُ بْنُ حَابِسٍ اِنَّ لِیْ عَشَرَۃً مِنَ الْوَلَدِ مَا قَبَّلْتُ مِنْھُمْ اَحَدًا فَنَظَرَ اِلَیْہِ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ثُمَّ قَالَ مَنْ لَا یَرْحَمُ لَا یُرْحَمُ [1]	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک بار) حضرت حسنؓ بن علیؓ کو بوسہ دیا، آپؐ کے پاس اقرع بن حابس تمیمی بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے (یہ دیکھ کر) کہا کہ میرے دس بچے ہیں، لیکن میں نے ان میں سے کسی کو کبھی بوسہ نہیں دیا۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف دیکھ کر فرمایا "جو کوئی رحم نہیں کرتا اس پر (بھی) رحم نہ کیا جائے گا۔

اسی طرح ایک اعرابی نے آپؐ کے سامنے جب یہ کہا کہ آپ حضرات اپنے بچوں کو پیار سے چوما کرتے ہیں، لیکن ہم لوگ ایسا نہیں کرتے، تو حضورؐ نے ناگواری کے لہجے میں فرمایا:-

اَوَ اَمْلِکُ لَکَ اِذَا نَزَعَ اللّٰہُ مِنْ قَلْبِکَ الرَّحْمَۃَ [2]	اگر اللہ ہی تمہارے قلب سے ترحم (کا جذبہ) نکال دے تو پھر میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟

قلب کی مضبوطی، ثقاہت، وقار اور بڑے پن کا یہ غیر فطری اور غیر انسانی تخیل کچھ ان اعرابیوں ہی تک محدود نہ تھا جو دینی فہم اور تربیت کے لحاظ سے خام تھے، بلکہ کبھی کبھی بڑے پایے کے اصحابؓ بھی اندازِ فکر کی اس غلطی کا مظاہرہ کر بیٹھتے تھے۔ حضرت انسؓ بن مالک فرماتے ہیں کہ "حضورؐ کے صاحبزادے، حضرت ابراہیم پر نزع کی کیفیت طاری ہوئی تو آپؐ کی

---

[1] بخاری، جلد دوم۔ باب رحمۃ الولد و تقبیلہ و معانقتہ۔ [2] ایضاً

آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ یہ دیکھ کر حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے کہا:۔

وَاَنْتَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ؟ اے اللہ کے رسول! کیا آپؐ بھی (اس طرح رو رہے ہیں)؟

حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے اس استعجابی سوال کے پیچھے واضح طور پر اُسی ذہن کی کارفرمائی تھی جسے اس بارے میں دینِ فطرت سے ہٹے ہوئے لوگوں نے اختیار کر رکھا تھا۔ اور جب حضورؐ نے انہیں بتایا کہ:۔

یَا ابْنَ عَوْفٍ اِنَّھَا رَحْمَۃٌ ثُمَّ اَتْبَعَھَا بِاُخْرٰی [1] اے ابن عوف! یہ ترحّم (کا جذبہ) ہے (جس کا ظہور تم دیکھ رہے ہو) پھر اسی بات کو آپؐ نے مکرر فرمایا۔

تب جا کر ان کے اندازِ فکر کی اصلاح ہو سکی۔

۴۔ اسلامی زندگی اجتماعیت کی طالب ہے

اسلام کے تصورِ دین کا ایک ممتاز پہلو اس کی اجتماعیت طلبی بھی ہے۔ دنیا کے دوسرے مذاہب نے دینداری اور للّٰہیت کا کمال بالعموم یہ قرار دیا ہے کہ انسان اجتماعی زندگی اور اس کے بکھیڑوں سے الگ رہ کر تنہائی میں جا بیٹھے، اور وہاں پوری یکسوئی کے ساتھ یادِ الٰہی میں محو ہو رہے دوسرے لفظوں میں یہ کہ ان کا نظریۂ خدا پرستی بس گیان دھیان اور اصلاحِ ذات تک محدود ہے، اور ان کا تصورِ دین، مذہب و سیاست کی علیحدگی سے بھی آگے بڑھ کر مذہب اور تمدن کی تفریق تک پہنچا ہوا ہے۔ جس وقت اسلام کا ظہور ہوا تھا اس وقت کمال دینداری کا یہ نظریہ مذہبی حلقوں میں شدت سے پھیلا ہوا تھا، اور مدتوں سے ذہنوں میں جما چلا آ رہا تھا۔ اسلام نے اگرچہ اپنے پورے عملی رویّے سے اور اپنی واضح ہدایات کے ذریعہ اس نظریے کی تردید اور تغلیط کر دی تھی اس کے باوجود جس خیال کے جراثیم پوری فضا میں پھیلے ہوئے تھے اس کے اثر سے اسلام لاچکنے والوں کے ذہنوں کا ابتداء ہی میں کلیتہً پاک ہو رہنا نفسیاتی طور پر بہت مشکل تھا۔ اس لیے شروع شروع میں ان کی طرف سے بھی کبھی کبھی اس اندازِ فکر کا

---

[1] بخاری، جلد اول، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم انا بک لمحزون۔

مظاہرہ ہوتے دیکھا گیا حضرت ابوہریرہؓ بیان فرماتے ہیں کہ ایک صحابیؓ کا ایک ایسی شاداب وادی سے گزر ہوا جہاں میٹھے پانی کا چشمہ تھا۔ اس نے ان کا دل موہ لیا۔ انہوں نے کہا کہ کیا اچھا ہو اگر آبادی چھوڑ کر یہیں آبسوں، مگر ایسا اُسی وقت کروں گا جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی اجازت مل جائے۔ جب اجازت طلبی کے لیے وہ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے اجازت نہیں دی، اور اجتماعی زندگی کی اہمیت، ضرورت اور دینی افادیت سمجھاتے ہوئے فرمایا:۔

لَا تَفْعَلْ فَاِنَّ مَقَامَ اَحَدِکُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَفْضَلُ مِنْ صَلٰوتِہٖ فِیْ بَیْتِہٖ سَبْعِیْنَ عَامًا[1]... الخ	ایسا نہ کرنا۔ کیونکہ تم میں سے کسی کا اللہ کی راہ میں (محاذِ جنگ پر) صرف ٹھیرا رہنا گھر کے اندر کی ستر سال کی نمازوں سے بھی افضل ہے.... الخ

حضورؐ کے اس ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ آبادی اور معاشرے سے الگ تھلگ رہ کر، اور تنہائی کے ماحول میں تم اللہ کے ذکر و فکر اور نمازوں میں تو زیادہ سے زیادہ مشغول ضرور رہ سکوگے، مگر دینِ خدا کی اشاعت، مدافعت اور اقامت کے اُس اعلیٰ فریضے کو انجام دے سکنے کے مواقع تمہیں حاصل نہ رہ جائیں گے جس کے لیے امتِ مسلمہ وجود میں لائی گئی ہے، وہ امتِ مسلمہ جس کا ایک جزو تم بھی ہو۔ اور یہ ایک ایسی زبردست محرومی ہوگی جس کی تلافی کوئی عبادت اور نیکی نہ کر سکے گی۔

اس ارشادِ نبوی میں بظاہر صرف ایک بڑے اجر و ثواب کے مواقع سے محرومی کا ذکر ہے، مگر فی الواقع یہ بے شمار ابوابِ خیر سے محرومی کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ تنہائی کی الگ تھلگ زندگی صرف ایک جہاد ہی کے فریضے کی ادائی سے محرومی کا باعث نہیں بنتی، بلکہ شریعت کے بہت سے دوسرے واجبات کی ادائی کے مواقع سے بھی محروم کر کے رکھ دیتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جب کسی شخص کو وہ مواقع میسر ہی نہیں آسکتے جن میں وہ احکامِ دین کی تعمیل کر سکتا ہو تو نہ ان کی تعمیل کی ذمہ داریوں سے وہ سبک دوش ہو سکتا ہے، نہ ان کا اجر پا سکتا ہے اور نہ ان کی عدمِ تعمیل کی پاداش سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

---

[1] ترمذی۔ جلد اول۔ ابواب فضائل الجہاد۔

۵۔ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے

اسلام کی آمد کے وقت اگرچہ رہبانیت کا میلان عام عربوں کے اندر، ان کے مخصوص مزاج کے باعث اپنی کوئی جگہ نہیں رکھتا تھا، مگر گردوپیش کی قومیں اس کی حد درجہ معتقد، اور اس کی ظاہری شانِ تقدس سے بے حد مرعوب تھیں۔ عرب جب بت پرستی اور فسق و فجور سے تائب ہو کر ایک خدا کی بندگی، آخرت کی طلب اور تقویٰ و بےنفسی کی طرف پورے جوش اور اخلاص کے ساتھ پلٹے تو رہبانیت کے اس مقبولِ عام نظریے نے ان پر بھی اپنا سایہ ڈالنے کی کوشش کی، اور اِس حقیقت کے باوجود کہ قرآن کریم کا انقلابی تصورِ عبادت اور شریعتِ اسلامی کا آفاق گیر نظامِ اطاعت اپنی ایک ایک ادا سے اس نظریۂ رہبانیت کی نامحمودیت کا اعلان کر رہا تھا، کچھ اصحابؓ اس کی طرف قدرے جھکتے دکھائی دے گئے۔ حضرت عبداللہؓ بن عمرو بن العاص خود اپنا حال بیان کرتے ہیں کہ میں مسلسل روزے رکھتا اور رات رات بھر قرآن پڑھا کرتا تھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو آپؐ نے مجھ سے ناپسندیدگی کے انداز میں دریافت فرمایا "کیا ایسا نہیں ہے کہ تم بلا ناغہ لگاتار روزے رکھا کرتے اور پوری پوری رات قرآن پڑھا کرتے ہو"؟ میں نے عرض کیا کہ "ہاں، اے اللہ کے رسولؐ! بات ایسی ہی ہے، مگر ایسا میں صرف خیر (ثواب) کی خاطر کر رہا ہوں"، حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ "مہینہ بھر میں تین روزے رکھنا تمہارے لیے کافی ہے۔" میں نے گذارش کی کہ "اے اللہ کے نبیؐ! میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں۔" آپؐ نے فہمائش کے انداز میں کہا کہ "امرِ واقعی یہ ہے کہ تمہاری بیوی کے بھی تم پر کچھ حقوق ہیں، تمہارے ملاقاتیوں کے بھی تم پر کچھ حقوق ہیں، اور تمہارے جسم کے بھی تم پر کچھ حقوق ہیں"[1]... الخ ایک اور روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ "اگر تم ایسا عمل برابر کرتے رہے تو آخرکار تمہاری آنکھیں اندر کو دھنس پڑیں گی اور تم پر ضعف طاری ہو رہے گا۔"[2]

حضرت ابوالدرداءؓ اس معاملے میں اور آگے بڑھ چلے تھے۔ حضرت سلمانؓ فارسی

---

[1] مسلم، جلد اول، باب النہی عن صوم الدہر۔ [2] ایضاً۔

ان کے گھر گئے تو ان کی اہلیہ محترمہ نے ان سے اپنے شوہر کا یہ حال بیان کیا کہ "آپ کے بھائی، ابو الدرداءؓ کو دنیا سے کوئی واسطہ نہیں رہ گیا ہے"۔ اتنے میں حضرت ابو الدرداءؓ آموجود ہوئے، اور حضرت سلمانؓ کے لیے کھانا تیار کرا کے ان سے کہا: "آپ کھانا کھا لیں، میں تو روزے سے ہوں"۔ حضرت سلمانؓ نے اصرار کر کے ان کا روزہ تڑوادیا اور انہیں کھانے میں شریک ہو جانے کے لیے مجبور کر دیا۔ رات ہوئی تو حضرت ابو الدرداءؓ عشا کی نماز پڑھ چکنے کے بعد اپنے معمول کے مطابق نفل نمازیں پڑھنے چلے۔ حضرت سلمانؓ نے روک دیا اور کہا "سو جاؤ"، چنانچہ وہ سو گئے۔ مگر کچھ ہی دیر سونے کے بعد اٹھ بیٹھے اور نفلیں پڑھنے چلے۔ حضرت سلمانؓ نے پھر منع کیا اور کہا "نہیں، ابھی اور سوؤ"۔ جب رات کا پچھلا پہر آگیا تو حضرت سلمانؓ نے فرمایا کہ "ہاں، اب اٹھو"۔ اور پھر دونوں بزرگوں نے نمازیں پڑھیں۔ فارغ ہونے کے بعد حضرت سلمانؓ نے حضرت ابو الدرداءؓ کے سامنے اسلامی زندگی کے صحیح، متوازن اور مطلوبہ نقشہ کی وضاحت کرتے ہوئے انہیں بتایا، یا یاد دلایا کہ:-

اِنَّ لِرَبِّكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَّلِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَّلِاَهْلِكَ عَلَيْكَ حَقًّا فَاَعْطِ كُلَّ ذِيْ حَقٍّ حَقَّهٗ۔[1]	بلا شبہ تمہارے پروردگار کے بھی تم پر حقوق ہیں، اور تمہارے اپنے نفس کے بھی کچھ حقوق ہیں، اور تمہارے اہل وعیال کے بھی تم پر کچھ حقوق ہیں۔ پس ہر حقدار کے حقوق ادا کرو۔

بعد میں حضرت ابو الدرداءؓ نے خدمتِ نبوی میں حاضر ہو کر اس پورے معاملہ کی تفصیل سنائی تو آپ ﷺ نے فرمایا "صَدَقَ سَلْمَانُ"[2] (سلمانؓ نے ٹھیک کہا)۔ اس طرح کے بہت سے واقعات پیش آئے۔ کسی صحابی نے عہد کر لیا کہ وہ نکاح نہ کریں گے، کسی نے طے کر لیا کہ رات بھر نہ سوئیں گے اور مسلسل نماز اور قرآن پڑھتے رہیں گے، کسی نے ارادہ کر لیا کہ بلا ناغہ روزے رکھا کریں گے، کسی نے منت مان لی کہ سایہ میں نہ بیٹھیں گے اور اسی حال میں حج کے لیے جائیں آئیں گے، کسی نے مسجد نبوی کے اندر دو ستونوں میں رسی باندھ لی تاکہ مسلسل نمازیں پڑھتے پڑھتے تھک جائیں تو اس رسی کو پکڑ کر اس کے

---

[1] [2] بخاری، جلد اول۔

سہارے کھڑے رہ سکیں۔ حضورؐ کو جب بھی ایسی کسی بات کی اطلاع ملی آپؐ نے اس کا سخت نوٹس لیا اور اس پر ناپسندیدگی ظاہر کرتے ہوئے اس سے روک دیا۔ کیونکہ آپؐ کی دوربیں نگاہ سے یہ خطرہ چھپا ہوا نہیں تھا، نہ رہ سکتا تھا، کہ عبادت اور ریاضت کا یہ غلو بڑھ کر رہبانیت کی شکل اختیار کرلے سکتا ہے، جب کہ رہبانیت کو خدا نے بندوں کی اپنی اختراع اور بدعت قرار دیا ہے۔ اس امر کا ثبوت، کہ عبادات کے معاملے میں اگر اعتدال کی راہ ایک بار تھوڑی سی بھی ترک ہو جاتی ہے تو پھر شگاف برابر بڑھتا ہی چلا جاتا ہے، ایک صحابی حضرت عثمانؓ بن مظعونؓ کے واقعہ سے مل بھی جاتا ہے۔ انہوں نے حضورؐ سے نکاح نہ کرنے کی اجازت طلب کی، تو آپؐ نے صاف انکار کر دیا۔ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص فرماتے ہیں کہ "اگر عثمانؓ کو یہ اجازت مل جاتی تو ہم لوگ اپنے کو خصی کرا لیتے" (لَوْ اَذِنَ لَہٗ لَاخْتَصَیْنَا[1])۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے واقعات اس حقیقت کی صاف نشاندہی کرتے ہیں کہ کتنے ہی اہلِ اسلام شروع میں ذکر و عبادت اور ریاضت کے معتدل اسلامی تصوّر سے پوری طرح واقف اور مانوس نہ تھے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیہم توجہ اور تربیت کے بعد ہی ان کے اندر فکر و نظر کا اعتدال پیدا ہو سکا تھا۔

۶۔ خلافت کے استحقاق کی بنیاد صلاحیت اور صالحیت پر ہے

حکومت اور حکمرانی تو بہت پرانی چیز تھی، اور اس سے سبھی لوگ نامعلوم مدت سے بخوبی واقف چلے آرہے تھے، لیکن حکومت کا وہ تصور، جسے 'خلافت'، یا 'اسلامی حکومت'، کہتے ہیں، ایک نئی چیز تھی، جس سے لوگوں کی کوئی شناسائی نہ تھی۔ اس لیے اسلام نے جب اسے پیش کیا اور اس کی صورت گری کرنی چاہی تو قدرتی طور پر حکومت کے اس اچھوتے اور بےگانہ تصور کا سمجھ پانا بہتوں کے لیے آسان نہ ثابت ہوا۔ دنیا اب تک حکومتی اقتدار کو قومی یا شخصی انا کی تسکین کا ذریعہ اور اغراضِ نفس کی چراگاہ سمجھتی اور دیکھتی چلی آئی تھی، جب کہ اسلام نے آکر اسے ایک مقدس دینی فریضہ اور ایک جاں کاہ ذمہ داری بنا دیا۔ اسی طرح حکومت کے

---

[1] ترمذی، جلد اول۔ ابواب النکاح۔

بارے میں ایک معروفِ عام نظریہ یہ بھی تھا کہ جس طالع آزما شخص یا گروہ نے اپنی قوتِ بازو سے کوئی سلطنت قائم کی ہو، اسی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ بلا شرکتِ غیرے اس کی حکمرانی کے مزے لوٹے، اور پھر اس کے بعد اس کی اولاد تاج و تخت کی مالک بنے۔ لوگ اس طرح کی کوئی بات سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ حکومت اصلاً کوئی حق نہیں بلکہ ایک ایسی ذمہ داری ہے جس کی ادائی نفس کی خواہشوں کے لیے اجل کا پیام ہوتی ہے، اور اگر کسی پہلو سے وہ حق کا درجہ رکھتی بھی ہے تو یہ ایک ایسا حق ہوتا ہے جس کے تسلیم کیے جانے میں نہ کسی کی جنگی خدمات کو بنیاد بنایا جا سکتا ہے، نہ کسی خاص قوم یا نسل یا طبقے یا وطن کے لیبل کو شرطِ لازم ٹھیرایا جا سکتا ہے، نہ وراثت کو کوئی اہمیت دی جا سکتی ہے، بلکہ اس کا سارا دارومدار صرف صالحیت اور صلاحیت پر ہوتا ہے۔ انسانی حاکمیت اور دنیوی اغراض پر مبنی نظامِ حکمرانی کے نظریات کے بالمقابل اسلام نے اپنا جو انقلابی نظامِ سیاست پیش کیا وہ خدا کی حاکمیت اور قانونِ شریعت کے مکمل نفاذ پر مبنی تھا۔ اس نے حکمرانی کو اصلاً حق نہیں، بلکہ ایک بھاری فریضہ قرار دیا، اور اچھی طرح واضح کر دیا کہ یہ کوئی پھولوں کی سیج نہیں، کہ اس کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا جائے، بلکہ کانٹوں کا بستر ہے جس پر راتوں کی نیند حرام ہو جانی چاہیے۔ جو اس کے 'تخت' پر بٹھایا جائیگا وہ گویا الٹی چھری سے ذبح کر دیا گیا یہ عظمت و کبریائی کا تاج نہیں، ذمہ داریوں کا پہاڑ ہے، جس کے بوجھ سے دماغ کی ہڈیاں چٹخنتی رہیں گی۔ اسلامی حکمراں (خلیفہ) ملت کا آقا اور مخدوم نہیں، اس کا خادم ہوتا ہے۔ اپنے فرائضِ منصبی کی انجام دہی میں اگر وہ کوتاہ ثابت ہوا تو کل خدا کی عدالت میں اسے جوابدہی کرنی ہوگی، اور یہ جوابدہی غیر معمولی حد تک سخت اور پُرخطر ہوگی — ایسے سرتاسر نئے اور بے نظیر تصورِ حکومت اور نظریۂ حکمرانی کو دل و دماغ میں اچھی طرح جذب کر لینا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس تصور کی ندرت، یکتائی اور بلندی ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب پہلی بار اس کا معاملہ امت کے سامنے آیا تو انصارِ مدینہ جیسی صادق الایمان اور مخلص جماعت کو بھی اس کے فہم و ادراک میں فوری طور پر ایک ٹھوکر تو لگ ہی گئی۔ ثقیفۂ بنی ساعدہ میں خلافت کا مسئلہ پیش ہوا تو مہاجرین اور انصار کے درمیان ایک طرح کی کشمکش سی پیدا ہو گئی۔

ایک گروہ کچھ اس انداز سے مسئلے پر نظریں ڈال رہا تھا کہ یہ 'سلطنت' رسول خدا نے اپنی جاں فشانیوں سے قائم کی ہے، اس لیے آپؐ کے بعد آپؐ کی جانشینی کا حق بھی آپؐ کے قبیلے، قریش کے مہاجروں کے سوا کسی اور کو نہیں پہنچتا۔ دوسرا گروہ (گروہِ انصار) بدر اور احد اور حنین وغیرہ میدانوں کو زیادہ تر اپنے ہی خون سے رنگا ہوا دیکھ کر اپنے مقابلے میں کسی اور کے حق حکمرانی کو زیادہ وزنی نہیں سمجھ رہا تھا۔ دونوں گروہ اپنے اپنے نظریوں کے تحت سرگرم بحث تھے۔ جب محسوس ہوا کہ کوئی ایک دوسرے کو قائل نہیں کر پا رہا ہے تو رفعِ نزاع کی خاطر انصار نے یہ تجویز پیش کی کہ "ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک آپ لوگوں میں سے ہو۔" (مِنَّا اَمِیْرٌ وَّمِنْکُمْ اَمِیْرٌ[1]) یہ تجویز نہ صرف غیر اسلامی بلکہ صراحتہً غیر عملی بھی تھی۔ اس لیے مسئلہ بدستور الجھا رہا۔ لیکن اسلامی تصورِ حکومت (یعنی خلافت) کے مزاج، مقاصد اور اصول کو ذہنوں کی گرفت میں نہ لے سکنے کے اس عام مظاہرے کے باوجود متقدسین کا یہ مجمع راست فکری سے کلیتہً خالی بھی نہ تھا، بلکہ ان نجومِ ہدایت کے اندر آسمانِ نبوت کے مہر و ماہ بھی موجود تھے۔ ان کی نگہِ بصیرت نے بروقت رہنمائی کی، اور سوچنے کے انداز کی غلطیوں کی گھٹا چھٹ گئی، استحقاقِ خلافت کا صحیح اسلامی تصور حَکَم بن کر سامنے آ گیا، اور اہلِ حق کی اس جماعت نے بالاتفاق اس کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ ہوا یہ کہ بحث مباحثے کے دوران حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر مجمع کو یاد دلایا کہ "ذرا سوچ لو، ہم میں کوئی اور بھی ایسا ہے جس کو اللہ تعالیٰ کی فرمائی ہوئی تین افضلیتیں — ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ ھُمَا فِی الْغَارِ اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِہٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا — حاصل ہوں؟ یاد کرو آخر یہ 'ھُمَا' (دونوں) کون کون تھے[2]؟" یہ فرما کر حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طرف ہاتھ بڑھایا اور ان کے دستِ مبارک پر خلافت کی بیعت کر لی۔ جس کے بعد مہاجرین اور انصار دونوں ہی گروہوں نے جناب صدیق اکبرؓ سے بیعت کر کے انہیں متفقہ طور پر خلیفۃ المسلمین تسلیم کر لیا۔ اس طرح وہ شخص خلیفہ منتخب ہو گیا جو نہ اوسی تھا نہ خزرجی اور نہ ہاشمی۔ یعنی

---

[1] شمائل الترمذی۔ باب فی وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

[2] شمائل الترمذی باب فی وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

یہ انتخاب نہ وطنیت کی بنیاد پر ہوا، نہ نسل کی بنیاد پر اور نہ وراثت کی بنیاد پر، بلکہ صرف اس بنا پر ہوا کہ منتخب کیا جانے والا امت میں سب سے افضل تھا۔ اس کی افضلیت پر کوئی اور نہیں، خود اللہ اور اس کا کلام شاہد تھا۔ اَتقیٰ (سب سے بڑا متقی) تھا اور اس حقیقت پر بھی قرآن کی گواہی موجود تھی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معتمدِ خاص تھا، اور اس امر سے بھی کوئی ناواقف نہ تھا۔ اخلاص اور ایثار کا پیکر، بے مثل تھا، اور یہ بات بھی سب پر روشن تھی۔ اسلام کا سب سے زیادہ مزاج شناس تھا۔ حزم و تدبر میں یکتا تھا، اور نبیؐ کی تعلیم و تربیت سے فیض اٹھانے میں سب پر فوقیت رکھتا تھا۔ ان حقائق کی بنا پر آپؓ کا انتخاب صرف انتخاب کا ایک عمل ہی نہ تھا، بلکہ خلافت کے تصوّر اور استحقاقِ خلافت کے صحیح اسلامی اصول کا ترجمان اور شارح بھی تھا، جو ابھی کچھ دیر پہلے تک اکثر لوگوں کے لیے کسی نہ کسی پہلو سے ایک نامانوس سا اصول بنا ہوا تھا۔

۷۔ جہاد کی کل غایت صرف اللہ کے کلمہ کی بلندی ہے

اسلام نے جنگ و جہاد کی جو حقیقی غایت بتائی، اس سے نہ اب تک عرب واقف تھا نہ عجم۔ پوری دنیا یہ جانتی اور سمجھتی تھی کہ لڑائی یا تو سلطنتوں کے قیام کے لیے لڑی جاتی ہے، یا ملک گیری کے لیے ہوتی ہے، یا مالِ غنیمت حاصل کرنے کے لیے برپا کی جاتی ہے۔ لیکن اسلام آیا تو اس نے لڑائی کا مقصد بالکل ہی بدل ڈالا، اور اسے شخصی یا قومی اغراض کی گندگیوں سے پاک کر کے انسانیت کی فلاح کا ذریعہ اور ایک بلند ترین عبادت بنا دیا۔ اس نے کہا کہ ملک یا دولت حاصل کرنے کے لیے تلوار اٹھانا ظلم اور فساد ہے، بڑی معصیت ہے، اخلاق اور انسانیت کے حق میں زہر ہے۔ تلوار کو ان جیسی برائیوں کی خاطر نہیں، بلکہ بھلائیوں کی حفاظت اور ان کے فروغ کے لیے اٹھنا چاہیے، اور تلوار اٹھانے والوں کے سامنے اصل مقصد صرف اپنے اُس خدا کی رضا ہونی چاہیے جو برائیوں کو ناپسند اور بھلائیوں کو پسند کرتا ہے اور جو چاہتا ہے کہ اس کی زمین سے فتنہ و فساد مٹے، اور باطل کی جڑ بس کاٹ دی جائیں۔ یہ مقصد ہر دنیوی لاگ سے پوری طرح پاک ہونا چاہیے۔ یہ بالکل یک طرفہ سودا ہے۔

یہاں محض سر دینا ہے اور کسی خوں بہا کے خیال سے اوپر اٹھ کر دینا ہے۔ یہاں مال خرچ کرنا ہے اور بدلے میں کسی دنیوی منفعت کی توقع اور خواہش سے بلند ہو کر کرنا ہے۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ حریف سے صف آرائی کسی ذاتی یا قومی دشمنی کی وجہ سے نہ ہو، بلکہ اس کی صرف حق دشمنی کی بنا پر ہو، اور اس لیے ہو کہ اسے ظلم و فساد سے روک دیا جائے، اور صرف اُسی وقت تک رہے جب تک کہ حریف حق اور امن و صلاح کی راہ چھوڑ کر ہٹ نہ جائے۔ غرض لڑائی وہی صحیح اور برحق ہوتی ہے جو دنیا کمانے کے لیے نہیں، بلکہ صرف آخرت کمانے کے لیے ہو، جس کے اندر بظاہر انسان قتل ہوتے نظر آئیں، مگر فی الواقع انسانیت کو زندگی مل رہی ہو۔ اسلام نے لڑائی کا جہاں یہ اعلیٰ وارفع اور کاملاً ایک نیا اور اچھوتا مقصد پیش کیا، وہاں اسے معروف ناموں کو چھوڑ کر ایک نیا اور خاص نام بھی دے دیا، جو اس مقصد سے پوری طرح مناسبت رکھنے والا اور اسم بامسمّٰی تھا۔ یہ نام تھا "جہاد فی سبیل اللہ"۔

حضرات صحابہؓ کرام جس ماحول سے نکل کر آئے تھے، اس کے لیے جنگ کا یہ مقصد خواب و خیال سے بھی پرے کی چیز تھا۔ اس لیے دوسروں کا تو سوال ہی کیا، خود اِن اصحابؓ کو بھی اس سے پوری طرح واقف اور مانوس ہو جانے میں وقت لگا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مقصد اور جنگ کا یہ تصور اتنا ہی اتنا غیر معمولی کہ اسے ذہن کی گرفت لانا انتہا درجہ کا فکری مجاہدہ چاہتا تھا۔ اس مقصد کی اخلاقی پاکیزگی اور بلندی کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ سیدنا حضرت علیؓ نے ایک دشمنِ دین کے سینے پر چڑھ کر اسے قتل کر دینے کے لیے تلوار اٹھائی ہی تھی کہ اس نے آپ کے منہ پر تھوک دیا۔ آپ نے فوراً ہاتھ روک لیا اور اس کے سینے سے اتر کر الگ ہو گئے۔ اس نے حیران ہو کر پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ میں نے حق کی خاطر تجھے قتل کرنا چاہا تھا، لیکن جب تو نے میرے منہ پر تھوک دیا تو میرا نفس مشتعل ہو گیا اور ذاتی انتقام کی رَو میرے دل و دماغ میں دوڑ گئی۔ اب اس حالت میں اگر تجھے قتل کر دیتا تو اس فعل میں میرے نفس کا بھی کچھ نہ کچھ دخل ضرور شامل ہوتا، اور پھر یہ قتل میرے لیے الٹا باعثِ خسران بن جاتا۔ اس واقعہ کی روشنی میں جنگ و قتال کے اسلامی تصور کو سامنے رکھیے اور پھر انسانی نفسیات کو نگاہ میں رکھتے ہوئے عام حضرات صحابہؓ کے معاملہ پر غور کیجیے۔

یہ گروہِ مومنین بلا شبہ عام اعلیٰ صفات ہی کا نہیں، للّٰہیت اور بے نفسی کا بھی مجسمہ تھا، اور برسوں کی تعلیم و تربیت کے بعد ہی حضورؐ اسے میدانِ جہاد میں لائے تھے۔ لیکن تھا وہ بھی بہرحال انسانوں ہی کا گروہ، اس لیے یہ بات ہرگز خلافِ توقع نہ تھی کہ اس کے بعض افراد اپنے سابق ماحول کے اثرات کو از خود یکسر خیر باد نہ کہہ سکے، اور مقصدِ جہاد کی پوری معرفت حضورؐ کی وضاحت کے بعد ہی انہیں حاصل ہو سکی۔ سُننِ ابو داؤد[1] میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت مذکور ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا" اے اللہ کے رسول! اُس آدمی کے متعلق کیا حکم ہے جو اللہ کی راہ میں جہاد کرنا چاہتا ہے مگر ساتھ ہی مالِ غنیمت کی طلب بھی دل میں رکھتا ہے"، آپؐ نے فرمایا:-

لَا اَجْرَ لَہٗ — اس کو آخرت میں کوئی اجر نہ ملے گا۔

جب اس شخص نے دوسرے کچھ صحابہ کو یہ بات سنائی تو وہ تعجب میں پڑ گئے، انہیں یقین نہ آیا کہ حضورؐ نے ایسا فرمایا ہوگا۔ اس لیے انھوں نے اُن صاحب سے کہا کہ 'جاؤ، پھر پوچھو، شاید تم نے ارشادِ گرامی کا مطلب ٹھیک طور سے سمجھا نہیں ہے'۔ وہ صاحب دوبارہ یہی جواب لے کر لوٹے، تب بھی لوگوں کا تعجب کم نہ ہوا۔ آخر کار تیسری بار دریافت کرانے پر بھی جب یہی جواب سننے کو ملا تب جا کر انہیں یقین آیا کہ حقیقتِ واقعی یہی ہے، اور اب وہ سمجھ سکے کہ اسلام کا تصورِ جہاد مروجہ تمام تصوراتِ جنگ سے ہر گونہ مختلف ہے، وہ دنیوی مفاد کی کسی آلائش کو برداشت نہیں کر سکتا۔

۸۔ اعمال کا دار و مدار نیت پر ہوتا ہے

اسلام نے لوگوں کو اس امر کی بار بار یاد دہانی کرائی کہ آدمی کے اعمال کی اچھائی برائی کا مدار اس کی نیت پر ہے۔ حضورؐ کا مشہور ارشاد ہے کہ:-

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ — اعمال کا رشتہ تو نیتوں سے بندھا ہوتا ہے۔ ہر

---

[1] جلد اوّل، کتاب الجہاد۔ باب فی من یغزو ویلتمس الدنیا۔

وَ اِنَّمَا لِامْرِءٍ مَا نَوٰی[1] شخص کو وہی کچھ ملتا ہے جس کی اس نے نیت کی ہوتی ہو۔

یہ اصولی حقیقت اگرچہ اپنی جگہ بالکل واضح تھی، لیکن لوگوں کے سامنے نئی نئی آئی تھی، اس لیے ابتداءً اس کے مدعا کی ہمہ گیری تک بہتوں کی نظر نہ پہنچ پائی۔ چنانچہ ایک بار جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:۔

اِذَا تَوَاجَہَ الْمُسْلِمَانِ بِسَیْفَیْھِمَا فَکِلَاھُمَا مِنْ اَھْلِ النَّارِ[2] جب دو مسلمان تلواریں لے کر باہم لڑ پڑیں تو (قاتل اور مقتول) دونوں دوزخی ہوں گے۔

تو موقع پر موجود صحابہ اُس گہری حقیقت کو نہ پا سکے جو اِس ارشاد کے اندر بیان ہوئی تھی، انہوں نے متحیر ہو کر پوچھا:۔

ھٰذَا الْقَاتِلُ فَمَا بَالُ الْمَقْتُوْلِ[2] حضورؐ! ایک تو خیر قاتل ہوگا (اس لیے دوزخ میں جائے گا) مگر یہ مقتول کا کیا معاملہ ہے (وہ کیوں دوزخی ہوگا)

آپؐ نے وجہ بتائی کہ:۔

اِنَّہٗ قَدْ اَرَادَ قَتْلَ صَاحِبِہٖ[2] وہ (مقتول) بھی تو اپنے مدِمقابل کو قتل کر دینے کا ارادہ رکھتا تھا۔

مطلب یہ تھا کہ صرف اتنا ہی نہ دیکھو کہ یہ دوسرا شخص مقتول اور مظلوم ہے، بلکہ یہ بھی دیکھو کہ اپنے ارادے اور اپنی کوشش کے لحاظ سے اس کا کیا حال تھا؟ کیا اپنے قاتل ہی کی طرح خود اس کے اندر بھی قاتل بن جانے کا جذبہ موجود نہیں تھا؟ اگر تھا، اور یقیناً تھا، تو تمہیں بھولنا نہ چاہیے کہ خدا کی نگاہ ظاہر ہی پر نہیں، باطن پر بھی رہتی ہے، اور وہ اصل اعتبار کسی عمل کے ظاہر کا نہیں، اس کے پیچھے پائی جانے والی نیت کا کرتا ہے۔ حضورؐ کی اِس توجیہہ اور تفہیم کے بعد لوگوں کی سمجھ میں بات آگئی کہ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ کے واقعی معنی کیا ہیں؟

---

[1] بخاری، جلد اول۔ باب کیف کان بدءُ الوحی۔ [2] بخاری، جلد دوم۔ کتاب الفتن۔

۹۔ معاشرتی اور قانونی مساوات

اسلام نے مساوات کی جو تعلیم دی اور اسے جس طرح اپنے معاشرتی اور قانونی نظام کی بنیاد قرار دیا، اس کا نظری پہلو تو اتنا واضح تھا کہ اصحاب کرام رضؓ کو اس سے پوری طرح مانوس ہو رہنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی، اور عملاً بھی انہوں نے اپنے معاشرے کو اس کے سانچے میں ڈھال لیا۔ چنانچہ دنیا نے جہاں حسب و نسب کے، غربت اور امارت کے، قومیت اور وطنیت کے اور سماجی اونچ نیچ کے بہت سارے امتیازات قائم کر رکھے تھے، وہاں انہوں نے پردیسیوں کو امامت دی، آزاد کردہ غلاموں کو سپہ سالاری بخشی، انہیں فخر سے اپنا 'سید' (سردار اور آقا) کہا، انہیں سواری پر بٹھایا اور خود اس کی نکیل پکڑ کر پیدل چلے۔ غرض نسب، نسل اور دولت کے سارے بتوں کو توڑ کر محمود و ایاز سب ایک صف میں کھڑے ہوگئے اور ایک ایسا ہموار معاشرہ وجود میں آگیا جس میں کوئی دنیوی نشیب و فراز باقی نہیں رہ گیا تھا۔ تاہم اس مقام بلند تک پہنچ جانے میں انہیں کبھی کبھی ٹھوکریں بھی لگیں۔ اور یہ ٹھوکریں نتیجہ تھیں بلندی اور پستی کے تصور کے اُن بچے کھچے جراثیم کا، جو ان میں کے کچھ افراد کے ذہن کی تہوں میں دبے چھپے باقی رہ گئے تھے۔ موقع پا کر ان جراثیم نے یکایک جو زور دکھایا تو اسلام کے تصورِ مساوات پر وقتی طور سے غبار سا پڑ گیا۔ درج ذیل چند واقعات اس امر کی واضح مثالیں ہیں:-

(۱) حضرت ابوذرؓ کی ایک بار حضرت بلالؓ سے میں میں تو تو ہوگئی۔ حضرت ابوذرؓ نے جوش میں آکر انہیں حبشن زادہ کہہ دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک بات پہنچی تو آپؐ نے انہیں تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:-

إِنَّكَ امْرَءٌ فِيكَ جَاهِلِيَّةٌ[1] ابوذر! ابھی تک تمہارے اندر جاہلیت (کا کچھ فاسد مادہ) موجود ہے۔

(۲) ایک قریشی خاتون، فاطمہ مخزومیہ، نے چوری کی۔ عدالتِ نبوی نے حکم دیا کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ یکایک خاندانی عظمت کا سویا ہوا تصور کچھ لوگوں کے اندر جاگ اٹھا اور انہوں نے حضرت اسامہؓ بن زیدؓ سے سفارش کرائی کہ ایک صاحبِ حسب عورت کی

---

[1] بخاری، جلد اول۔ باب المعاصی من امر الجاہلیۃ۔

اتنی بڑی تذلیل نہ کی جائے ؛ آپؐ نے حضرت اسامہؓ کی، غصہ کے ساتھ، سرزنش کرتے ہوئے فرمایا کہ "اَتَشْفَعُ فِیْ حَدٍّ مِّنْ حُدُوْدِ اللّٰہِ" ؟ (کیا تم خدا کی مقرر کی ہوئی ایک حد کے بارے میں سفارش کر رہے ہو ؟) اور پھر اسی پر آپؐ نے بس نہیں کر لیا ، بلکہ کھڑے ہو کر تقریر فرمائی اور کہا:-

یَآاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّمَا ضَلَّ مَنْ قَبْلَکُمْ اِنَّھُمْ کَانُوْا اِذَا سَرَقَ الشَّرِیْفُ تَرَکُوْہُ وَاِذَا سَرَقَ الضَّعِیْفُ فِیْھِمْ اَقَامُوْا عَلَیْہِ الْحُدُوْدَ وَاَیْمُ اللّٰہِ لَوْ اَنَّ فَاطِمَۃَؓ بِنْتَ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سَرَقَتْ لَقَطَعَ مُحَمَّدٌ یَدَھَا۔[1]	لوگو! تم سے پہلے کے لوگ اسی لیے گمراہ ہو رہے کہ جب کوئی باعزت شخص چوری کرتا تو وہ اسے چھوڑ دیتے ، مگر جب یہی حرکت کسی کمزور سے سرزد ہو جاتی تو اس پر حد جاری کر دیتے خدا کی قسم اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹی فاطمہؓ نے چوری کی ہوتی تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔

(۳) حضرت قدامہؓ بن مظعون ایک جلیل القدر صحابی اور حضرت عمرؓ کے نسبتی بھائی تھے۔ انہوں نے ایک بار شراب پی لی۔ حضرت فاروقؓ اعظم نے ان کی جلالتِ قدر اور قرابت کا کوئی لحاظ کیے بغیر ان پر سزا نافذ کرنا چاہی تو کچھ لوگوں میں پھر وہی خاندانی عظمت کا غیر اسلامی تصور ابھر آیا، اور انہوں نے حضرت عمرؓ کے اس ارادے کی مخالفت شروع کر دی۔ مگر وہ تو حق کے معاملے میں تیغِ بے نیام اور "اَشَدُّھُمْ فِیْ اَمْرِ اللّٰہِ" تھے! اس غلط اندازِ فکر پر سختی سے نکیر کرتے ہوئے فرمایا "مجھے ان کا کوڑوں کے نیچے مر جانا منظور رہے، مگر یہ منظور نہیں کہ خدا کے حضور اس کی قائم کی ہوئی کسی حد کے توڑ بیٹھنے کا بارِ گناہ لے کر جاؤں ، جلد ایک مضبوط کوڑا لے آؤ"۔

(۴) ایک دن چند سردارانِ قریش، ابوسفیانؓ بن حرب اور حارثؓ بن ہشام وغیرہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملنے گئے، مگر وہاں سب سے پہلے بدری صحابہ کو، جن میں سے حضرت صہیب رومی، حضرت بلال حبشی اور حضرت عمار رضی اللہ عنہم خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں، ملاقات کا موقع دیا گیا۔ حضرت ابوسفیان پر، جنھوں نے ابھی کل تک بڑے بڑے

---

[1] بخاری، جلد دوم۔ باب کراہیۃ الشفاعۃ فی الحد اذا رفع الی السلطان

جبّاروں کو اپنے سامنے گھٹنے ٹیکتے دیکھا تھا، یہ بات بڑی شاق گذری۔ گویا ان سے اپنی رئیسانہ شان کی یہ 'بے قدری' دیکھی نہ جا سکی۔ چیں بہ جبیں ہو کر بول اُٹھے :"کیا قیامت ہے، ان غلاموں کو تو باریابی کا اذن ملتا ہے، اور ہم باہر بیٹھے منھ تک رہے ہیں!" ان کا یہ کہنا صراحتہً اس امر کا غماز تھا کہ شرف و منزلت کے اسلامی معیار سے ان کا ذہن اس وقت پوری طرح ہم آہنگ نہیں رہ گیا تھا اس لیے وہ محسوس نہ کر سکے کہ یہ اسلام کی بارگاہ ہے، قیصر کا دربار نہیں ہے۔ یہاں آدمی کا مرتبہ حسب و نسب اور جاہ و مال کی ترازو نہیں، بلکہ ایمان اور تقویٰ کی میزان مقرر کرتی ہے۔ چنانچہ حضرت سہیلؓ بن عمرو نے، جو خود بھی ان کے ساتھ باہر کھڑے تھے، انہیں سمجھایا" بھائی! یہ حسرت اور افسوس کا موقع ہے، غصہ کا نہیں ہے۔ اسلام نے سب کی طرح تمہیں بھی اپنی طرف بلایا تھا، مگر تمہاری کم توفیقی نے برسوں تک تمہیں حیص بیص میں ڈالے رکھا، اور یہ لوگ آگے بڑھ گئے۔ یہ خدا کی راہ میں اذیتیں برداشت کر کے اپنے مراتب بلند سے بلند کرتے رہے، اور تم اپنے عمل کے دفتر میں ایسا کوئی اندراج نہ کرا سکے۔ اب اگر یہ لوگ خلیفۃ المسلمین سے اپنے خیر مقدم میں اوّلیت کا شرف پا رہے ہیں تو ان کے اس استحقاق کا انکار کیسے کیا جا سکتا ہے؟

۱۰۔ لوگوں کے ساتھ ان کی حیثیتوں کے مطابق سلوک

اسلام جس طرح تفریط کو پسند نہیں کرتا اسی طرح افراط سے بھی کام نہیں لیتا۔ اس کا اختیار کیا ہوا راستہ اعتدال و توسط کا راستہ ہے۔ مسئلہ کے سبھی پہلوؤں پر نظر رکھتا ہے، اور خالص اصولی تقاضوں کے ساتھ ساتھ عملی حقیقتوں اور مصلحتوں کو بھی مناسب حد تک ملحوظ رکھتا ہے۔ اپنی اسی حکیمانہ میانہ روی کے باعث جہاں اس نے سارے بنی آدم کو کنگھی کے دندانوں کی طرح (کَاَسْنَانِ الْمُشْطِ) برابر قرار دیا ہے، وہاں یہ تلقین بھی کر رکھی ہے کہ "لوگوں کے ساتھ ان کی حیثیتوں کے مطابق سلوک کرو" (اَنْزِلُوا النَّاسَ مَنَازِلَھُمْ)[1]۔ مدعا اس تلقین کا یہ ہے کہ کسی شخص کو اپنی قدر و حیثیت کی تحقیر کا واقعی شکوہ نہ ہونے پائے۔ ظاہر بات ہے کہ

---

[1] ابو داؤد۔ جلد دوم۔ باب فی تنزیل الناس منازلہم

یہ مدعا اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب لوگوں کے ساتھ برتاؤ کرتے وقت ان کی عرفی حیثیتوں کا بھی، صحیح حدود کے اندر، لحاظ رکھا جائے۔ البتہ یہ لحاظ لازماً اس انداز سے کیا جانا چاہیے کہ اس کے نتیجے میں دوسروں کو اپنی کم قدری کا احساس نہ ہوسکے۔ ورنہ بات عدل و توسط کے دائرے سے باہر نکل جائے گی۔ مساوات کے باب میں یہ ایک نازک اور غامض پہلو تھا۔ اس لیے عام لوگ اس کے سمجھ پانے سے اکثر عاجز رہ جاتے تھے، اور انہیں اسے سمجھانا پڑتا تھا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ایک بھکاری کو روٹی کا ایک ٹکڑا دے کر رخصت کر دیا۔ لیکن کچھ دیر بعد جب ایک ایسے شخص کا آپؓ کے پاس سے گزر ہوا جو اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھا اور صورت شکل کا بھی اچھا تھا، تو آپؓ نے اسے بٹھا لیا، اور اس نے بیٹھ کر شکم سیر کھایا پیا۔ لوگوں نے آپؓ کا یہ رویہ دیکھ کر، کہ دو آدمیوں میں سے ایک کے ساتھ آپ کا سلوک کچھ اور رہا اور دوسرے کے ساتھ کچھ اور رہا، تعجب کا اظہار کیا، تو آپؓ نے انہیں مذکورہ بالا ارشادِ نبوی سنا دیا[1]۔ تب جا کر ان لوگوں کی سمجھ میں آیا کہ شرعی حدود اور قوانین کے نفاذ میں سارے آدمیوں کو جس طرح ایک نظر سے دیکھنا اور سب کے حق میں بالکل یکساں رویہ اختیار کرنا ضروری ہے ٹھیک ویسی ہی یکسانی اور مساوات کا رویہ عام معاشرتی امور میں بھی اختیار کرنا حکمت مصلحت اور دور اندیشی کے خلاف ہے۔ ہر شخص کے ساتھ اس کے مرتبہ و مقام کو ملحوظ رکھتے ہوئے پیش آنا چاہیے۔ اس سے اپنی اپنی جگہ سبھی لوگ خوش اور مطمئن رہیں گے، اور یہ خشک اور بے لچک مساوات کے مقابلے میں بہر حال قابلِ ترجیح چیز ہے۔

۱۱۔ قومی عصبیت خلافِ دین و ایمان ہے

اسلام نے اپنی ہیئتِ اجتماعیہ کی بنیاد رنگ، زبان، نسل اور ملک و وطن کے بجائے صرف عقائد و افکار کی یکسانی پر رکھی۔ اس نے قریشی کو حبشی سے گلے ملوا دیا، اس لیے کہ دونوں کا عقیدہ، مسلک، نظامِ حیات اور مقصدِ زندگی ایک تھا، اور خود قریشی کو قریشی سے الگ کر دیا، اس لیے کہ ایک حزب اللہ کا رکن اور دوسرا اس کا باغی تھا۔ اس نے مکہ والوں

---

[1] ایضاً

کو مدینہ لاکر اوس وخزرج کا ہم قوم بنا دیا، اور خود اہلِ مکہ کو بھی اور اہلِ مدینہ کو بھی اس لیے اپنے اپنے عزیزوں کا غیر ٹھیرا دیا کہ اُن کا اِن سے اگرچہ خون کا رشتہ تھا، وطن کا رشتہ تھا، نسل کا رشتہ تھا، مگر لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا وہ حقیقی اور لازوال رشتہ نہ تھا جس کے سامنے سارے مادّی رشتے بالکل ہیچ ہوتے ہیں۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ قومیت کا یہ تصور حد درجہ انقلابی بھی تھا، آفاقی بھی تھا، اور انسانیت کے لیے وحدت کا پیام بھی تھا۔ کیونکہ اس نے نسل، رنگ، زبان اور جغرافیے کی قینچیوں سے کٹی ہوئی نوعِ انسانی کے لیے اتحاد کی ایک ایسی بنیاد فراہم کر دی تھی جو خالص عقلی اور فطری تھی، جس پر پوری انسانیت ایک ہی رشتہ میں بندھ کر امتِ واحدہ اور ایک عالمی قوم بن سکتی تھی، اور اس کے مختلف اجزاء کے درمیان کھڑی کر دی جانے والی وہ ساری دیواریں ڈھا دی جا سکتی تھیں جنہیں جاہلیت نے دریاؤں اور پہاڑوں، نسلیت اور وطنیت کے تفرقوں، رنگ اور زبان اور طرزِ معاشرت کے امتیازات کے ذریعہ کھڑی کر رکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ اسلام کی یہ کوشش جاہلیت کے لیے ایک غیر معمولی اور انتہائی سنگین خطرہ تھی۔ اس لیے اس نے بھی اس کے توڑ کے لیے وہ سب کچھ کیا جو اس کے بس میں تھا، اور ہاتھ سے نکلتے ہوئے میدان کو گویا دانتوں سے پکڑے رہی، اور اسلام کے اس فکری سیلاب کا منھ موڑ دینے کی کوئی سعی اٹھا نہیں رکھی۔ چنانچہ دعوتِ اسلامی کو بھی اپنی اِس کوشش میں پسینے آ گئے، اور مہاجرین و انصار جیسے بے مثل خدا پرستوں کو بھی بسا اوقات اس تصور اور فلسفے کو پوری طرح ملحوظ رکھنے میں کوتاہیوں سے دوچار ہو جاتے دیکھا گیا۔ گھات میں لگی ہوئی جاہلیت نے، جب بھی موقع پایا، اپنے پانچویں کالم، منافقین کی مفسدہ پردازیوں اور خفیہ کارروائیوں کے ذریعہ ان کے اندر گروہی عصبیت کے جذبات کو بھڑکا دیا، جنہوں نے بھڑک کر شعلہ بن جانا اور شعلہ بن کر اسلامی قومیت اور وحدت کو بھسم کر دینا چاہا۔ غزوۂ بنی مصطلق کے موقع پر ایک مہاجر نے مذاق مذاق میں ایک انصاری کے کولھوں پر مار دیا تھا، اس پر انصاری بزرگ کو سخت غصہ آ گیا، اور پھر بات یہاں تک پہنچ گئی کہ دونوں نے اپنے اپنے لوگوں کی دہائی دے ڈالی۔ جس کے نتیجے میں تھوڑی دیر کے لیے اسلامی قومیت اور اخوت کا ایمانی جذبہ پسِ پشت جا پڑا۔[1]

---

[1] بخاری۔ جلد اول۔ باب ما ینہی من دعوی الجاہلیۃ۔

اسی طرح کی بات اُس وقت بھی ہوئی تھی جب خود انصار ہی کے دونوں بازووں، اوسی اور خزرجی مسلمانوں، کے بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے باہم گفتگو کر رہے تھے اور یہودی شرانگیزوں کا ایک گروہ بھی آکر شریکِ مجلس ہو گیا تھا، تاکہ کسی طرح پرانے جاہلی تعصبات کو چنگاری دکھا کران دونوں قبیلوں کی گذری ہوئی عداوتوں کو تازہ کردے۔ اس غرض کے لیے اس نے موقع نکال کر بعاث کی لڑائی کا ذکر چھیڑ دیا، جس میں یہ دونوں قبیلے ابھی ماضیٔ قریب میں لڑکر فنا کے گھاٹ اتر جانے کے قریب پہنچ گئے تھے۔ یہودیوں کی یہ تدبیر کامیاب رہی۔ چنانچہ قبائلی عصبیت اور حمیت کا ایک کوندا سا لپک اٹھا، اور کچھ ایسا نظر آیا کہ اب انقلابِ معکوس بپا ہو جائے گا۔ لیکن آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم آموجود ہوئے۔ اور آپؐ نے وعظ و تذکیر کے ذریعہ اس فتنہ کو فوراً ہی بجھا دیا۔[1]

واقعۂ افک کے موقع پر جب حضورؐ نے فرمایا کہ کون ہے جو اُس 'مفتری' (بہتان تراش) سے انتقام لے جس نے مجھے ایسی قلبی اذیت پہنچائی ہے؟ تو اَوس کے سردار، حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے اٹھ کر کہا 'میں حاضر ہوں'، اگر وہ مفتری میرے اپنے قبیلے کا ہے تو بتایئے اس کی گردن ماردوں، اور اگر وہ خزرجی ہے تب بھی آپ کے ارشاد کی تعمیل کروں گا۔ خزرج کے سردار، حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو یہ دوسری بات ناگوار گذری۔ انہوں نے اسے اپنے قبیلہ کی شان اور عزت پر حملہ محسوس کیا، قبائلی حمیت کے جوش میں آکر بول اٹھے "خدا کی قسم تم جھوٹ کہہ رہے ہو، تم اسے ہرگز نہیں مار سکتے۔ اگر وہ (مفتری) تمھارے قبیلے کا فرد ہوگا تو تم اس کا قتل کر دیا جانا پسند نہ کرو گے۔" بات بڑھ گئی اور اوس و خزرج دونوں قبیلے باہم لڑنے پر اتر آئے۔ حضورؐ نے کافی محنت سے انہیں ٹھنڈا کیا۔ اگر آپ موجود نہ ہوتے تو نہیں معلوم بات کہاں تک جا پہنچتی، اور اسلامی اخوت، وحدت اور قومیت کو کسی حد تک مجروح کر کے چھوڑتی۔[2]

اس قسم کے جو واقعات اسلامی انقلاب کی ابتدائی تاریخ میں ملتے ہیں ان پر نظر

---

[1] بخاری، جلد اول، باب ماینہیٰ عنہ من دعوی الجاہلیۃ۔

[2] بخاری، جلد دوم، کتاب المغازی، باب حدیث الافک۔

ڈالیے تو معلوم ہو گا کہ اسلام اور جاہلیت کے اِس معرکے میں صحابہ کرام کی سی مخلص اور بےنفس جماعت کو بھی سخت کشاکشوں سے دوچار ہونا پڑا تھا، اور زبردست تربیتی کوششوں کے بعد ہی نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وہ انقلابی سوسائٹی تیار کر سکے تھے جس کی رگوں سے جاہلیت کا یہ تیزابی مادہ بالآخر نابود ہو گیا تھا۔

۱۲۔ ذاتی حمیت کو حق و عدل کا پابند رکھنا ضروری ہے

آدمی کے اندر ذاتی حمیت اور غیرت کے جذبات اس قدر طاقتور ہوتے ہیں کہ خاندانی اور قومی جذباتِ حمیت بھی ان کی برابری نہیں کر سکتے۔ جب اِن جذبات میں ہیجان آتا ہے تو بڑے بڑے اربابِ صبر و تحمل کے پاؤں بھی اکھڑ جاتے ہیں۔ اگرچہ اسلام کے نزدیک غیرت و حمیت بجائے خود ایک اعلیٰ جوہر ہے، لیکن یہ جوہر قابلِ قدر اسی وقت تک رہتا ہے جب تک کوئی غلط رخ نہ اختیار کرے اور نہ غلط مواقع پر حرکت میں آئے۔ ورنہ جس قدر یہ فی نفسہٖ قابلِ قدر اور قیمتی ہے، اسی قدر مذموم بن جاتا ہے۔ اسلام نے اس کے صحیح اور غلط اندازِ اظہار کے درمیان واضح خطِ فاصل کھینچ رکھا ہے۔ اس خط کی حد تک تو یہ حمیت ایک اچھی، قابلِ قدر، بلکہ ضروری چیز ہے۔ مگر اس سے آگے بڑھتے ہی جاہلیت کی سرحدوں میں داخل ہو جاتی ہے۔ اس لیے اُس نے اِس بات کی سخت ہدایت کر رکھی ہے کہ آدمی اپنے جذبۂ حمیت کو کبھی آزاد نہ چھوڑے، اور اسے حق و عدل کے تقاضوں کا پابند بنا کر رکھے۔ اس پابندی کی انتہاء کیا ہے، اور حمیت کے بھڑکے ہوئے جذبے کو قابو میں رکھنا کتنا ضبط اور تحمل اور کیسا شدید احتسابِ نفس چاہتا ہے؟ ان باتوں کا اندازہ اِس امر سے لگائیے کہ ایک بار حضرت ابوبکر صدیق رضؓ جیسے سراپا صدق و صفا اور پیکرِ حلم سے بھی اس سلسلے میں چوک ہو گئی۔ بات واقعۂ افک کے موقع کی ہے۔ یہ واقعہ ایک ایسا زبردست سانحہ تھا جس سے بڑھ کر کوئی جاں گداز اور روح فرسا سانحہ کسی انسان کے لیے شاید ہی ہو سکتا ہو۔ جس باپ کی عفت مآب بیٹی پر سرتاسر جھوٹا بہتان لگایا گیا ہو، اس کے زخمی دل کا حال خدا ہی جان سکتا ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دل پر یہی کاری زخم رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبَیّ کے ناپاک

ہاتھوں نے لگایا تھا۔ اس جھوٹے اور بے ہودہ بہتان سے متاثر ہو جانے والوں میں ایک صاحب، مسطح بن اثاثہ، بھی ناسمجھی سے شریک ہو گئے تھے، جو حضرت ابو بکرؓ کے نہ صرف قریبی عزیز تھے، بلکہ آپ کے پروردہ بھی تھے، اور ابھی تک آپ برابر ان کی کفالت کرتے رہے تھے۔ حضرت ابو بکرؓ کا اُن کی اِس حرکت پر رنج اور غصہ سے بے تاب ہو رہنا ایک فطری امر تھا۔ ہم آپ ہوتے تو نہ جانے ایسے شخص کے ساتھ کیا کچھ کر ڈالتے۔ مگر آنجنابؓ صدیق ہی نہیں، صدیقِ اکبر تھے۔ اس لیے آپ نے صرف اتنا کیا کہ قسم کھالی، آج سے اس شخص کی کفالت نہ کروں گا۔ مگر اللہ تعالیٰ اُن جیسے مردِ مومن کو صبر و تحمل اور عفو و درگذر ہی کے نہیں، فضل و احسان کے بھی جس مقامِ محمود پر دیکھنا چاہتا تھا، اُن کا یہ طرزِ عمل اِس سے فروتر تھا۔ اِس لیے فوراً تنبیہ نازل ہوئی کہ :۔

وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۗ أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۔

(نور۔ ۲۲)

تم لوگوں میں جو صاحبِ فضل اور خوش حال ہیں، وہ قرابت داروں، مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کی مدد نہ کرنے کی قسم نہ کھائیں، بلکہ چاہیے کہ انہیں معاف کر دیں اور ان سے درگذر کریں۔ کیا تم لوگ نہیں چاہتے کہ اللہ تمہارے قصور معاف کر دیا کرے؟ اللہ بڑا معاف کرنے اور رحم فرمانے والا ہے۔

اس تنبیہ کے سنتے ہی حضرت ابو بکرؓ نے کہا "ہاں بخدا میں ضرور چاہتا ہوں کہ اللہ میرے قصور معاف کر دیا کرے۔" یہ کہا اور پھر مسطح کی کفالت جاری کر دی[1]۔ غور کیجیے کہ مسطحؓ نے کتنا بڑا جرم کیا تھا؟ اپنے بزرگ قرابت دار، اپنے محسن اور اپنے سرپرست کے کلیجے کو کس قدر مجروح کر ڈالا تھا؟ اور اس کے جواب میں حضرت صدیقؓ اکبر نے کتنا معمولی اقدام کیا تھا؟ مگر اسلام کی روح اس معمولی سی بات پر بھی مضطرب ہو گئی۔

---

[1] بخاری، جلد دوم۔ کتاب المغازی۔ باب حدیث الافک

۱۲۔ راہِ خدا میں جان و مال کا نقصان حقیقی فائدہ ہے

جو کوئی لڑائی میں مارا جاتا ہے، اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ہلاک ہو گیا۔ اسی طرح جو مال و اسباب میدانِ جنگ کی نذر ہو جاتا ہے، اس کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ برباد ہو گیا۔ لیکن اسلام کا کہنا اس معاملے میں بالکل جدا ہے، جسے دنیا تو عجیب اور ناقابلِ فہم ہی کہے گی، مگر عقل و خرد کی نگاہ میں اس سے زیادہ حقیقی اور سچی بات اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ وہ کہتا ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ کے میدان میں جان اور مال کے نقصان کے معنی بالکل بدل جاتے ہیں۔ وہاں جسم سے روح کے نکل جانے کے معنی حیاتِ جاوداں پا جانے کے ہوتے ہیں، اور مال و اسباب کے صرف ہو جانے کا مطلب کھیتی بھر لینا ہوتا ہے۔ اس بلند نظری کی توقع ایمان کے جھوٹے مدعیوں سے تو خیر ممکن تھی ہی نہیں، ان کی چھوت سے کتنے ہی مخلص مسلمان بھی ابتداء میں متاثر ہو گئے، اور جہاد کے معرکے میں، خصوصاً غزوۂ اُحد میں شہید ہو جانے والوں کے بارے میں ان کی سوچ بھی کچھ ویسی ہی رہی جو عام لوگوں کی ہوا کرتی ہے، یعنی یہ کہ افسوس ہے، وہ جان سے جاتے رہے۔ قرآن حکیم نے ان کی نگاہوں کو بلندی اور دوربینی عطا کرتے ہوئے انہیں سمجھایا:۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝ۙ الخ

(آل عمران۔ ۱۶۹)

جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہو گئے ہیں انہیں مردہ نہ خیال کرو، وہ تو زندہ ہیں، اور اپنے رب کے پاس رزق پا رہے ہیں۔

یعنی زندگی کی لمبائی کو دنیا کے ظاہری فیتے سے نہ ناپو۔ زندگی کا تو فی الواقع کوئی آخری سرا ہے ہی نہیں۔ تم جس چیز کو موت کہتے ہو وہ زندگی کا خاتمہ نہیں ہے، بلکہ ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے میں منتقلی کا عمل ہے، اور تم اہلِ ایمان کو تو بہرحال یہ سمجھنا چاہیے کہ جن لوگوں کا یہ عملِ انتقال بستروں کے بجائے میدانِ جہاد کی کنکریلی پتھریلی زمین پر ہوتا ہے، وہ نیست تو کیا ہوں گے، زندگی بھی ایسی جاوداں اور پُر بہار پا جاتے ہیں، اور ایسے رزقِ کریم

سے نوازے جاتے ہیں جن کا تم ابھی تصور بھی نہیں کر سکتے۔ حقیقت کی اس تفہیم کے بعد لوگوں کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔ میدانِ جہاد میں جان بحق ہو جانے والوں پر ان کا غم زدہ ہونا تو اب بھی ایک فطری بات اور بشریت کا ایک ایسا تقاضا تھی جسے کسی طرح ناپسندیدہ نہیں کہا جا سکتا۔ مگر اس غم زدگی کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ وہ اپنے سے جدا ہو جانے والوں کو اب بھی مردہ، یعنی نعمتِ حیات سے محروم ہو جانے والے ہی خیال کرتے رہے تھے۔

اِسی طرح مال و اسباب کے اُس نقصان کے بارے میں بھی، جو جہاد کے باعث اٹھانا پڑتا تھا، کچھ اصحابؓ کا اندازِ فکر کچھ ویسا تھا جو عام لوگوں کا ہوا کرتا ہے۔ حضرت ایوبؓ انصاری کا بیان ہے کہ جب اسلام خوف و ہراس کی حالت سے نکل کر بے خوفی اور طاقت کی حالت میں آ گیا، اور اس کے فدائیوں کی کثرت ہو گئی، تو ہم انصار میں سے کچھ لوگوں نے آپس میں اس خیال کا اظہار کیا کہ اللہ کے فضل سے دین کے غلبے کا دائرہ مدینے کے باہر دور دور تک پھیل چکا ہے، حواریوں کی کوئی کمی نہیں رہ گئی ہے، اس لیے ہمیں اب اپنے گھروں میں ٹھیر کر اپنی جائدادوں کی دیکھ ریکھ کر لینی چاہیے، جو ہماری مسلسل جنگی مصروفیتوں کے باعث بے توجہی کی بھینٹ چڑھ گئی ہیں اور اس کے نتیجے میں ہمارا معاشی نظم درہم برہم ہو کر رہ گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے سوچنے کے اِس انداز پر فوراً گرفت کی، اور اس کی تردید میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت نازل ہوئی:[1]

.... وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ (بقرہ-۱۹۵)	.... اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہو، اور اِس کام سے رک کر، اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

اس آیت کا مطلب، خود حضرت ایوبؓ کے اپنے لفظوں میں یہ ہے:-

فَکَانَتِ التَّھْلُکَۃُ الْاِقَامَۃُ فِی الْاَمْوَالِ وَاِصْلَاحُھَا وَتَرْکُنَا الْغَزْوَ[2]	پس ہلاکت کی بات یہ تھی کہ ہم اپنی جائدادوں کی دیکھ بھال میں لگ کر جہاد کرنا چھوڑ دیتے۔

---

[1] بخاری، جلد دوم۔ ابواب التفسیر۔ [2] ترمذی، جلد دوم۔ ابواب التفسیر۔

معلوم ہوا کہ دین کی حفاظت اور نصرت کی جدوجہد میں لگے رہنا، اور جائدادوں اور کاروباروں کی خستہ حالی اور ان کے لیے فکرمندی کو اس جدوجہد میں رکاوٹ نہ بننے دینا نیز اس خستہ حالی کے باوجود راہِ حق میں اپنی پونجی کو لگاتے رہنا، ہلاکت اور بربادی نہیں ہے۔ بلکہ عین فلاح وخوش حالی ہے۔ ہلاکت اور بربادی تو فی الواقع اس بات میں ہے کہ اللہ کے دین کی خاطر مطلوب جدوجہد کو چھوڑ کر آدمی محض فکرِ معاش کا ہو رہے۔

۱۴۔ اسلام کی حنیفیت

اسلام کا مزاج حد درجہ حنیفی ہے۔ وہ اپنے پیرووں کے افکار و اعمال کو بالکل یک رنگ دیکھنا چاہتا ہے۔ اور نہ صرف یہ کہ وہ ان کے اندر کسی بیرونی عقیدہ وخیال کی آمیزش کو روا نہیں رکھتا، بلکہ ان پر اس کی پرچھائیں بھی پڑنے دینا نہیں چاہتا۔ اس بارے میں اس کی احتیاط کا حال یہ ہے کہ وہ اہلِ جاہلیت کے اُن طور طریقوں کو بھی انہیں اپنانے کی اجازت نہیں دیتا جن میں کفر وشرک اور فسق وفجور کا کوئی شائبہ دکھائی نہ دے رہا ہو اور جو صرف رواجی حیثیت کے ہوں۔ یہ احتیاط نہ تو کسی غربت پسندی کی بنا پر ہے نہ کسی ضد کے باعث ہے، بلکہ تمام تر ایک بڑی دینی مصلحت پر مبنی ہے۔ مصلحت یہ ہے کہ پیروانِ اسلام کے ذہن کی دینی حنیفیت کو پورا پورا تحفظ حاصل رہے۔ ایسا نہ ہو کہ آج اہلِ جاہلیت کے بعض سادہ سے رواجی طریقوں کی نقل کل کسی بڑے ضلال کی موجب بن جائے، اور جاہلی افکار کے در آنے کے لیے راستہ ہموار کر دے۔ یہ اندیشہ کوئی فرضی اندیشہ نہیں تھا، بلکہ ایک واقعی اندیشہ تھا۔ تجربات بتاتے ہیں کہ سابق میں ایسا بارہا ہو چکا ہے، اور انسانی نفسیات کا جائزہ کہتا ہے کہ ایسا ہونا ہمیشہ ممکن ہے۔

چونکہ یہ ایک گہری حقیقت تھی، اور اس تک نگاہوں کا آپ سے آپ پہنچ جانا آسان نہ تھا، اس لیے بہت سے اصحابِؓ رسولؐ کی نظر بھی بطورِ خود اسے اپنی گرفت میں نہ لے سکی، اور بعض مواقع پر وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرزِ عمل کے اختیار کر لینے کی درخواست تک کر بیٹھے۔ حضرت ابو واقدؓ لیثی بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

حُنین کی طرف جا رہے تھے تو آپؐ کا گذر مشرکوں کے ایک (خاص) درخت کے پاس سے ہوا، جسے "ذاتِ اَنواط" کہا جاتا تھا اور جس پر مشرکین اپنے اسلحے لٹکایا کرتے تھے۔ مسلمانوں نے (اسے) دیکھ کر کہا:۔

یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اجْعَلْ لَنَا ذَاتَ اَنْوَاطٍ کَمَا لَھُمْ ذَاتُ اَنْوَاطٍ[1]	اے اللہ کے رسول! ہمارے لیے بھی ایک ذاتِ انواط قرار دے دیجیے جس طرح ان (مشرکوں) کا ایک ذاتِ انواط ہے۔

یہ درخواست صراحتہً مشرکوں کے ایک رواجی طرزِ عمل کو اختیار کر لیے جانے کی درخواست تھی، اور اپنی جگہ یہ سمجھ کر کی گئی تھی کہ یہ ایک سادہ سی درخواست ہے اور اس میں قباحت کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ کیونکہ جس کام کی ہم گذارش کر رہے ہیں، اس میں شرک یا کفر کا سایہ بھی پڑا دکھائی نہیں دیتا۔ اس لیے اس میں کوئی حرج نہیں کہ ایسا ہی رواج ہم بھی اختیار کر لیں۔ ان حضرات کی یہ سوچ اپنی جگہ غلط نہیں تھی، مگر اس میں یہ امکان نظرانداز ہو رہا تھا کہ اس طرح مسلمانوں میں ایک ایسا ذہن پرورش پا سکتا ہے جو اہلِ جاہلیت کے باطل افکار سے اُس طرح گریزاں نہ رہے جس طرح رہنا چاہیے۔ اس بنا پر دین کے حنیفی مزاج سے یہ درخواست میل نہیں رکھتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں کی اس درخواست پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑا شدید ردّ عمل ظاہر کیا اور فرمایا:۔

سُبْحَانَ اللّٰہِ ھٰذَا کَمَا قَالَ قَوْمُ مُوْسٰی اجْعَلْ لَنَا اِلٰھًا کَمَا لَھُمْ اٰلِھَۃٌ[2]	سبحان اللہ! یہ تو ویسی ہی بات ہے جیسی موسیٰؑ کی قوم نے ان سے کہی تھی کہ "ہمارے لیے بھی ایک معبود (بت) بنا دیجیے جس طرح ان لوگوں کے بہت سے معبود ہیں۔

ظاہر بات ہے کہ مسلمانوں کی یہ درخواست بنی اسرائیل کے اس مطالبے سے بنیادی طور پر بالکل مختلف تھی اس کے باوجود آپؐ نے اسے جو اس کے مشابہ قرار دیا تو اس کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہ تھی کہ اس درخواست کے پیچھے کام کرنے والی ذہنیت آگے چل کر اعتقادی

---

[1] و [2] ترمذی۔ جلد دوم۔ ابواب الفتن۔

اور عملی مفاسد کی طرف بڑھ سکتی تھی، اور اہلِ جاہلیت کے ایک بظاہر سادہ سے رواجی عمل کی یہ ریس جاہلی افکار و اعمال کی پیروی کا ایک عام ذوق ابھار دے سکتی تھی۔ چنانچہ مذکورہ بالا الفاظ فرمانے کے بعد آپؐ نے اس اندیشے کی وضاحت بھی کر دی تھی، صرف وضاحت ہی نہیں کر دی تھی، بلکہ اس ذہنیت کو سامنے رکھ کر یہ پیشین گوئی بھی کر دی تھی کہ:-

وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَتَرْکَبُنَّ سُنَّۃَ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ ۔ [1]

قسم ہے اس ذات کی جس کی مٹھی میں میری جان ہے، تم لوگ اپنے سے پہلے کے لوگوں کی روش پر چل کر رہو گے۔

اس ارشاد میں 'تم لوگ' سے مراد حضرات صحابہ نہیں، بلکہ بعد کے مسلمان ہیں، اور 'پہلے کے لوگوں' سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔ مدعا اس ارشاد کا یہ تھا کہ آج تو میں تمہیں اس غلط فکری سے روک کر اس کے خطرناک نتائج سے بچائے دے رہا ہوں، مگر مستقبل میں، جب مسلمانوں کی ایمانی حس کمزور پڑ جائے گی، جاہلیت کا دباؤ پڑنے پر یہ ذہنیت سر اٹھا کر رہے گی، اور پھر جس طرح یہود اور نصاریٰ جاہلی افکار اور اعمال کے لیے اپنے دروازے کھولتے چلے گئے تھے، اسی طرح مسلمان بھی کھول کر رہیں گے۔

ان چند مثالوں اور واقعات کے حوالوں سے یہ حقیقت بالکل نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ اسلام اپنی انقلابی تعلیمات اور اپنے بلند ترین مقاصد کے لحاظ سے دنیا کے لیے اتنا 'غریب'، اور انوکھا تھا کہ اس کے مخالفوں کی بات تو الگ رہی، اس کے ماننے والوں کو بھی اس کا پوری طرح مزاج شناس بن جانے میں خاصا وقت لگا تھا۔



---

[1] ترمذی۔ جلد دوم۔ ابواب الفتن۔

اسلام کی فتحِ مبین

یہ تھیں اسلام اور جاہلیت کے اُس معرکے کی ضروری تفصیلات جو ۶۱۱ء سے شروع ہو کر ۶۳۲ء پر ختم ہوا تھا۔ یہ خاتمہ اسلام کی مکمل فتح کی شکل میں دنیا کے سامنے آیا تھا۔ اس تیئیس ۲۳ سالہ جنگ کے بعد جاہلیت پوری طرح سرنگوں ہو رہی، اور میدانِ فکر و عمل کے ایک ایک گوشے سے اس کے قدم اکھڑ کر رہ گئے۔ اب نقشہ یہ تھا کہ جو کبھی جاہلیت کے سپاہی تھے انہوں نے اسلام کے پرچم اٹھا لیے، اور خود اپنے ہاتھوں سے اس کے آہنی قلعوں کو زیر و زبر کر کے رکھ دیا۔ یہ دینِ حق کے مکمل غلبے اور عقلِ سلیم کی صحت مندانہ کارگذاری کا وہ سنہری دور تھا جس کی مثال تاریخ میں ڈھونڈے بھی نہیں پا جا سکتی۔ اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کون سا مستقبل اس طرح کا دورِ سعید پھر واپس لا سکے گا۔

یہ وہی اسلام تھا جس کی ہر آواز، ابھی گنتی کے چند سال قبل تک، بالکل نامانوس سمجھی جاتی تھی، اور ہر بات کا مضحکہ اڑایا جا رہا تھا۔ اِس احمقانہ رویے کی وجہ انسان کی ارادی شرارت ہی نہ تھی، بلکہ بڑی حد تک اس کی بےچارگی بھی تھی۔ باطل عقائد کے موروثی اثرات، جاہلیت کے ہمہ گیر تسلط اور حق فراموش ماحول کے گھیرے نے اس کے دل و دماغ پر ایسے پہرے بٹھا دیے تھے کہ اگر وہ سمجھنا بھی چاہتا تو کچھ نہ سمجھ پاتا۔ تقریباً چوتھائی صدی کی پیہم کوششوں کے نتیجے میں جب یہ پہرے اٹھ گئے، اور جاہلیت کے تینوں ستون — کفر، شرک اور فسق — ٹوٹ گئے، تو کل جسے 'مُنکَر' کہا جاتا تھا اب وہ دُنیا کا سب سے بڑا 'معروف' بن گیا تھا، جو اسلام 'غریب'، اور 'شَیئٌ عُجَاب' تھا، اب اس سے زیادہ جانی پہچانی اور معقول چیز اور کوئی نہیں رہ گئی تھی۔ اللہ کے دین کو مان کر نہ دینے والے ہٹ دھرم اگرچہ اب بھی

روح مرجھانے پر آگئی تو گھات میں لگی ہوئی جاہلیت ان پر پوری طاقت سے ٹوٹ پڑی، اور پھر آتے آتے وہ وقت آگیا جب اسرائیلیت اور جاہلیت، دونوں چیزیں ہم معنی ہوگئیں۔ پس یہ ایک امر واقعہ ہے کہ جاہلیت وقت پڑنے پر تھک ہار کر خاموش تو ہو جاتی رہی ہے، مگر ہمیشہ کے لیے خاموش کبھی نہیں ہوئی، نہ 'بُرے' سے بُرے' دن دیکھنے پر بھی کبھی میدان چھوڑ دینے کی روادار ہوئی۔ کیونکہ ایسا ہونا گویا شیطان کا مرجانا ہوتا جب کہ خالقِ کائنات کی حکمت اور مشیت کا فیصلہ یہ تھا کہ اسے قیامت تک زندہ رکھا جائے گا: تاکہ دنیا میں خیر و شر کا معرکہ برابر گرم رہ سکے، اور اس کے اندر بنی آدم کی آزمائش ہوتی رہے، جنہیں پیدا ہی اِسی آزمائش کے لیے کیا گیا ہے۔

جاہلیت کے اس تاریخی کردار کا کھلا ہوا تقاضا تھا کہ وہ اسلام اور امتِ مسلمہ کے بارے میں بھی وہی طرزِ عمل اختیار کرتی جو پچھلی ساری ملتوں کے ساتھ اختیار کرتی رہی ہے، اور اسلام کے خلاف اس کی معرکہ آرائی کبھی ختم نہ ہوتی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اسلام کے کامل غلبہ کے وقت وہ دب کر چپ تو ہو گئی تھی، مگر یہ اس کی جنگ کا خاتمہ نہیں تھا، صرف اِلتوا تھا۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہ التوا بھی سو فی صدی نہ تھا۔ کیونکہ اِس 'التوائے جنگ' کے دوران میں بھی اسلام کی صفوں میں اس کے بعض خفیہ اڈے بدستور قائم رہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ جاہلیت اپنی سخت جانی میں کینسر سے کم نہیں، جس کے باریک ترین ریشے بڑے اور انتہائی ماہرانہ آپریشن کے بعد بھی جسم کے اندر کہیں نہ کہیں باقی رہ جایا کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بے نظیر تربیتی کوششوں کے نتیجے میں اگرچہ دنیا کا پاکیزہ ترین اور سب سے زیادہ مثالی معاشرہ قائم ہو گیا تھا، مگر اس کے باوجود خود آپؐ ہی کا جائزہ تھا کہ:-

أَرْبَعٌ فِي أُمَّتِي مِنْ أَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ لَا يَتْرُكُونَهُنَّ الْفَخْرُ فِي الْأَحْسَابِ وَالطَّعْنُ فِي الْأَنْسَابِ وَالْاِسْتِسْقَاءُ بِالنُّجُومِ وَالنِّيَاحَةُ [۱]

جاہلیت کی چار باتیں ایسی ہیں جنہیں میری امت کے (سب) لوگ نہ چھوڑ سکیں گے: عالی نسبی پر فخر، دوسروں کے نسب پر طعن، نچھتروں کی طرف بارش کی نسبت اور نوحہ گری۔

---

[۱] مسلم۔ جلد اوّل۔ کتاب الجنائز۔

بکثرت موجود تھے، لیکن اس کی دعوت اور تعلیمات پر اب کوئی بھی حیرت کا اظہار نہیں کرتا تھا، نہ کوئی اسے ناقابلِ فہم ٹھیراتا تھا۔ غرض اب نہ کہیں قہقہے تھے نہ اشارے تھے، نہ طنز تھا نہ تمسخر تھا۔ کیونکہ قرآن حکیم کے دلائل نے، صاحبِ قرآن کی سیرت نے، اصحابِ رسول کی اخلاقی کایا پلٹ نے، اسلامی قوانین کی مؤثر تعمیری اور اصلاحی صلاحیتوں کے مظاہرے نے، اور اللہ تعالیٰ کی غیبی نصرت کے مسلسل ظہور نے ایک ایک کرکے اُن سارے پردوں کو چاک کرکے رکھ دیا تھا جو دین کے رخِ زیبا پر علم بردارانِ جاہلیت کے جھوٹے پروپیگنڈے نے ڈال دیے تھے۔ قرآنِ عزیز کے لفظوں میں:-

قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ... (البقرہ ۲۵۶) ہدایت، گمراہی سے بالکل ممیز ہو گئی۔

اس لیے اب کوئی بھی اسلام کو سمجھ نہ پا سکنے کا عذر نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا ظاہر اور باطن سب کچھ ان کے سامنے بالکل نمایاں ہو چکا تھا۔ لہٰذا کوئی وجہ نہ تھی کہ لوگ اب بھی اسے 'غریب' سمجھتے، اپنے کو اس سے فی الواقع نامانوس پاتے، اور اسے انسانی فہم سے بالاتر، اور معقولیت سے خالی، قرار دیتے۔

'ہدایت کا گمراہی سے یوں ممیز ہو جانا' ایک طرف تو اسلام کی دعوت کا نقطہ کمال تھا، دوسری طرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کی تکمیل کا اعلان بھی تھا۔ کیونکہ آپؐ کی بعثت کا مقصد بنیادی طور پر اس کے سوا کچھ اور تھا ہی نہیں کہ انسانی عقل و بصیرت پر سے 'غَیّ' (گمراہی) کے پڑے ہوئے حجابات کو ہٹا دیں، اور اسے جاہلیت کے اندھیرے سے نکال کر 'رُشد' (ہدایت) کے اجالے میں لا کھڑا کریں۔ یہاں تک کہ جنہیں حق کی طلب ہو ان کے لیے سب کچھ عیاں ہو جائے، اور وہ اس قابل ہو جائیں کہ جو کچھ دیکھیں ہدایتِ خداوندی کی نگاہ سے دیکھیں، جو کچھ سوچیں دینِ حق کی رہنمائی میں سوچیں، اور جو کچھ کریں شریعتِ الٰہی کے اجازت نامے کے مطابق کریں۔ دوسری طرف جاہلیت سے اتنے بیزار بھی ہوں کہ اس کا کہیں بھی عمل دخل انہیں گوارا نہ ہو، جس طرح خود اس کی قید سے آزاد ہو چکے ہیں اسی طرح دوسرے بندگانِ خدا کو بھی آزادی دلانے کے لیے بے قرار رہیں، اور اس مقصد کی خاطر اپنی فکری اور عملی کوششوں کے ذریعے، جہاں تک ہو سکے، اسے بے دست و پا بنانے چلے جائیں۔ دوسرے

لفظوں میں یہ کہ وہ زمانے کا رخ اس طرح پھیر دینے کا عزم و حوصلہ رکھنے والے ہوں کہ انسانیت کی زمام نفس اور جاہلیت کے ہاتھوں سے چھن کر عقل سلیم اور دینِ حق کے ہاتھوں میں پہنچ جائے ۔ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ کا مدعا فی الواقع یہی کچھ تھا۔ اور جب یہ مدعا حاصل ہوگیا تو وہ مقصد بھی پورا ہوگیا جس کے لیے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا گیا تھا، اس لیے اب آپ کو اللہ ربّ العزّۃ کا پیام آگیا کہ :-

اِذَا جَاۗءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۙ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۙ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۧ (سورہ نصر۔ ۱-۳)	جب اللہ کی مدد اور فتح آجائے اور تم دیکھو کہ لوگ جوق در جوق اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں، تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرو، اور اس سے مغفرت طلب کرو یقیناً وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔

یہ پیام صریح اشارہ تھا دنیا سے آپؐ کی رحلت کا، جیسا کہ حضرت ابنِ عباس رضؓ نے فرمایا ہے[1] گویا رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیوی زندگی کا اختتام اسی لمحے کا منتظر تھا۔ جب وہ لمحہ آگیا، اور اللہ کی نصرت نے جاہلیت کے سارے مورچے توڑ کر اسلام کی فاتحانہ پیش قدمی کا راستہ ہموار کر دیا، اور نتیجہ کے طور پر، اس کی تعلیمات سے پد کنے والے انسان دوڑ دوڑ کر اس کے سایہ تلے آنے لگے تو قضا و قدر نے آپؐ کو بلاوے کا اشارہ دے دیا۔

آپؐ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد آپؐ کی تیار کی ہوئی صالح اور مصلح جماعت اسلام کا پرچم لے کر آگے بڑھی، اور حدودِ عرب سے آگے بڑھ کر اس نے وہاں سے بھی جاہلیت کو رگیدنا شروع کر دیا، اور وہ مسلسل پسپا ہوتی چلی گئی۔ اس کی یہ پسپائی بہت سی قوموں کی حد تک تو سیاسی، تمدنی، نظریاتی اور مذہبی، ہر پہلو سے تھی، مگر بہت سی قوموں کے معاملے میں صرف سیاسی حدوں تک محدود رہی۔ کیونکہ اسلام کبھی جبر کا قائل نہیں رہا۔ اس لیے اُس نے اُن لوگوں کو، جو اپنی ہٹ کی بنا پر اُس کا پیغامِ ہدایت قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوسکے، اس کے لیے مجبور کر دینے کی بات کبھی نہیں سوچی، اور ان کے ہاتھوں سے بس سیاسی

---

[1] بخاری، جلد دوم۔ کتاب التفسیر۔

اقتدارِ اعلیٰ کے لے لینے ہی پر اکتفا کیا۔ اور یہ سیاسی اقتدار کا لے لینا نہ تو ملوکیت پرستانہ تھا نہ استعماری نوعیت کا تھا، بلکہ صرف اس لیے تھا کہ وہاں کے لوگوں پر جو جاہلی نظام مسلط تھا، اس کی نظریاتی گرفت مزید سخت ہوتے رہنے کے بجائے قدرے ڈھیل پڑ جائے، اور اس طرح انہیں ایک ایسا ماحول میسّر آجائے جس میں وہ اسلام کے پیغام کو سنجیدگی کے ساتھ سن اور سمجھ سکیں، اور اس کے نظامِ خیر و عدل کو کھلی آنکھوں دیکھ سکنے کی پوزیشن میں ہوں۔

اِس جماعتِ صالحہ کی اِنہی مجاہدانہ کوششوں کا نتیجہ تھا کہ اس کی تلوار تو ابھی رومی سرحدوں ہی پر اپنی چمک دکھا رہی تھی، مگر قرآنِ عزیز کی شعاعیں فاتحانہ انداز میں یورپ کے وسط تک جا پہنچی تھیں، اور اسلام کے افکار کتنے ہی دماغوں کو متاثر کرتے جا رہے تھے۔ کیونکہ اب ان دور دراز علاقوں کے لیے بھی اسلام پوری طرح 'غریب' نہیں رہ گیا تھا۔ سوچنے سمجھنے والے چاہے اس کا برملا اعتراف نہ کرتے رہے ہوں، مگر اسلامی افکار اور اقدار سے ان کا متاثر نہ ہونا ممکن نہ تھا۔ اسلامی افکار و اقدار کی یہی بالادستی اور معقولیت تھی جس کے باعث رومی، ایرانی، مصری، افریقی، اسپینی، غرض ہر وہ تہذیب، جو اس سے ٹکرائی، اوندھے منہ گر گئی۔

یہ اُس دورِ سعید کی باتیں ہیں جب 'مسلمان' کے معنی کچھ اور ہی تھے۔ وہ اسلامی تہذیب و اخلاق کے پیکر، اور دینی اصول و افکار کے عملی ترجمان مسلمان تھے۔ قرآن ان کی فکری اور عملی قوتوں پر پوری طرح حکمراں تھا۔ جہاد اور اجتہاد، دونوں کی روحیں ان کی رگوں میں بجلی کی طرح دوڑ رہی تھیں۔ وہ فاتح اقوام ہی نہیں تھے، فاتحِ اذہان بھی تھے۔ نہ صرف تلوار ہی کے دھنی نہیں تھے، قلم کے امام بھی تھے۔ قرآن حکیم سے روشنی لے کر انہوں نے فکر و عمل کے گوشے گوشے کو منور کر دیا تھا۔ تحقیق و اکتشاف کے میدان میں پیش قدمیوں پر پیش قدمیاں کرتے چلے جا رہے تھے، اور دنیا کی تہذیبی امامت کے منصب پر فائز تھے۔ اس وقت علم تھا تو ان کا، معاشرت تھی تو ان کی، بین الاقوامی سیاست کی سیادت تھی تو ان کی۔ ان کے افکار اور علوم کے دھارے قسطنطنیہ اور جبرالٹر کے راستوں سے یورپ کے خشک اور تاریک ذہنی صحراؤں تک پہنچے تو مدتوں آبِ حیات بن کر انہیں سینچتے رہے۔ یہاں تک کہ ابھی ی

بدولت وہاں وہ نئی زندگی پیدا ہوئی جسے یورپ کی 'نشاۃِ ثانیہ' کہا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا آج کوئی متعصب سے متعصب مستشرق بھی انکار نہیں کر سکتا۔

فکری، علمی، تہذیبی اور اخلاقی انقلابِ صالح کی یہ ایک لمبی داستان ہے، جس کی تفصیل کے لیے دفتر کے دفتر چاہئیں۔ یہاں اِن تھوڑے سے اشارات کے پیش کر دینے کا مدعا صرف یہ ہے کہ اسلام کی اُس حالت کا اندازہ لگا لیا جا سکے جو 'غربت' کی گہری دھند کے چھٹ جانے کے بعد رونما ہوئی تھی، اور وہ پوری طرح نمایاں اور سربلند ہو کر وقت کی سب سے زیادہ مانوس چیز بن چکا تھا، اور جَاءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ کی قرآنی پیشین گوئی واقعیت کا روپ اختیار کر چکی تھی۔

فکر و عمل کے اس صالح ترین اسلامی انقلاب کی تابانیوں کی کیفیت معلوم کرنے کے لیے صرف ایک واقعہ کو سامنے رکھ لینا کافی ہوگا۔ شام کے عیسائیوں کو اسلامی حکومت کے سائے میں آئے ہوئے تھوڑے ہی دن ہوئے تھے کہ انہیں معلوم ہوا رومی شہنشاہیت اِس علاقے کو مسلمانوں سے واپس چھین لینے کے لیے زبردست تیاریاں کر رہی ہے۔ اگرچہ رومی اُن کے ہم مذہب تھے، اس لیے بظاہر انہیں اس خبر پر خوش ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن اس کے برعکس انھوں نے اسے اپنے لیے ایک بدخبری سمجھا، اور اس کی اطلاع مسلمانوں کو دے دی۔ مسلمانوں نے اپنی تعداد اور سرو سامانِ جنگ کی کمی کے باعث اپنے کو اس حملہ کی مدافعت سے قاصر محسوس کیا، اور شامی علاقے سے ہٹ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس فیصلے کے بعد انہوں نے شامیوں سے لی ہوئی جزیے کی رقم انہیں واپس کر دی، اور ان سے کہا کہ ہم نے تم سے یہ رقم تمہاری حفاظت کے بدلے میں لی تھی، چونکہ اِس وقت ہم اس ذمہ داری کو پورا کرنے سے معذور ہیں اس لیے اس رقم کا لے رکھنا اسلام کی رو سے ہمارے لیے جائز نہیں رہ گیا ہے۔ یہ دیکھ اور سن کر اہلِ شام کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اور بے اختیار بول اٹھے 'خدا تمہیں جلد واپس لائے'۔ حق کی گیرائی اور عدلِ اسلامی کی تسخیر کا کمال دیکھیے کہ جو لوگ قومیت کے پجاری اور وطنیت پر مرمٹنے کے عادی رہ چکے تھے، خلافتِ اسلامیہ کی برکتوں کا تھوڑا ہی سا مشاہدہ کر لینے اور اسلامی نظام کا عملی تجربہ ہو جانے پر دل سے اس کے قدرداں بن گئے، اور اس کے زیرِ سایہ رہنے کو خود اپنے ہم مذہبوں کے مقابلے میں قابلِ ترجیح سمجھنے پر مجبور ہو گئے۔

سَیَعُوْدُ غَرِیْبًا کَمَا بَدَءَ (۱)

" اسلام پھر اُسی طرح غربت کی حالت میں لوٹ جائے گا جس طرح شروع میں تھا "

[اندرونِ ملت]

جاہلیت کی واپسی

دنیا میں حق کے مکمل غلبے کا یہ کوئی ایک ہی دورِ سعید نہیں تھا جو ساتویں صدی ہجری میں آیا تھا، بلکہ پہلے بھی بارہا آچکا تھا۔ قرآن مجید کا بیان ہے، اور تاریخ گواہ ہے کہ بندگانِ خدا کو راہِ راست دکھانے کے لیے خدا کے رسول مسلسل آتے رہے ہیں، اور وہ جب دنیا سے تشریف لے جاتے تو اس حال میں لے جاتے کہ ان کے دارالہجرتوں میں جاہلیت مکمل طور سے سرنگوں ہوئی رہتی تھی۔ مگر پھر ہوتا یہ رہا کہ وہ جلد ہی پرپرزے نکالنے شروع کردیتی، یہاں تک کہ لگاتار جدوجہد کے بعد اپنی فرماں روائی کا تخت ازسرِنو بچھا لیتی، اور لوگ ہدایت کی شاہراہ سے دور ہٹتے ہوئے کفر و شرک کی آغوش میں واپس چلے جاتے۔ اس کی قریب ترین اور بالکل واضح مثال بنی اسرائیل کی ملّی تاریخ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ راشد، یوشع بن نون، کے زمانے میں، اور ایک مدت تک اُن کے بعد بھی، اللہ کا دین اِس قوم کی زندگی کے دروبست پر چھایا رہا تھا اور جاہلیت کو دیس نکالا ملا ہوا تھا۔ اس بنا پر اُسے اپنے دور کی تمام قوموں پر برتری بھی حاصل رہی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے نزولِ قرآن کے وقت انہیں اپنی اِس نعمت کو یاد دلاتے ہوئے فرمایا تھا کہ " اے بنی اسرائیل! میں نے تمہیں سارے اہلِ جہاں پر فضیلت بخشی تھی " (اِنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ۔ بقرہ۔ ۴۷) لیکن آگے چل کر جب ان کی دینی

جو جاہلیت اتنی طاقت ور اور سخت جان تھی کہ اسلام کے مقابلے میں پوری طرح سپر انداز ہو رہنے کے دوران بھی اپنے بعض ہتھیاروں کو دانتوں سے پکڑے رہ گئی، اس سے ہرگز اس بات کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ شکست کے بعد مزید جنگ جوئی سے باز آجائے گی چنانچہ اندیشے کے عین مطابق وہ کسی زخمی درندے کی طرح اپنی کمین گاہ میں بیٹھ کر برابر مواقع کی تلاش میں لگی رہی۔ اور اسے یہ مواقع وفاتِ نبوی کے تھوڑے دنوں بعد ہی سے ملنے شروع بھی ہو گئے، جن سے فائدہ اٹھانے میں اس نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، اور میدان پر میدان سر کرنے لگی۔ یہاں تک کہ چند صدیوں کے اندر ہی اسلام کے مقابلے میں اُس کی حیثیت فریقِ غالب کی ہو گئی۔ اور یہ وہ صورت حال ہے جس کی پیشگی خبر مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے خود دے دی تھی۔ چنانچہ "بَدَءَ الْاِسْلَامُ غَرِیْبًا" فرمانے کے ساتھ ہی آپؐ نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ:-

سَیَعُوْدُ غَرِیْبًا کَمَا بَدَءَ　　اور وہ (یعنی اسلام) غربت و اجنبیت کی حالت میں پھر اسی طرح لوٹ جائے گا جس طرح شروع میں تھا۔

دیکھنے والی آنکھیں مدتِ دراز سے اس پیشین گوئی کے تدریجی ظہور کا صاف مشاہدہ کرتی چلی آرہی ہیں، اور اب تک کی صورتِ حال یہ ہے کہ امت مسلمہ کی ایک بہت بڑی تعداد پر جاہلیتِ نامراد کے سائے کافی حد تک چھا چکے ہیں، اور قدرتی طور پر اسی تناسب سے خالص اور کامل اسلام اس کے لیے غریب و نامانوس بن کر رہ گیا ہے۔ جب خود اپنے یگانوں کے لیے وہ اِس حد تک 'غیر' بن چکا ہو تو بیگانوں کے لیے کیا کچھ نہ بن گیا ہوگا۔ اس افسوس ناک اِنقلابِ حال کا پورا اندازہ کر سکنے کے لیے تاریخی حقائق اور واقعات کا قدرے تفصیلی جائزہ لے لینا ضروری ہے۔

واپسی کی راہیں

پہلے اسلام کے 'یگانوں' کے حال پر نظر ڈالیے، اور دیکھیے کہ خود ہمارے افکار و اعمال سے جاہلیت کے حملوں کی کس کیفیت کا ثبوت مل رہا ہے؟ یہ حملے کن کن راہوں سے ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں؟ اور ان کی کامیابی کی رفتار کیا ہے؟ اس جائزے کے لیے اصولی اور جامع رہنمائی نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں موجود ہے۔ کیونکہ آپؐ نے جس طرح یہ

فرمایا تھا کہ 'اسلام پھر غربت کی حالت میں واپس لوٹ جائے گا' اسی طرح اس امر کی بھی نشاندہی کردی تھی کہ یہ نامبارک انقلابِ حال رونما کس طرح ہوگا۔ آپؐ کی نظروں میں ایک طرف تو جاہلیت کا مزاج اور کردار تھا، اس کی پوری تاریخ تھی، دینِ خدا کے خلاف استعمال ہونے والے اس کے نفسیاتی حربے تھے۔ دوسری طرف انسان کی جبلی کمزوریاں بھی تھیں، ان کمزوریوں کے نتائج بھی تھے، اور قدیم ملتوں کی وہ سرگزشتیں بھی تھیں جو بتا رہی تھیں کہ قومیں انسانیت سے حیوانیت کی طرف، ہدایت سے ضلالت کی طرف، اور ایمان و تقویٰ کے مقامِ محمود سے کفر و فسق کے اسفل السافلین کی طرف کس طرح اور کیوں لڑھکتی رہی ہیں۔ ان ساری باتوں کو سامنے رکھ کر آپؐ نے صاف محسوس کر لیا تھا کہ میرے بعد نہ جاہلیت کی موجودہ خاموشی برقرار رہے گی، نہ اسلام کے حلقہ بگوشوں میں اتنی فکری صلابت اور ایمانی عزیمت باقی رہ جائے گی کہ جاہلیت ان میں انگلی نہ دھنسا سکے۔ اس لیے وہ سب کچھ ہو کر رہے گا جو اب تک ہوتا رہا ہے۔ یعنی جاہلیت اپنی تدبیروں اور کوششوں کے ساتھ پھر پلٹے گی اور اسلامی معاشرے کو فکری اور عملی، ہر حیثیت سے تہ و بالا کرنا شروع کر دے گی۔ اپنی خداداد بصیرت کی آنکھوں دیکھی ہوئی آئندہ کی اس صورتِ حال کو آپؐ نے صحابہؓ کے سامنے ہی ان لفظوں میں بیان کر دیا تھا:-

.... فَاِنِّیْ لَاَرَی الْفِتَنَ تَقَعُ	میں دیکھ رہا ہوں کہ فتنے تمہارے گھروں میں
خِلَالَ بُیُوْتِکُمْ کَوَقْعِ الْمَطَرِ[1]	بارش کی طرح برس رہے ہیں۔

اس ارشاد میں بات اگرچہ حال کے صیغے میں فرمائی گئی تھی، مگر اس کا تعلق فی الواقع مستقبل سے تھا۔ مستقبل میں رونما ہونے والے فتنوں کو حال کے صیغے میں اس لیے بیان کیا گیا تھا تاکہ ان کے رونما ہونے کو یقینی سمجھا جائے۔ چنانچہ ایک اور موقع پر جب یہی بات فرمائی ہوئی تھی تو آپؐ نے صراحتہً مستقبل کے حوالہ سے فرمائی تھی:-

وَیْلٌ لِّلْعَرَبِ مِنْ شَرٍّ قَدِ	خرابی ہے اہلِ عرب کے لیے اُس شر سے جو جلد ہی نمودار
اقْتَرَبَ[2]	ہونے والا ہے۔

'اہلِ عرب' سے مراد پوری ملتِ اسلامیہ تھی، نہ کہ صرف عرب کے لوگ۔ اہلِ اسلام یا

---

[1] بخاری۔ جلد دوم۔ کتاب الفتن [2] ایضاً

ملّتِ مسلمہ کے بجائے آپؐ نے 'اہلِ عرب' کا لفظ اس لیے استعمال کیا تھا کہ اُن دنوں ملتِ مسلمہ زیادہ تر اہلِ عرب ہی پر مشتمل تھی۔

یہ فتنے کیا اور کس نوعیت کے تھے؛ اور کن شکلوں میں رونما ہونے والے تھے؛ اس امر کی ایک مجمل، مگر ساتھ ہی جامع، نشاندہی حضورؐ کے اس ارشاد میں موجود ہے جسے آپؐ نے ایک خاص موقع پر صحابہ کرام کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:-

لَتَتَّبِعُنَّ سُنَنَ مَنْ قَبْلَكُمْ شِبْرًا شِبْرًا وَّ ذِرَاعًا ذِرَاعًا حَتّٰى لَوْ دَخَلُوْا جُحْرَ ضَبٍّ تَبِعْتُمُوْهُ قُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللهِ آلْيَهُوْدُ وَالنَّصَارٰى قَالَ فَمَنْ؟[1]

تم لوگ اپنے سے پہلے کے لوگوں کے طور طریق کی، بالشت در بالشت اور قدم بہ قدم، پیروی کر کے رہو گے، یہاں تک کہ اگر وہ کسی گوہ کے سوراخ میں گھسے ہوں گے تو ایسا تم بھی کرو گے۔ ہم (یعنی صحابہؓ) نے پوچھا اے اللہ کے رسول! کیا 'پہلے کے لوگوں' سے مراد یہود اور نصارٰی ہیں؟ ارشاد ہوا 'پھر اور کون'؟

یہی پیشین گوئی ایک اور موقع پر جب آپؐ نے فرمائی تھی تو وہاں موجود صحابہؓ نے اپنے استفسار میں یہود اور نصارٰی کے نہیں، بلکہ اہلِ فارس اور اہلِ روم کے نام لیے تھے، اور یوں پوچھا تھا کہ کیا 'پہلے کے لوگوں' سے مراد اہلِ فارس اور اہلِ روم ہیں؟ اس سوال کا جواب بھی آپؐ نے اثبات ہی میں دیا تھا۔[2] پہلی روایت حضرت ابو سعید خدریؓ کی ہے، اور دوسری حضرت ابو ہریرہؓ کی۔ ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے، بلکہ ایک ہی ہمہ گیر فتنے کے دو مختلف قسم کے سرچشموں کا بیان ہے۔ پہلی روایت میں مذہبی نوعیت والے سرچشمے کی نشاندہی ہے، اور دوسری میں سیاسی اور تمدّنی نوعیت والے سرچشمے کی۔ حضورؐ کا مدعا ان ارشادات کے فرمانے سے یہ تھا کہ دنیا کے مذہبی اور تمدّنی پلیٹ فارموں پر جو ملتیں اور قومیں بھی نمایاں ہیں، اُن سے تم مسلمانوں کا ربط و ضبط قدرتی طور پر ضرور ہی پیدا ہو گا۔ اس ربط کے نتیجے میں جہاں تم اپنی ایمانی صلابت کے وقت تک ان قوموں سے متاثر ہونے کے بجائے خود انہی کو اپنے سے متاثر کرتے رہو گے،

---

[1] بخاری، جلد دوم۔ کتاب الاعتصام۔ [2] بخاری، جلد دوم۔ کتاب الاعتصام۔

وہاں اِس ایمانی صلابت اور دینی حنیفیت میں زوال آجانے کے بعد، اثراندازی اور اثرپذیری کا یہ عمل الٹ جائے گا، اُس وقت مسلمان دوسروں کو متاثر کرنے کے بجائے خود ہی ان سے متاثر ہونے لگیں گے۔ قدم قدم پر ان کی ریس کرنا شروع کر دیں گے۔ ان کا جو طور طریق، جو اندازِ فکر، جو رسم اور جو فیشن انہیں بھائے گا اسے اختیار کر لیا کریں گے۔ گمراہ قوموں اور بدعمل ملتوں کے اتباع میں کوئی دریغ نہ رہ جائے گا۔ اور جب یہ سب کچھ ہونے لگے گا تو وہ قدرتی طور پر اپنی خودشناسی اور دینی خودی کو محفوظ نہ رکھ سکیں گے۔ اور پھر وہ فکری، تہذیبی اور دینی حدِ فاصل جگہ جگہ سے ٹوٹتی چلی جائے گی جو اللہ اور اس کے رسول صلعم نے اسلام اور غیر اسلام کے مابین قائم کر رکھی ہے، اور جس کا پوری طرح قائم رہنا مسلمان فرد کے دین و ایمان کی حفاظت، اور مسلم گروہ کے ملی تشخص کی بقا کے لیے بہرحال ضروری ہے۔

واپسی کی تیز رفتاری

نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پیشین گوئی کے مطابق حالات میں تغیّر کا آغاز آپ صلعم کی وفات کے بعد ہی سے ہوگیا تھا۔ اور پھر اس کی رفتار اتنی تیز رہی کہ حضرات صحابہؓ کی ایک بڑی تعداد کی موجودگی ہی میں مسلم معاشرہ کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ جس کا اندازہ خود بعض اکابر صحابہ ہی کے درج ذیل تبصروں سے بآسانی لگا لیا جا سکتا ہے:۔

۱۔ صحیح بخاری میں حضرت اُمّ الدّرداءؓ رضی اللہ عنہا کا یہ بیان مذکور ہے کہ "ابو الدّرداءؓ ایک روز غصّے میں بھرے ہوئے گھر آئے۔ میں نے پوچھا کیا بات ہے؟ انہوں نے جواب دیا "بخدا میں لوگوں کے اندر اِس ایک بات کے سوا، کہ وہ نمازیں اکٹھے ہو کر پڑھتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی اور بات موجود نہیں پاتا[1]"

۲۔ مؤطا میں امام مالک نے مشہور تابعی حضرت مالکؒ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ "میں نے صحابہ کو جس حال میں پایا اور دیکھا تھا، ایک اذان کے سوا اُس کی اور کوئی بات (آج)

---

[1] اغاثۃ اللہفان لابن قیمؒ۔ جلد اول ص۲۰۶

لوگوں میں موجود نہیں دیکھتا۔[1]

۳۔ بخاری میں امام زہریؒ کا یہ بیان منقول ہے کہ "میں دمشق میں حضرت انس بن مالکؓ کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ وہ رو رہے ہیں میں نے ان سے رونے کا سبب پوچھا تو فرمایا 'میں نماز کے سوا، رسولؐ اور اصحابِ رسولؐ کی کوئی اور چیز آج مسلمانوں میں موجود نہیں پاتا' اور اِس نماز کا بھی حال یہ ہے کہ اسے فی الواقع ضائع (اور بے روح) کر دیا گیا ہے"۔[2]

۴۔ مشہور تابعی حضرت حسن بصریؒ کہتے ہیں کہ "ایک شخص نے حضرت ابو الدرداءؓ سے پوچھا اگر اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان موجود ہوتے تو کیا ہماری کسی روش کو ناپسند فرماتے؟ یہ سوال سن کر حضرت ابو الدرداءؓ کو سخت غصہ آگیا۔ بولے 'کیا تمہاری کوئی روش حضورؐ کو پسند بھی ہوتی؟'[3]

امام ابن قیمؒ ان روایتوں کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ:۔

"یہی وہ عظیم فتنہ ہے جس کے بارے میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا کہ "اُس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تمہیں ایک بڑا فتنہ اپنی لپیٹ میں لے لے گا، اسی کے اندر بڑے بڑھاپے کو پہنچتے اور چھوٹے پروان چڑھتے رہیں گے، اس کی گرفت ہمہ گیر ہوگی۔ لوگ (اس کے عادی بن کر بالآخر) اسی کو 'سنت' قرار دے لیں گے۔ جب کبھی اُسے بدلا (اور صورتِ حال کو درست کیا) جائے گا تو کہنے لگیں گے کہ 'سنت بدل دی گئی'، یا یہ کہ 'یہ تو ایک مُنکر کا ارتکاب ہے'"۔[4]

اسلام پر چوطرفہ حملے

جاہلیت کی یہ واپسی صرف تیز رفتار ہی نہ تھی، بلکہ ہر سمت اور ہر رُخ سے بھی تھی۔ اس نے اسلام پر چاروں طرف سے حملہ کر دیا تھا۔ یہ حملہ دینی عقائد کے خلاف بھی تھا، شریعت کے

---

[1] اغاثۃ اللہفان لابن قیمؒ۔ جلد اول صـ۲۰۶ [2] ایضاً۔ [3] ایضاً۔
[4] اغاثۃ اللہفان، جلد اول صـ۲۰۶۔

خلاف بھی تھا، اسلامی اصول اور تصوّرات کے خلاف بھی تھا اور ملی وحدت کے خلاف بھی تھا۔ ایک ماہرِ جنگ دشمن کی طرح اِس حملے کے لیے نقشہ بھی اس نے نہایت کامیاب بنایا تھا چنانچہ سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر اسلام کے بنیادی عقائد کو نشانے پر رکھا۔ کیونکہ اس کا بارہا کا تجربہ تھا کہ اللہ کے دین پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے اوّلین ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کی بنیادوں میں بارود بچھا دی جائے گی۔ جب اس بارود کے دھماکوں سے ان بنیادوں میں جگہ جگہ دراڑیں پڑ جائیں گی تو اس دین کے باقی افکار و تصوّرات اور احکام و ہدایات سے لوگوں کو دور ہٹا دینا مشکل نہ رہ جائے گا۔ آئیے جاہلیت کے اِن منظم حملوں کا حال ذرا تفصیل سے دیکھ لیں:۔

۱۔ عقیدۂ نبوت پر

جاہلیت کے لیے سب سے زیادہ ناقابلِ برداشت چیز تو توحید تھی، مگر ابتداء میں وہ اس پر حملے کی کوئی سبیل نہ پا سکی۔ اس لیے اس نے اپنی مہم کا آغاز نبوتِ محمدی کے عقیدے سے کیا، اور اس کے خلاف کئی مورچے قائم کیے:۔

پہلا مورچہ 'انبیاء سازی' کا تھا، جس کی داغ بیل وہ عہد نبوی ہی میں ڈال چکی تھی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اس نے اپنی کارروائی تیز کر دی، اور نبوت کے دو مشہور جھوٹے مدعیوں، مُسیلمہ اور اَسْوَدُ العنسی کے معاملے کو کافی آگے بڑھا دیا۔ قبیلۂ بنی حنیفہ وغیرہ کے لوگ مُسیلمہ کے، اور اہلِ یمن وغیرہ اَسْود العنسی کے 'حواری' اور 'اُمتی' بن گئے۔ لیکن خلیفۂ ارشد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مضبوط ہاتھوں نے اِس پھیلتے ہوئے فتنہ کو پوری طرح کچل کر رکھ دیا۔ پھر خلافِ راشدہ کے آخری دور میں جب شیعہ فرقے کا ظہور ہوا، اور آگے چل کر جب اِس فرقے کے بھی فرقے پر فرقے بنتے چلے گئے تو انہوں نے نہ جانے کتنوں کو 'نبی' بنا ڈالا۔ مثلاً منصوریہ فرقے کے بانی، ابو منصور نے اعلان کر دیا کہ حضرت علی رضی اللہ کے رسول اور نبی تھے، اور پھر انہی کی طرح حضرات حسن رضؓ، حسین رضؓ، علی بن حسین اور محمد بن علی رضؓ بھی رسول و نبی تھے، اور اب میں خود رسول و نبی ہوں اور میری چھ پشتوں تک نبوت کا سلسلہ چلتا رہے گا۔ اِس ظالم نے اتنے ہی پر بس نہیں کیا، بلکہ یہاں تک کہہ ڈالا کہ نبوت کا سلسلہ کبھی ختم

ہی نہ ہوگا۔[1] خطابیہ فرقے کے بانی، ابوالخطاب کا، جس نے خود اپنی امامت کا دعویٰ کر رکھا تھا، کہنا تھا کہ شیعوں کے سارے ہی امام نبی تھے[2] مغیریہ فرقے کا بانی، مغیرہ، خود اپنی نبوت کا مدعی تھا۔[3] نصیریہ فرقے کے پیشوا، محمد بن نصیر النمیری، نے جہاں اور بہت سی کفریات بکیں، وہاں نبوت کا مدعی بھی بن بیٹھا۔[4] خوارج کے ایک فرقے کے بانی، یزید بن انیسہ، نے تو مستقبل کے بارے میں پوری صراحت اور تعیین کے ساتھ پیشین گوئی کر ڈالی کہ اللہ تعالیٰ ایران سے ایک نبی مبعوث کرے گا اور اس پر آسمان سے لکھی لکھائی ایک کتاب بھی بیک دفعہ نازل فرمائے گا۔[5] یہ نہ پوچھیے کہ نبوت کے بارے میں ان بے تحاشا دعووں کے حق میں آخر دلیل کونسی پیش کی جا سکی ہوگی؟ جاہلیت ایسی دلیلوں کے چکر میں نہیں پڑا کرتی جنہیں واقعی معنوں میں دلیل کہا جا سکے کیونکہ اسے معلوم ہے کہ دلیل اور حجت کے میدان میں اس کی ساری توپیں رنجک چاٹ کر رہ جائیں گی، اور پھر کوئی ایک محاذ بھی سر نہ ہو سکے گا۔ اس لیے وہ اپنا سارا کام جذباتی باتوں، پُر فریب نعروں اور خوشنما دعووں ہی سے چلایا کرتی ہے۔

یہ تو ابتداء کے سوڈیڑھ سو برسوں کے اندر کی چند مثالیں تھیں۔ اُس وقت سے لے کر اب تک جاہلیت یہ کھیل برابر کھیلتی چلی آرہی ہے، اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس دوران وہ اطرافِ عالم میں کتنے 'انبیاء' بنا کر اٹھا چکی ہے۔ اِس سلسلۂ کذب وافتراء کی غالبًا سب سے اہم کڑی قادیان نے فراہم کی۔ مرزا غلام احمد کی اِس خود ساختہ نبوت کو بعض اسباب کی بنا پر جو کامیابی حاصل ہوئی، اور اس نے ملّتِ اسلامیہ کو جو جراحتیں پہنچائیں، ان سے کون واقف نہ ہوگا۔

دوسرا مورچہ جاہلیت نے 'شرک فی النبوۃ' کا کھولا، اور اس کے لیے سب سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذاتِ گرامی کو خصوصیت سے آڑ بنایا۔ تاریخ اسلامی کا یہ کوئی

---

[1] فرق الشیعہ، بحوالہ الملل والنحل للشہرستانی، جلد اول ص۱۷۸ [2] مقالات الاسلامیین جلد اول، ص۹، بحوالہ الملل والنحل، جلد اول ص۱۷۸۔ [3] الملل والنحل، جلد اول، ص۱۷۹ [4] ایضاً [5] ایضاً ص۱۳۶۔

معمولی المیہ نہ تھا کہ خلافت کے تنازعے نے ملّتِ اسلامیہ کو پھاڑ کر رکھ دیا۔ اہلِ تشیّع کا ایک مستقل فرقہ وجود میں آگیا اور اس نے اپنے اِس خیال کو جزوِ ایمان بنا لیا کہ حضرت علی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے "وصی" اور "خلیفہ بلافصل" تھے۔ مگر اس سے بڑا المیہ یہ ہوا کہ یہ لوگ اپنے اماموں کی معصومیت کے بھی قائل ہو بیٹھے۔ ان کے ذہنوں میں یہ عقیدہ در آیا کہ حضرت علیؓ ہی نہیں، ان کی نسل سے اٹھنے والے سبھی "امام"، ویسے ہی معصوم ہیں جیسے معصوم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔[1] اسلامی عقیدۂ نبوت کے خلاف جاہلیت کی یہ ایک بڑی اہم کامیابی تھی کیونکہ ائمۂ اہلِ بیت کے ساتھ عقیدت کا یہ کوئی معمولی غلو نہ تھا، بلکہ ایسا غلو تھا جس کے ڈانڈے شرک فی النبوۃ سے جا ملتے ہیں۔ کسی بھی غیر نبی کو معصوم سمجھ بیٹھنا دراصل اسے نبوت کے مقام و منصب اور حقوق میں برابر کا درجہ دے دینا ہے۔ چنانچہ عملاً ایسا ہی ہوا بھی۔ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ جس طرح شرک فی التوحید کے بعد توحیدِ باری کا عقیدہ اپنی معنویت کھو دیتا ہے، اُسی طرح شرک فی النبوۃ کے بعد رسالتِ محمدی کا عقیدہ بھی اسلامی عقیدہ نہیں رہ جاتا، اور اس کی موجودگی میں اُن مقاصد کے پورے ہونے کی کوئی توقع نہیں کی جاسکتی جن کی خاطر اللہ رب العالمین نے اِس عالمگیر اور دائمی منصبِ رسالت کو قائم کیا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین بنا کر مبعوث کیا تھا۔ کیونکہ ایسی شکل میں آپؐ ہدایت کا تنہا سرچشمہ اور حق کا تنہا معیار کامل تسلیم شدہ نہیں رہ جاتے، نہ غیر مشروط اطاعت و اتباع کا استحقاق آپؐ کے لیے مخصوص رہ جاتا ہے۔ بلکہ وہ افراد بھی ان امور میں برابر کے شریک قرار پا جاتے ہیں جن کو ائمہ معصوم مان لیا گیا ہو۔ اور زیادہ صحیح بات تو یہ ہے کہ عملاً وہی سب کچھ ہو رہتے ہیں۔ یہ جو آپ نے ابھی پڑھا کہ متعدد غالی شیعوں نے اپنے اماموں کو رسول اور نبی ٹھیرا لیا تھا، تو یہ کوئی خلافِ توقع بات نہ تھی، بلکہ انہیں معصوم سمجھ بیٹھنے کا منطقی نتیجہ تھا۔

تیسرا محاذ اس نے امت میں غیر اسلامی تصوف کو رواج دے کر قائم کیا۔ یہ بڑا طاقتور محاذ تھا، جس کے ذریعہ سے وہ عقیدۂ نبوت کی جڑ تک کاٹ کر رکھ دینا چاہتی تھی۔ کیونکہ اِس تصوف کی بنیادی فکر یہ ہے کہ خدا تک پہنچنے کے لیے، جو کہ طاعت و بندگی کا اصل مقصو

[1] الملل والنحل، جلد اوّل۔ ص ۱۴۶

ہے، کسی نبی کا نہ تو توسط ضروری ہے نہ اس کی اقتداء ضروری ہے۔ اس کے بغیر بھی آدمی اِس منزلِ مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ بہت سے صوفیہ کے نزدیک خدا رسی کا یہ براہِ راست طریقہ انبیائی طریقے کے مقابلے میں افضل بھی ہے۔ اِن صوفیوں کی یہ بات کچھ اسی طرح کی ہے جیسی کہ ایک شیعی فرقہ، 'کیّالیہ' کے بانی، احمد بن الکیّال، نے کہی تھی کہ "انبیاء ؑ اُن اہلِ تقلید کے پیشوا ہوتے ہیں جن کے اندر بصیرت نہیں ہوتی، اور 'آئمہ' اہلِ بصیرت کے پیشوا ہوتے ہیں"۔[1] اب ایک عام آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ اگر روحانیات کے اِس فکر و فلسفہ کو قبول کر لیا جائے تو ایک نبوتِ محمدی کیا نفسِ نبوت ہی ایک غیر ضروری شے بن جاتی ہے۔ جب امر واقعہ یہ ہے تو اسلام اور قرآن پر ایمان رکھنے والا کوئی شخص اس اندازِ فکر کو کیسے صحیح کہہ سکتا ہے، اور جو کوئی اسے صحیح کہے، اسے مقامِ محمدی سے باخبر اور نبوت محمدی کا سچا قدر شناس کیسے مانا جا سکتا ہے۔ مگر آپ نے دیکھا کہ جاہلیت نے عقیدۂ نبوت کے خلاف یہ کارنامہ بھی انجام دے رکھا ہے۔

چوتھا محاذ 'وحدتِ ادیان' کے نظریے کی شکل میں ترتیب پایا۔ اس محاذ کے کھولنے کے لیے جاہلیت کو ابتدائی سامان تو تصوف کے بعض حلقوں سے ہاتھ لگا، مگر ادھر ایک عرصے سے لا مذہبی (سیکولر) سیاست اس کی خاص پشتیبان بنی ہوئی ہے۔ تصوف کے حلقوں سے ابتدائی سامان اسے اس لیے ہاتھ آ گیا کہ اِن حلقوں نے خدا رسیدگی کے لیے اتباعِ رسول ؐ کو غیر لازم ٹھہرا دیا تھا۔ جس کا صراحتہً یہ مطلب تھا کہ صرف رسولِ آخر الزماں ہی کا نہیں، بلکہ سبھی رسولوں کے اتباع کا یہی حال ہے، اور کسی رسول کا اتباع بھی خدا تک پہنچنے کے لیے لازمی نہیں ہے۔ اس طرح گویا سارے ہی انبیاء ہر حیثیت سے ایک سطح کے قرار دے دیے گئے اور اُن کے لائے ہوئے دینوں میں سے کسی کی حلقہ بگوشی کو حق اور عند اللہ مقبول، اور کسی کی پیروی کو ناحق و نامقبول ٹھہرانے کا کوئی سوال ہی باقی نہیں رہ گیا۔ اور اس طرح وحدتِ ادیان کے نظریے کے لیے بنیاد فراہم ہو گئی۔ سیکولر سیاست اس نظریے کی پشتیبانی اس لیے کر رہی ہے کہ یہ نظریہ اس کے اصول سے

ع؎ اس اہم بحث کو تفصیل سے دیکھنے کے لیے راقم الحروف کی کتاب "دین کا قرآنی تصور" کے متعلقہ باب کا مطالعہ فرمائیے۔ [1] الملل والنحل۔ جلد اول ص ۱۸۳۔

اور اس کے مزاج سے ایک حد تک میل رکھتا ہے، جب کہ اسلامی عقیدۂ نبوت اور اصولِ اتباعِ دین کو وہ اپنے لیے بجا طور پر اجل کا پیام سمجھتی ہے۔ اس سیاست کا بنیادی اصول انسان کی حاکمیت ہے، اور اس کا مزاج سرتا سر مادہ پرستانہ ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی نظریں حق اور باطل کے امتیازات سے بے پروا ہو کر بس اپنے مصالح پر جمی رہتی ہیں۔ اور اس کی سب سے بڑی مصلحت یہ ہے کہ جس طرح بھی بن پڑے سبھی مذاہب کے ماننے والوں کو اپنے جال میں پھنسائے رکھے۔ کیونکہ اقتدارِ حکومت کی حفاظت اور بقا اسی شکل میں ممکن رہ سکتی ہے۔ اپنے اس اصول، اپنے اس مزاج اور اپنے اس مفاد کے باعث وہ کسی ایک مذہب کو حق اور دوسرے تمام مذاہب کو باطل یا نامقبول قرار دینے کی غلطی کر ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ ایسا کر کے وہ اپنی 'عاقبت' خراب کرے گی۔ اس کی عاقبت کی خیر تو اسی میں ہے کہ توحید، شرک، مادہ پرستی، سبھی کو یکساں برحق کہے۔ اور نہ صرف کہے، بلکہ اس نظریے کو فروغ دینے کی بھرپور کوشش بھی کرے، اور ایسا وہ کرتی بھی رہتی ہے۔

اب غور کیجیے کہ جس نظریے کی پشت پر اتنی زبردست طاقتیں ہوں، جسے تصوف کا مقدس سایہ بھی نصیب ہو، جس کے سر پر سیاست کا دستِ شفقت بھی ہو، اور جسے زمانے کا حُسنِ قبول بھی حاصل ہوتا جا رہا ہو ـــــ اس کی قوتِ تسخیر کا کیسے انکار کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا 'روشن خیال' طبقہ بالعموم اس نظریے کا حامی بنا ہوا ہے، حتیٰ کہ بعض راسخ العقیدہ لوگ بھی اس کے بارے میں خاموشی اختیار کیے رہتے ہیں۔

یہاں اس وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں کہ وحدتِ ادیان کا نظریہ رسالتِ محمدی کی عالم گیری کی بھی کھلی ہوئی نفی کرتا ہے اور اس کی دائمی حیثیت کی بھی۔

پانچواں محاذ اس حریفِ اسلام نے رسالت محمدی کے مقام و منصب کی تنقیص اور کم قدری کا کھول رکھا ہے، جس کا مشہور نام "انکارِ حدیث" ہے۔ انکارِ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی ایک تاریخی حیثیت اور اہمیت تو ضرور رہے، مگر اسے کوئی تشریعی اور آئینی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ یہ نقطۂ نظر اللہ کے رسول ﷺ کو، جنھیں قرآنِ حکیم کی صراحت کے مطابق دینِ حق کا داعی، خلقِ خدا کا ہادی، اور اہلِ ایمان کا معلّم و مزکّی بنا کر

مبعوث کیا گیا تھا اور جن کی اطاعت کو خدا کی اطاعت قرار دیا گیا تھا، ایک عام پیغام رساں کے مرتبے پر اتار لاتا ہے۔ جس کے بعد آپؐ کی حیثیت صرف یہ رہ جاتی ہے کہ خدا کی جو کتاب آپؐ پر نازل ہوئی تھی اسے جوں کا توں اس کے بندوں تک پہنچا دیں، اور زیادہ سے زیادہ یہ کہ اس پر خود عمل کر کے دکھا بھی دیں۔ یہ نظریہ منصبِ نبوت سے بے خبری کی دلیل تو ہے ہی، خود قرآن سے بھی بے بہرہ ہونے کا ثبوت ہے، حالانکہ اسے قرآن کی حمایت ہی کے نام پر ایجاد کیا گیا ہے۔ یہ صرف یہی نہیں کرتا کہ نبوت محمدی کے مقام کی بلندی کو پستی سے بدل دیتا ہے، بلکہ قرآن حکیم اور کتاب مبین کو بھی 'غیر حکیم' اور 'غیر مبین' ٹھہرا دیتا ہے۔ جس کے نتیجے میں دین و شریعت کی ہیئت کچھ سے کچھ ہو رہتی ہے۔ اس نظریے کے موجدوں اور مبلغوں کو یہ سامنے کی حقیقت بھی دکھائی نہ دی کہ سنت کی آئینی اور تشریعی حیثیت کے انکار کے بعد وہ اور تو اور، اسلام کے خود بنیادی فرائض تک کس طرح ادا کر سکیں گے؟ نماز کن اوقات میں اور کتنی رکعتوں کی پڑھیں گے، اور ان رکعتوں میں کب کیا پڑھیں گے؟ زکوٰۃ کا نصاب کیا ہوگا اور اس کی شرح کیا ہوگی اور وہ کن کن چیزوں میں واجب الادا ہوگی؟ حج کے مراسم کی تفصیلات کیا ہوں گی؟ وغیر ذالک۔ قرآن مجید میں ان بنیادی فرائض کے بارے میں ضروری تفصیلات تو موجود نہیں ہیں، پھر وہ اس غرض کے لیے کس کی طرف رجوع کریں گے؟ اور جب عبادات تک کا یہ حال ہے تو زندگی کے وسیع معاملات میں حق و صواب کی روش معلوم کر سکنے کا کوئی سوال ہی کہاں باقی رہ جاتا ہے۔ مگر آدمی کے ذہن پر جاہلیت کا سایہ پڑ جائے تو اسے بھٹکے پن سے خدا کے سوا کون بچا سکتا ہے۔

چھٹا محاذ اس نے قرآن عزیز کی اعجازی حیثیت، اس کی صداقت اور اس کی محفوظیت کے خلاف قائم کیا، اور کوشش کی کہ اس کی حقانیت کو مشکوک بنا کر اس کے نتیجے میں نبوتِ محمدی کو ساقط الاعتبار ٹھہرا دے۔ شروع میں تو اسے کوئی قابلِ ذکر کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ صرف اتنا ہوا کہ کچھ سر پھرے اپنی ادبی 'عبقریت' کے زعم میں قرآن عزیز کے اس چیلنج کو قبول کر لینے کی جسارت کر بیٹھے کہ "جن و انس، سب کے سب مل کر بھی اس کے مثل کلام پیش نہیں کر سکتے"۔ چنانچہ بعضوں نے چند جملے لکھ کر پیش بھی کر دیے۔ جو ان کی قابلیت کا نہیں، جہالت کا شاہکار تھے، اس لیے آسمان پر تھوکا ہوا خود انہی کے منہ پر آ گرا۔ اور پھر آج تک

کسی کو اس جسارت کی ہمت نہ ہوسکی۔ اسی طرح کچھ افراد، مثلاً، بعض روایات کے مطابق، میمونیہ فرقہ سورۂ یوسفؑ کو قرآن کا حصّہ نہیں مانتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ صرف ایک قصّہ ہے، حسن وعشق کا قصّہ، اور کوئی قصّہ حسن وعشق قرآن کریم کا جزو نہیں ہوسکتا[1]۔ کچھ ایسا ہی معاملہ شیعی عوام کا بھی ہے۔ شیعہ فرقے کے محقق علماء اگرچہ قرآن کے بارے میں ایسا کوئی خیال نہیں رکھتے، مگر اس کے عوام میں یہ خیال بہرحال پھیلا ہوا ہے کہ قرآن کے کچھ حصّے غائب کر دیے گئے ہیں، یا اس کی سورتوں اور آیتوں کی ترتیب الٹ پلٹ دی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی واہی باتوں کو معقولیت کی میزان میں کوئی وزن حاصل نہیں ہوسکتا، اور نہ حاصل ہوا۔ اس لیے ان احمقانہ خیالات اور شاذ واقعات کو جاہلیت کی کوئی خاص کامیابی بھی نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن آگے چل کر مستشرقین نے اسے طرح طرح کے نئے آلاتِ جنگ مہیا کر دیے تو یہ صورتِ حال باقی نہیں رہ گئی۔ اِن لوگوں نے چہرے پر خالص علمی تحقیق کی نقاب ڈال کر اور ہاتھوں میں عناد و تعصب کا قلم لے کر اسلام، قرآن اور نبوتِ محمدی کے خلاف جو زہر افشانیاں کیں انھوں نے مرعوب ذہن رکھنے والے کتنے ہی تعلیم یافتہ مسلمانوں پر اعتقادی بے ہوشی طاری کر دی۔ اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ ذہنی مرعوبیت اور ایمانی بے حسی کے مریض اور علمِ کتاب و سنّت سے بے بہرہ اِن مسلمان 'اسکالروں' نے اپنے استادوں کے چبائے ہوئے لقموں کو خود بھی چباتا اور نگلنا اگلنا شروع کر دیا۔ قرآنِ عزیز کی صداقت کے بارے میں خود بھی شک و ریب کے روگی بنے اور دوسروں کو بھی اس کی چھوت لگانے کے لیے اس کے زہریلے جراثیم فضا میں پھیلانے لگے۔ استشراق کے یہ کج نظر شاگرد اور اندھے مقلد ہر مسلمان ملک میں پائے جاتے رہے ہیں، اور پائے جاتے ہیں۔ جاہلیت کو اپنے اِن نئے حواریوں پر جتنی بھی مسرت ہو کم ہے۔ استشراق کے ان شاگردوں کی جسارت کہاں تک پہنچ چکی ہے، اس بات کا اندازہ کرنے کے لیے صرف ایک مثال کا سُن لینا کافی ہوگا۔ مشہور مصری مصنّف، ڈاکٹر طٰہٰ حسین، اپنی کتاب "فی الشعر الجاہلی" کے ص۲۶ پر لکھتا ہے کہ "تورات ہم کو ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کے متعلق اپنی

---

[1] الملل والنحل، جلد اول ص۱۲۸۔

باتیں سنا سکتی ہے، اور قرآن بھی اپنا بیان دے سکتا ہے مگر صرف یہ بات کہ تورات اور قرآن میں ان دونوں صاحبوں کے نام مذکور ہیں، ان کے وجود کو تاریخی حیثیت سے ثابت شدہ قرار دینے کے لیے کافی نہیں ہے[1]

یہ ہیں وہ بڑے بڑے چھ محاذ جنہیں جاہلیت نے نبوتِ محمدی کے خلاف قائم کیا ہے۔ ان میں سے کسی محاذ پر بھی اس کی کامیابی معمولی نہیں رہ گئی ہے۔ یہ اس کی کامیابیوں ہی کا نوکرشمہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں قصیدے پڑھنے والے کروڑوں ملتے ہیں، مگر آپؐ کے اتباع کا حق ادا کرنے والے بہت تھوڑے دکھائی پڑتے ہیں۔ حالانکہ آپؐ کی ذاتِ اقدس سے جذباتی محبت اور عقیدت کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس کے باوجود اگر آپؐ کے صحیح اور کامل اتباع کا حال اچھا نہیں ہے تو اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ لوگوں کے ذہن عام طور سے مقامِ محمدی کے اچھی طرح شناسا نہیں رہ گئے ہیں، اور آپؐ کے حقیقی منصب پر اُن کے لیے کم و بیش اجنبیت کا دھندلکا چھا گیا ہے۔

۲۔ عقیدۂ توحید پر

اسلام کے عقیدۂ توحید پر جاہلیت کو حملے کا موقع اگرچہ ذرا دیر سے مل پایا، مگر جب مل گیا تو وہ اس پر پوری طاقت سے جھپٹ پڑی، اور پہلے ہی حملے میں اس نے آخری حدوں تک پہنچ جانا چاہا۔ حضرت ابوبکرؓ صدیق کے دورِ خلافت میں جہاں ایک طرف جھوٹی نبوتوں کا زور بندھا، وہاں دوسری طرف ارتداد کی ایک زبردست لہر بھی چلی، اور بہت سے وہ افراد اور قبائل جو اخلاص اور شرحِ صدر کے ساتھ مسلمان نہیں ہوئے تھے بلکہ اسلام کے غلبۂ عام سے مرعوب ہو کر مصلحتاً اس کے دائرے میں شامل ہو گئے تھے، علانیہ مُرتد ہو کر پرانی جاہلیت اور کفر و شرک کی آغوش میں واپس چلے گئے۔ جاہلیت کا یہ حملہ اتنا غیر متوقع اور اتنا زوردار تھا کہ بظاہر حالات اسلام کی صفوں کے زیر و زبر ہو جانے کا قوی اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔ صورتِ حال

---

[1] الملل والنحل۔ جلد دوم کا تتمہ ص ۸۷۔

یہ ہو چکی تھی کہ مکہ معظمہ کی مسجدِ حرام اور مدینہ منورہ کی مسجدِ نبوی اور بحرین کی مسجدِ عبد القیس کو چھوڑ کر پورے ملک میں کوئی ایک مقام بھی ایسا نہ رہ گیا تھا جہاں نمازوں کی اقامت بلا خوف و خطر ہو رہی ہوتی[1] مگر مہاجرین و انصار اور دیگر مخلص و جانباز مسلمانوں کی موجودگی اور خلیفۂ وقت کی مضبوط روش نے جس طرح جھوٹے مدعیانِ نبوت کے اٹھائے ہوئے فتنے کا سر پوری طرح کچھ کر رکھ دیا تھا، اسی طرح ارتداد کے اِس بھڑکے ہوئے شعلے کو بھی بجھا ڈالا، اور جاہلیت اپنے اس پہلے حملے میں یکسر خائب و خاسر ہو کر رہ گئی۔ جس کے بعد ایک تہائی صدی تک اپنے اس محاذ پر اسے کچھ کرنے کی ہمت نہ ہو سکی۔ لیکن خلافتِ راشدہ کی بساط پلٹتے ہی اس کی آنکھوں میں اس وقت چمک آگئی جب شیعہ فرقے کی کچھ انتہا پسند شاخوں نے اپنے اماموں کو صرف 'ائمۂ معصوم' ہی بنا ڈالنے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ انہیں، بالخصوص حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو خدائی کے مقام تک پہنچا کر دم لیا۔ اس کفر کی ابتداء عبد اللہ بن سبا نے کی، جو فی الاصل ایک شاطر یہودی تھا۔ جاہلیت نے اس فتنہ گر کی 'صلاحیتوں' کو بھانپ کر اپنا 'سپہ سالار' بنا لیا، اور اُسے اسلام کی 'وردی' پہنا کر اسلامی صفوں میں گھسا دیا۔ اس نے حضرت علیؓ کے حضور پہنچ کر ان کی تعریف و توصیف کا پل باندھ دیا، اور یہاں تک کہہ اٹھا کہ "اَنْتَ اَنْتَ"۔ یعنی آپ تو آپ ہی ہیں، دوسرے لفظوں میں یہ کہ آپ کی شخصیت کلیتہً بے نظیر ہے، اور آپ کو خدائی کا مقام حاصل ہے۔ یہ سُن کر آنجنابؓ نے اسے مدائن کی طرف جلا وطن کر دیا۔ حضرت علیؓ کے انتقال کے بعد اس یاوہ گو نے اپنی 'دعوت' پھیلانی شروع کر دی، اور ایک گروہ کو اپنے دام میں گرفتار بھی کر لیا۔ اس نے صرف حضرت علیؓ ہی کی الوہیت کا اعلان نہیں کیا بلکہ آپ کے بعد کے اماموں کے بارے میں بھی اس عقیدے کا اظہار کیا کہ جزئی الوہیت اُن کے اندر بھی منتقل ہوتی رہے گی[2] غالیہ فرقہ بھی اماموں کے بارے میں یہی عقیدہ رکھتا تھا[3] شیعوں کے جو فرقے 'امامِ غائب' کا عقیدہ رکھتے اور ان کی دوبارہ آمد کے منتظر ہیں، وہ سب سب اس بات کے بھی مدعی و معتقد ہیں کہ وہ الوہی صفات سے متصف ہوں گے، اور یہ کہ

---

[1] شرح مسلم للنووی۔ جلد اول۔ کتاب الایمان۔ [2] الملل والنحل۔ جلد اول ص ۱۷۴۔ [3] ایضاً ص ۱۷۳

ارشادِ قرآنی "وَسَتُرَدُّوْنَ اِلیٰ عَالِمِ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ" میں 'عالم الغیب والشہادۃ' سے مراد یہی امام منتظر ہیں[1] (العیاذ باللہ) خطابیہ فرقے کے بانی کا کہنا بھی یہی تھا کہ ائمہ سارے کے سارے نبی ہی نہیں بلکہ الٰہ و معبود بھی ہیں[2] ہشامیہ فرقے کے پیشوا، ہشام بن الحکم نے، جو شیعی متکلمین میں ایک اونچا مقام رکھتا ہے، حضرت علیؓ کے بارے میں اس عقیدہ کا اعلان کیا کہ "وہ واجب الاطاعۃ خدا ہیں[3]"۔ غرض اسلامی عقیدۂ توحید کے خلاف جاہلیت کی یہ یلغار شیعی فرقوں میں خاصی کامیاب رہی۔

بعد میں اس نے دوسروں کی طرف بھی رُخ کیا، اور ہر طرف دھاوے مارنے شروع کر دیے۔ اس غرض سے ایک طرف تو اس نے یونانی فلسفے کو ملتِ اسلامیہ میں در آمد کر کے اس کے ذریعے صفاتِ باری کے صاف ستھرے اسلامی عقائد و تصورات میں خاصے انحرافات پیدا کر دیے اور انہیں ایک حد تک چیستاں بنا کر رکھ دیا۔ دوسری طرف دینی شخصیتوں کی عقیدت میں جذباتی غلو کی بارود بھر کر ایسی آتش باری شروع کر دی کہ اہلِ حق کے لیے اس کا دفاع مشکل ہو گیا۔ انتہاء اس غلو کی یہ ہے کہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تئیں بھی کوئی حد نہیں چھوڑی گئی۔ جس معلّمِ توحید کو اتنی سی بات بھی پسند نہیں تھی کہ آپؐ کی تشریف آوری پر لوگ تعظیماً کھڑے ہو جایا کریں، یا آپؐ کو 'سیّد' (مالک و آقا) کہہ کر مخاطب کیا جائے، مبادا خدائے وحدہٗ لاشریک کی کبریائی کے تصوّر میں بال آ جائے، اُسی کی ذاتِ مُطہّر کو توحیدِ خالص کے عقیدے کو ڈھا دینے کے لیے استعمال کر ڈالا گیا۔ اور اس دھارے میں عوام تو عوام، کتنے ہی اربابِ تصوف اور کتنے ہی مدعیانِ علمِ کتاب و سنت بھی بہ گئے۔ درجِ ذیل چند شہادتیں اِس امر کی تصدیق کے لیے کافی ہوں گی:-

۱۔ کتنوں ہی کا عقیدہ یہ بن گیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کی زیارت حج کعبہ سے افضل ہے[4]

۲۔ بعض مشائخ جب حج کے لیے جاتے تو مدینہ منورہ پہنچ کر واپس لوٹ پڑتے، اور

---

[1] ایضاً۔ [2] ایضاً صہ ۱۷۹۔ [3] ایضاً صہ ۱۸۵۔ [4] اقتضاء الصراط المستقیم صہ ۱۸۳۔

اس تصور کے ساتھ لوٹ پڑتے کہ حصولِ مدعا کے لیے یہ زیادہ کارگر بات ہے[1]

۳- گم راہ قوموں نے اپنے ہاں مبعوث ہونے والے پیغمبروں کو اس جاہلانہ خیال کی بنا پر رد کر دیا کہ تم بشر ہو اور بشر خدا کا نبی نہیں ہو سکتا۔ اور جب کوئی پیغمبر اپنے مشن میں عملاً کامیاب ہو کر اور ایک امتِ مسلمہ تیار کر کے دنیا سے رخصت ہو گیا تو خود اُسی امت کے چند نسلوں کے بعد کے لوگ اِسی جاہلانہ بات کو الٹ کر یوں کہنے لگے کہ چونکہ وہ (یعنی ان کا پیغمبر) اللہ کا رسول تھا اور اللہ کا رسول کوئی بشر نہیں ہو سکتا، اس لیے وہ بشر نہیں تھا۔ چنانچہ اِسی اچھوتے 'فلسفے' سے کام لیتے ہوئے بعض یہودی فرقوں نے حضرت عُزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دے دیا۔ عیسائی اس سے بھی کئی قدم آگے بڑھ گئے، اور انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا ہی نہیں خود خدا، یعنی خدا کا اوتار، ٹھیرا دیا۔ قرآن مبین نے اِن سب لوگوں کے بارے میں اللہ تعا کا یہ فیصلہ سنایا، اور واضح و صریح لفظوں میں سنایا کہ یہ ظالم ہیں، کافر ہیں، ضال ہیں، مغضوب ہیں۔ اس واضح فیصلے کے سنانے کا ایک منشا یہ بھی تھا کہ نبی آخر الزماں ؐ کی امت عقیدۂ توحید کی حرمت کے بارے میں پوری طرح چوکنی رہے۔ مگر افسوس، اس کے باوجود امت کا ایک طبقہ نچلا نہ بیٹھ سکا، اور جاہلیت نے اس سے "لَتَتَّبِعُنَّ سُنَنَ مَنْ قَبْلَكُمْ" کا بھرپور مظاہرہ کرا کے دم لیا۔ اس سے کھلے عام کہوا دیا کہ چاہے دوسرے سارے رسول بشر رہے ہوں، مگر ہمارا رسول بشر نہیں تھا! اور جو اسے بشر کہے وہ مسلمان نہیں! حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اگر بشر نہیں تھے تو کیا تھے؟ اس سوال کا جواب اِس غالی فرقے کا یہ ہے کہ 'وہی جو عرش پر خدا ہو کر مستوی ہے، مدینے میں مصطفےٰ ہو کر اُتر پڑا تھا'۔ اس جواب پر قرآن کی روح تڑپ اٹھے تو تڑپ اٹھے، اور اسلام کی آنکھیں خون کے آنسو روئیں تو رویا کریں۔ جاہلیت اور شیطان کی جو سب سے بڑی تمنا ہو سکتی تھی، وہ تو پوری ہو گئی۔

یہ تو جاہلیت کی وہ کارستانی تھی جو اس نے توحیدِ خالص کے داعیؐ اکبر کی عقیدت میں غلو کا سبق پڑھا کر دکھائی۔ صلحائے امت اور بزرگانِ دین کی عقیدت کے ساتھ بھی

---

[1] اقتضاء الصراط المستقیم ص۲۱۷۔

اس نے قریب قریب ایسا ہی کھیل کھیلا۔ جاہل عوام کا تو خیر کہنا ہی کیا۔ خواص اور ارباب علم و مشیخت کا کچھ حال سنیے :۔

۱۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور دیگر ائمۂ اہلِ بیت کے بارے میں کئی ایک شیعی فرقوں کی، اِن حضرات کے ساتھ، غلوئے عقیدت کی مختصر داستان ابھی آپ پڑھ چکے ہیں، کہ کس طرح انہوں نے انہیں خدائی کا درجہ دے دیا تھا۔

۲۔ اکابر صوفیہ تک میں ایسے لوگ گذرے ہیں جن کا کہنا تھا کہ "نماز کے لیے کعبہ عوام کا قبلہ ہے اور فلاں شیخ کی قبر کی طرف رخ کر کے، کعبہ کی طرف پشت ہونے کے باوجود، نماز کا پڑھنا خواص کا قبلہ ہے" [۱]

۳۔ کہنے والوں نے یہاں تک کہہ ڈالا کہ "کسی نبی یا کسی شیخ یا کسی اہل بیت کی قبر پر بنے ہوئے مشاہد کی زیارت بیت اللہ الحرام کے حج سے افضل ہے، اور اِس زیارت کو وہ حجِ اکبر، کہتے تھے" [۲]

۴۔ امت میں وہ لوگ بھی پیدا ہوئے جو قبروں میں مدفون اشخاص سے یہ التجاء کیا کرتے کہ "اے میرے فلاں آقا! مجھے بخش دیجیے، مجھ پر رحم فرمائیے، اور مجھ پر نظرِ کرم کیجیے" یا یہ درخواست کرتے کہ "میرا قرض اتار دیجیے، فلاں کے مقابلے میں میری مدد فرمائیے، میں آپ کی حفاظت اور آپ کے سایہ میں ہوں" [۳]

دینی شخصیتوں سے آگے بڑھ کر دنیوی شخصیتوں کی طرف چلیے تو ان کے سلسلے میں بھی صورتِ حال بڑی افسوس ناک دکھائی دے گی۔ دینی شخصیتوں کو جہاں خدائے واحد کے جیسے حقوقِ پرستش دیے گئے، وہاں بادشاہوں اور بڑے قومی لیڈروں لیے بھی خدا کے جیسے حقوقِ قانون سازی اور حقوقِ حکمرانی تسلیم کر لیے گئے۔ اور اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰہِ کا منصوص عقیدہ بس لفظوں کی حد تک عقیدہ باقی رہ گیا پھر غیر اللہ کی ایسی تعظیم و تکریم بھی، جس کے ڈانڈے عبودیت سے جا ملیں، کچھ دینی شخصیتوں ہی کے لیے مخصوص نہیں رہی بلکہ ایک حد تک دنیوی شخصیتوں

---

[۱] اقتضاء الصراط المستقیم ص ۲۱۸۔ [۲] ایضاً ص ۱۸۳۔ [۳] ایضاً ص ۲۱۷۔

کو بھی اس میں شریک کر لیا گیا۔ بادشاہوں کو تعظیمی سجدے کرنے یا ان کے سامنے رکوع کی سی ہیئت میں جھک پڑنے کا قدیم رواج اس حقیقتِ واقعی کی سب سے نمایاں مثال ہے۔ اب یہ رواج تو غالباً کہیں بھی باقی نہیں رہ گیا ہے، مگر اس کی 'روح' ابھی تک کچھ نہ کچھ برقرار ہے، اور 'بڑے' لوگوں کے استقبال کے وقت یا ان کے دربار میں حاضری کے موقع پر اس کا ثبوت ملتا رہتا ہے۔

مختلف حلقوں اور طبقوں کے یہ سارے علمی رویے اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ اسلامی عقیدۂ توحید پر جاہلیت نے ہر طرح کے حملے کیے۔ خدائے وحدہٗ لاشریک کی ذات، اس کی صفات، اس کے اختیارات اور اس کے حقوق میں سے کسی ایک کو بھی نہیں چھوڑا، ہر چیز کو نشانہ بنایا، اور ان کے بارے میں بے شمار لوگوں کے عقائد اور تصورات بدل کر رکھ دیے۔

۲۔ عقیدۂ آخرت پر

آخرت کا عقیدہ دینی زندگی اور خدا پرستی کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنی کہ جسم کے لیے روح ضروری ہوتی ہے۔ یہ اگر زندہ و توانا ہو تو آدمی اسلام کی جیتی جاگتی تصویر بن جاتا ہے، اور اگر اس عقیدے میں خرابی آجائے تو نہ ایمان سلامت رہ جاتا ہے نہ عمل کی خیر رہتی ہے۔ جاہلیت اسلام کے اتنے اہم محاذ کو کیسے نظر انداز کر دے سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے اسے ڈائنامیٹ کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ فلسفے اور تصوّف کے حلقوں میں اسے خاصی کامیابی ملی۔ مسلمان فلاسفہ کے ایک گروہ نے یہ خیال ظاہر کیا کہ دوزخ میں عذاب دیے جانے کا کوئی حاصل نہیں ہے، اس لیے دوزخ اور عذابِ نار کا فی الواقع کوئی وجود بھی نہیں ہے۔ قرآن مجید میں اس کا جو بار بار ذکر کیا گیا ہے، وہ محض لوگوں کو دہشت زدہ کرنے کے لیے کیا گیا ہے، تاکہ وہ ڈر کر برائیوں سے دور رہیں۔ اسی طرح صوفیا کے حلقوں میں ایسے لوگ بھی پائے گئے جن کی زبان سے سُکر اور وجد کے عالم میں اس طرح کے الفاظ نکلتے رہے کہ میرا کوئی مرید دوزخ میں نہ جائے گا۔ ان بزرگوں کی یہ باتیں تو فی الواقع شطحیات کی نوعیت کی تھیں، اور اس قابل نہ تھیں کہ ان کو کوئی اہمیت دی جاتی، نہ اہلِ علم نے کوئی اہمیت دی۔ لیکن یہ ممکن نہ تھا کہ زود اعتقاد عوام پر بھی ان کا کوئی اثر نہ ہوتا۔ ان فلاسفہ اور صوفیا کے علاوہ مُرجِئہ فرقے کا عقیدۂ مغفرت بھی اس سلسلے

میں کچھ کم قابلِ ذکر نہیں ہے، جس نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ مغفرت کے لیے ایمان کافی ہے، عمل کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر آدمی کے اندر سچا ایمان موجود ہو تو کوئی بھی معصیت اس کی عاقبت کو خراب نہیں کر سکتی۔ اللہ تعالیٰ لوگوں کی بخشائش کا فیصلہ صرف ان کے ایمان کی بنیاد پر کرے گا، عمل کی بنیاد پر نہیں۔ اِن سارے خیالات نے امت کے عوام پر، جو بالعموم مغفرت کے آسان نسخوں کی طلب اور جستجو رکھتے ہیں، جو غلط اثر ڈالا ہو گا اس کا اندازہ کر لینا چنداں دشوار نہیں۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ جاہلیت کی دراندازیاں عقیدۂ آخرت کے باب میں بھی کچھ کم کامیاب نہیں رہیں۔

یہ تو اسلام کے تینوں بنیادی عقائد — توحید[۱]، آخرت[۲] اور رسالت[۳] — کے بارے میں امت کا ظاہری حال تھا۔ اس کی اندرونی حالت بھی کچھ کم دگرگوں نہیں۔ جاہلیت جن لوگوں کے عقائد میں خلل نہ پیدا کر سکی اور وہ ان تینوں چیزوں کے بارے میں ویسا ہی اعتقاد رکھتے رہے جیسا رکھا جانا چاہیے، اُن میں سے بھی بہتوں کو اس نے ایک اور طرف سے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ انہیں دنیا کا ایسا دلدادہ بنا ڈالا کہ وہ ایک طرف تو زبان سے ان عقیدوں کا اظہار کرتے رہے، دوسری طرف ان ایمانیات کے عملی اور اخلاقی مطالبات سے دور ہٹتے گئے۔ اللہ کا نام زبانوں پر تو بار بار آتا، مگر اس پر ایمان رکھنے کا عملی مظاہرہ شاذ و نادر ہی ہوتا۔ آخرت کا تذکرہ بھی کم نہ رہتا، مگر اس میں یقین کی جھلک مشکل ہی دکھائی دیتی۔ رسالت کی تصدیق کے اور رسول ؐ کی ذات سے محبت کے دعوے بھی بلند بانگ ہوتے، مگر آپؐ کی اصل سنّت اور آپؐ کے حقیقی مشن سے غفلت بڑھتی رہی۔ اِس طرح اُن پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشین گوئی صادق آتی گئی کہ ایک وقت آئے گا جب اسلام کا صرف نام اور ظاہری نشان ہی باقی رہ جائے گا، روح اس سے نکل چکی ہو گی۔ اسلام کے تینوں بنیادی ستونوں کو یوں ہلا کر رکھ دینا جاہلیت کی ایسی کامیابی ہے جسے معمولی نہیں کہا جا سکتا۔

۴- دین کی اقدامی روح پر

یہ تو اسلامی عقائد اور دین کی بنیادوں پر جاہلیت کے حملوں کا حال رہا۔ اب

جہاں تک اسلامی افکار و تصورات کا معاملہ ہے، ان سے بھی وہ کبھی غافل نہیں رہی، اور جیسے جیسے موقع ملتا گیا ایک ایک کے خلاف مورچے قائم کرتی چلی گئی۔ سب سے پہلا مورچہ اس نے دین کی اقدامی روح کے خلاف قائم کیا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے عین بعد عہدِ صدیقی کے دوران ہی میں قائم کیا۔ دین کی اقدامی روح، کا عملی مظہر وہی چیز ہے جسے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کہا جاتا ہے۔ جاہلیت نے کچھ لوگوں میں یہ ذہن پیدا کرنا شروع کر دیا کہ آدمی کو اپنی ذات کی فکر رکھنی چاہیے، اُسے یہ دیکھنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ دوسروں کی دینی اور اخلاقی روش کیسی ہے؛ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کو جب یہ اندازہ ہوا کہ کچھ لوگوں کے سوچنے کا انداز یہ بن رہا ہے تو انہوں نے ان کی فکری اصلاح کے لیے ایک تقریر کی اور فرمایا:-

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّكُمْ تَقْرَءُونَ هٰذِهِ الْآيَةَ "يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ"، وَإِنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَقُوْلُ "إِنَّ النَّاسَ إِذَا رَأَوُا الظَّالِمَ فَلَمْ يَأْخُذُوْا عَلٰى يَدَيْهِ أَوْشَكَ أَنْ يَّعُمَّهُمُ اللهُ بِعِقَابٍ مِّنْهُ"۔[1]	لوگو! تم قرآن کی یہ آیت "یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا عَلَیْکُمْ أَنْفُسَکُمْ الخ" (اے ایمان والو! اپنی ذات کی فکر رکھو الخ) پڑھتے رہتے ہو تو اس کے پڑھتے وقت یہ بات یاد رکھنا کہ، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ "جب لوگ ظالم کو (ظلم کرتے) دیکھیں اور اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو قریب ہوگا کہ اللہ تعالیٰ سبھی کو اپنے عذاب کی گرفت میں لے لے۔

جناب صدیق رضؓ کے فرمانے کا منشا یہ تھا کہ آیتِ مذکورہ اہلِ ایمان کو دین کے مخالفوں کی طرف سے اطمینان دلانے کے لیے نازل ہوئی تھی، اور انہیں یہ سمجھانا چاہتی تھی کہ اگر تم ہدایت کی راہ پر مضبوطی سے جمے رہے تو اسلام کے دشمنوں کی معاندانہ کارروائیوں اور ریشہ دوانیوں سے تمہیں ہراساں رہنے کی مطلق ضرورت نہیں۔ تمہارے خلاف ان کی کوششیں ہرگز کامیاب نہ

---

[1] ترمذی۔ جلد دوم۔ باب ما جاء فی نزول العذاب اذا لم یغیر المنکر۔

ہو سکیں گی۔ لہٰذا تمہیں اپنی تمام تر توجہ اپنی راست روی پر اور اللہ سے اپنے تعلق کی استواری پر مرکوز رکھنی چاہیے۔ آیت کا منشا اور مدعا تو یہ تھا۔ مگر تم نے غلطی سے اس کا مطلب یہ سمجھ لیا ہے کہ اگر ہم خود ہدایت کی راہ پر رہے تو دوسروں کی غلط روی نہ ہمیں کوئی نقصان پہنچا سکتی ہے، نہ اس کے بارے میں ہم کو فکر مند ہونے کی ضرورت ہے اور نہ انہیں اس سے باز رکھنے کی ہم پر کوئی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ لوگوں کو معروف کی تلقین کرتے رہنا اور منکرات سے روکتے رہنا ایک مسلمان کے فرائض میں شامل اور اس کے دین و ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ اس تقاضے کی طرف سے بے فکر ہو رہنا خدا کے عذاب کو دعوت دینا ہے۔

یہ پہلی کوشش تھی جو جاہلیت نے دین کی اقدامی روح کے خلاف کی تھی، مگر حضرت ابوبکرؓ کی بروقت توجہ اور تنبیہہ نے اسے یکسر ناکام بنا کر رکھ دیا۔ لیکن اس کی یہ ناکامی ہمیشہ کے لیے نہ تھی، اور نہ ہو سکتی تھی۔ اسے اطمینان تھا کہ جب یہ خیر القرون ختم ہو گا، اور ملت اسلامیہ میں ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ جیسے مینارِ ہدایت باقی نہ رہ جائیں گے، اس وقت اس کے دن پھر کر رہیں گے، اور آج کی ناکامی کل کامیابی سے بدل جائے گی۔ تاریخ گواہ ہے کہ اس کا یہ اطمینان غلط نہ تھا۔ چنانچہ جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا، امر بالمعروف کا احساس مدھم پڑتا گیا۔ اس محاذ پر جاہلیت نے آج تک جتنی کامیابیاں حاصل کی ہیں، وہ ہم سب کے سامنے ہیں۔ یقیناً انہیں غیر معمولی ہی کہا جا سکتا ہے۔ امر بالمعروف کے ابتدائی اور محدود مفہوم کی حد تک تو اس فریضے کی ادائی بہت کچھ ہوتی چلی آ رہی ہے، مگر جہاں تک اس کے پورے مفہوم کا تعلق ہے، جسے شہادت علی الناس کہتے ہیں اور جو اس ملت کا اصل منصبی فریضہ تھا، اس کی ادائی کا حال ایک طویل مدت سے سخت مایوس کن رہا ہے۔ یہاں وہاں کی چند مقامی اجتماعی کوششوں کے سوا، جنہیں جاہلی طاقتوں نے کامیاب نہ ہونے دیا، ہر طرف سناٹا چھایا رہا۔ البتہ ادھر کوئی نصف صدی سے، اللہ کا شکر ہے کہ، اس فرض کے احساس میں قابلِ لحاظ گرمی آئی ہوئی ہے، اور کامیابی کی طرف قدم بڑھتے نظر آ رہے ہیں۔ مگر ابھی اس کا تناسب کسی بڑے سمندر میں ابھرتے ہوئے چند چھوٹے چھوٹے ایسے جزیروں کے وجود سے زیادہ نہیں ہے جنہیں اس سمندر کی غضبناک موجیں ہر وقت نگل لینے کے درپے رہا کرتی ہیں۔ لہٰذا مجموعی صورتِ حال

کو اب بھی تشویش ناک ہی کہا جائے گا، اور تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس محاذ پر جاہلیت کی بالادستی بڑی حد تک ابھی برقرار رہی ہے۔

۵۔ ملّی وحدت پر

جاہلیت کا پانچواں کامیاب حملہ ملتِ اسلامیہ کی وحدت پر ہوا، اور افسوس کی بات یہ ہے کہ اس کا آغاز خلافتِ راشدہ کے دوران ہی میں اُس وقت ہو گیا تھا جب حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ ملت کی سربراہی فرما رہے تھے۔ ہوا یہ کہ جاہلیت کے زیرِ دام آ جانے والے ایک گروہ کو بیرونی دشمنوں نے اپنا آلۂ کار بنا لیا، اور ان ظالموں نے کچھ شکایتوں کی آڑ لے کر حضرت عثمان رضؓ سے خلافت کا منصب چھوڑ دینے کا مطالبہ کر دیا۔ ہو سکتا ہے کہ نرم مزاج حضرت عثمان رضؓ معاملے کو فتنہ بن جانے سے روکنے کے لیے اِس مطالبے کو مان بھی لیتے۔ مگر آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہدایت اور تاکید یاد تھی کہ "توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ایک قمیص پہنائے گا، سو اگر کچھ لوگ تم سے اس قمیص کے اتار دینے کو کہیں تو ان کی خاطر اسے اتار نہ دینا" (یَا عُثْمَانُ اِنَّهٗ لَعَلَّ اللّٰهَ یُقَمِّصُكَ قَمِیْصًا فَاِنْ اَرَادُوْا عَلٰی خَلْعِهٖ فَلَا تَخْلَعْهُ لَهُمْ [۱]) اس لیے آپ رضؓ نے اس مطالبے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ظالموں نے گھات لگا کر ایک دن آپ کو، جب آپ قرآن کریم کی تلاوت فرما رہے تھے، شہید کر دیا۔ یہ کسی اور کا نہیں، عثمان رضؓ ذی النورین کا خون تھا۔ اس لیے امّت کے حق میں، اِک گونہ، ناقۂ صالح ؑ کا خون بن گیا۔ اس المناک حادثے سے ملی وحدت کی چولیں ہل کر رہ گئیں۔ جس ملّت کے افراد کو ہدایت تھی کہ اپنے کسی بھائی کی طرف کھلے ہتھیار سے اشارہ تک نہ کریں، [۲] ان کی تلواریں ایک دوسرے کے خلاف نیام سے باہر نکل آئیں، اور پھر کبھی نیام میں واپس نہ گئیں۔

خلیفۂ چہارم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں اس فتنۂ انتشار نے ایک اور روپ میں سر اٹھایا۔ بنی اُمیّہ کے بہت سے لوگوں نے ان سے مطالبہ کیا کہ حضرت

۱؎ ترمذی۔ جلد دوم۔ باب مناقب عثمان رضؓ۔ ۲؎ بخاری، جلد دوم۔ کتاب الفتن۔

عثمان رضؓ کے خونِ ناحق کا قصاص لیا جائے۔ بات بڑھتی گئی، اور مسلمان باہم صف آرا ہو گئے۔ صِفّین کی ہولناک جنگ میں جب نوے ہزار قیمتی جانیں ضائع ہو گئیں تب صلح کی تجویز سامنے آئی اور دو اصحاب کو حَکَم (ثالث) بنا دیا گیا۔ حضرت علی رضؓ نے اس کی منظوری دے دی، اور جاہلیت نے اپنی کارستانی کے لیے موقع نکال لیا۔ خود حضرت علی کے حامیوں ہی میں سے اس کے بہت سے شاگرد اٹھ کھڑے ہوئے، اور انہوں نے آنجناب کی اس منظوری کو قرآن کے خلاف قرار دے دیا۔ اپنے اِس احمقانہ دعوے پر وہ اس درجہ مصر رہے کہ بالآخر ملّت کا ایک بازو کٹ کر الگ ہو گیا، اور 'خوارج' کے نام سے ایک مستقل فرقہ وجود میں آ گیا۔ دوسری طرف حضرت علی رضؓ کے غالی حامیوں نے آگے چل کر اپنے لیے ایک نئی راہ پیدا کر لی، اور رفتہ رفتہ 'شیعیانِ علی' کا ایک اور فرقہ بن گیا۔ یہ خوارج اور یہ شیعیانِ علی، دونوں اپنے اپنے راستے پر اتنا آگے جا بڑھے کہ جیسے امتِ مسلمہ سے الگ نئی امتیں وجود میں آ گئی ہوں۔ یہ لوگ اپنے کو چاہے جو بھی خیال کرتے رہے ہوں، مگر یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ ان کے رویّے نے جاہلیت کی ایک بڑی آرزو پوری کر دی۔

پھر جوں جوں زمانہ گذرتا گیا، یہ ملّی تفرقہ برابر بڑھتا ہی گیا۔ ایک ملّت نہ جانے کتنی 'ذیلی' ملّتوں میں بٹ گئی۔ فرقے پر فرقے بنتے چلے گئے، اور پھر ایک ایک فرقہ کے بھی کئی کئی فرقے بن گئے۔ یہ تفرقے مذہبی بھی تھے اور سیاسی بھی تھے۔ آج ملّتِ اسلامیہ کا انتشار و افتراق جس حد کو پہنچ چکا ہے، اس کی وضاحت کی کوئی ضرورت نہیں۔ اپنی ملی تاریخ کے صفحات پلٹتے جائیے اور ان رنگا رنگ تفرقوں کا منظر دیکھتے جائیے۔ اور ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی ذہن میں تازہ رکھیے کہ یہ اس امت کی تاریخ ہے جو ایک خدا، ایک پیغمبر اور ایک کتاب پر ایمان رکھتی ہے، یا ایمان رکھنے کی مدعی ہے۔ صاف نظر آ جائے گا کہ جاہلیت نے اپنے اس حملے میں کامیابی کا ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔

۶۔ نظامِ خلافت پر

نظامِ خلافت کے جو مقاصد اور جو سیاسی اصول اسلام نے مقرر کیے تھے، خلافتِ

راشدہ کا چالیس سالہ دور ختم ہونے پر وہ سب بھی جاہلیت کی زد میں آگئے، اور، جیسا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی فرمادی تھی[1] خلافت ملوکیت میں تبدیل ہو کر رہ گئی۔ اگرچہ سیاسی مصلحت اور ضرورت کی وجہ سے نام 'خلافت' اور 'خلیفہ' کے برقرار رہے اور مملکت کا عام قانون بھی اسلامی شریعت ہی پر مبنی رہا۔ کیونکہ اس کے بغیر حکومت کا اقتدار باقی ہی نہ رہ سکتا تھا، اور اپنی تمام تر دینی کمزوریوں کے باوجود عوام کسی اور نظام اور قانون کو ہرگز برداشت نہ کرتے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جاہلیت نے 'حسین' کی جگہ 'یزید' کو لا کر میدان بڑی حد تک سر کر لیا۔ خلافت کی روح پر تو سکرات کی سی کیفیت طاری ہو رہی، اور اس کے سیاسی اصول بھی بری طرح توڑ کر رکھ دیے گئے۔ خلفاء کا تقرر انتخاب کے بجائے وراثت کی بنیاد پر ہونے لگا۔ ولی عہدی کی سنت چل پڑی۔ استحقاقِ خلافت کے لیے صالحیت کوئی شرط نہیں رہ گئی، اور صلاحیت کو بھی ثانوی حیثیت دے دی گئی۔ سب سے اہم اور فیصلہ کن چیز حکمرانوں کی اپنی ذاتی پسند اور خواہش تھی۔ پھر آگے چل کر مملکت کے نظم و نسق میں بھی عجم کی تقلید ہونے لگی۔ خزانے بھرنے کے لیے بعضوں نے نومسلموں پر بھی جزیہ لگا دیا۔ بیت المال کے صَرف کی مدّات میں حکمرانوں کے ذاتی مصارف کو سب سے نمایاں اہمیت مل گئی۔ بعض اوقات تو ایوانِ خلافت پر شداد کے محل کا دھوکا ہوتا۔

اسلامی سیاست اور طرزِ حکومت میں اتنا افسوسناک تغیر بڑی حد تک تو ابتدائی صدیوں ہی میں آگیا تھا۔ بعد میں اس کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ نام کی حد تک تو اموی، عبّاسی اور عثمانی خلافتیں قائم ہوتی رہیں، اور ان کے کئی ایک خلفاء، نیک نفس اور باکردار بھی تھے، جنھوں نے بہت سے اچھے کام کیے حتیٰ کہ انہی میں عمر بن عبدالعزیزؒ جیسے مردِ مومن اور خلیفۂ راشد بھی تھا۔ پھر یہ بات بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتی کہ نام ہی کے سہی، اِس سلسلۂ خلافت کے دم سے اسلامی نظامِ حکومت کا ڈھانچہ برقرار رہا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود خلافت کے نام پر ظالم ملوکیت (ملک عَضوض) کا قیام اسلام کے لیے ایک ناشدنی ہی کہا جائے گا۔

---

[1] ترمذی۔ جلد دوم۔ کتاب الفتن۔

اس منحوس سیاسی تغیر نے اسلام کے سیاسی نظام کی روح اور اس کے قالب، دونوں کو بدل کر رکھ دیا۔

اسلامی نظامِ خلافت پر جاہلیت کا حملہ ایک اور رخ سے بھی ہوا۔ یہ نظام در اصل حکومت کا ایک عالمی نظام، یا یوں کہیے کہ تمام مسلم ممالک کا متحدہ وفاقی نظام ہے، جس کے تمام اجزاء ایک مرکز سے وابستہ ہوں۔ یہ صورتِ حال ایک مدت تک تو برقرار رہی۔ مگر بعد کے ادوار میں اس پر بھی افتاد پڑ گئی۔ دنیا کے مختلف حصوں میں مختلف مسلمان قوموں اور گروہوں نے اپنی اپنی الگ آزاد حکومتیں قائم کر لیں۔ کچھ دنوں تک تو اس طرح کی آزاد و خودمختار حکومتوں میں سے کچھ نے مرکزِ خلافت کی رسمی سربراہی تسلیم کر رکھی تھی۔ ان کے ہاں جب کوئی نیا حکمراں تخت پر بیٹھتا تو مرکزِ خلافت سے اس کا باضابطہ تقرر نامہ منگوایا جاتا۔ مگر دوسری حکومتیں اس تکلف کی بھی روادار نہ رہیں، اور ہر حیثیت سے آزاد و خودمختار بنی رہیں۔

مسلمانوں کے سیاسی تفرقوں کی یہ داستان اتنے ہی پر ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ اس کا سلسلہ دراز سے دراز ہوتے ہوتے اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ خلافتِ عثمانیہ کی بساط کو جب غیروں کے دباؤ اور اپنوں کی ایمانی بے حسی نے لپیٹ کر رکھ دیا تو سارے مسلمانوں کی سیاسی وحدت کا تصور تک بھولا بسرا بن کر رہ گیا، اور اب صورتِ حال یہ ہے کہ ہر مسلم ملک، چاہے اس کی آبادی چند لاکھ ہی کیوں نہ ہو، ایک مستقل قومیت کا حامل، اور ایک مستقل حکومت کا علمبردار بنا ہوا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ اہلِ اسلام، جنہیں ایک نظامِ خلافت کے جھنڈے تلے اکٹھا رہنا چاہیے تھا، تقریب قریب ساڑھے تین درجن چھوٹی چھوٹی مستقل مقامی حکومتوں میں بٹ کر رہ گئے ہیں۔ اور یہ سب کچھ محض مقامی قومیتوں کے شوقِ خودمختاری اور جذبۂ فرمانروائی کا کرشمہ ہے۔ حالانکہ اسلام نے مختلف ممالک کے مسلمانوں کی مقامی قومیتوں کو ذیلی حیثیت دی تھی، مستقل حیثیت کسی کی بھی تسلیم نہیں کی تھی۔ مستقل بنائے قومیت، سارے مسلمانانِ عالم کی، اس نے صرف اپنے کو قرار دیا تھا، اور باقی سبھی قبائلی، قومی، وطنی، نسلی اور لسانی رشتے اس بنیادی رشتے کے ماتحت تھے۔ مگر جاہلیت کا اقبال دیکھیے کہ اسلام کی پیروی کا دعویٰ رکھنے والوں نے تقلیدِ فرنگ کے جوش میں اس ترتیب کو الٹ کر رکھ دیا۔ ذیلی قومیتوں کے

رشتے اصل بنیاد بن گئے، اور دینی رشتے کو ثانوی حیثیت دے دی گئی۔ اس کے نتیجے میں ایک ملت بے شمار ٹکڑوں میں بٹ کر رہ گئی، اور قریب قریب ہر ٹکڑا بے وزن ہو رہا۔ کیا کوئی شخص اِن کٹے پھٹے چھوٹے چھوٹے بے وزن ٹکڑوں کو دیکھ کر یہ سوچ بھی سکتا ہے کہ یہ ایک ایسی ملّتِ متحدہ کے اجزاء ہیں جسے اپنی اصل حیثیت کے اعتبار سے ایک رشتہ میں پرویا ہوا، ایک نظامِ خلافت کے تحت باہم جڑا ہوا اور ایک خلیفۂ راشد کے زیرِ حکومت جسدِ واحد ہونا چاہیے تھا۔ لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ خود فراموش ملّت اپنی حالت پر نظر نہیں ڈالتی۔ وہ اتنا بھی سمجھنے کے لیے تیار نہیں کہ بے وزنی یا ضعیفی ایسا جرم ہے جس کی سزا ذلت اور سرافگنی کے سوا اور کچھ نہیں ہوا کرتی۔ مختلف مسلم ملکوں کو اس کا ذاتی تجربہ ہو بھی چکا ہے، مگر جاہلیت کے سحر نے انہیں ایسا مسحور کر رکھا ہے کہ اتنے برے دن دیکھ لینے کے بعد بھی انہیں خلافت کے نظام کی یاد نہیں آتی۔ اور اگر اللہ کے کچھ بندے انہیں اِس نسخۂ شفا کے استعمال کی ترغیب دیتے اور تلقین کرتے ہیں تو ان کے منہ کا مزا خراب ہو جاتا ہے۔ حد یہ ہے کہ مصر کے ایک 'روشن خیال' صاحب قلم علی عبد الرزاق نے اپنی کتاب "الاسلام واصول الحکم" کے اندر یہ لکھ ڈالنے میں بھی کوئی شرم محسوس نہ کی کہ "خلافت، حکومت کے لیے اسلامی طریقہ نہیں[1]"

۷۔ کلمۂ حق کہنے کی آزادی پر

خلافت کے ملوکیت میں تبدیل ہو جانے کے بعد صرف یہی نہ ہوا کہ اسلام کے سیاسی شعبہ میں جاہلیت کی رسی دراز ہو گئی، بلکہ ساتھ ہی حق گوئی کے گلے میں پھندا بھی پڑ گیا۔ جو اس نامبارک تبدیلی کا فطری نتیجہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ 'حسین' کی جگہ 'یزید' کے آ جانے سے دو 'کربلا' برپا ہو گئے۔ ایک[1] کربلا تو وہی جو عام طور سے معروف ہے۔ دوسرا[2] ظالم و جابر ملوکیت کا قیام کی شکل میں برپا ہوا۔ پہلے میں نواسۂ رسول کا خونِ ناحق بہا، اور دوسرے میں سچائی کی جان پر آ بنی۔ اس ظالم ملوکیت کے جبر و قہر کا یہ عالم تھا کہ لوگ اس کے سامنے سچی بات کہنے کی جرأت

---

[1] بحوالہ "فکری یلغار" ڈاکٹر عبد الصبور مرزوق کی تصنیف 'الغزو الفکری' کا اردو ترجمہ ص ۱۳۳۔

بمشکل ہی پاتے۔ جس دین نے حق بات کہنے کی اپنے پیروؤں کو اتنی آزادی دی تھی کہ عمر فاروق رضؓ جیسے بارعب خلیفہ کو بھی برسرِ عام ایک بڑھیا ٹوک دینے میں کوئی جھجک محسوس نہ کرتی، اسی دین کے ماننے والوں کا یہ حال کر دیا گیا کہ بات ان کے سینوں میں بھنچ کر رہ جاتی اور وہ اس کے ظاہر کرنے کا یارا نہ پاتے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے پوتے محمد بن زید بن عبداللہ کا بیان ہے کہ:۔

قَالَ اُنَاسٌ لِعَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اِنَّا نَدْخُلُ عَلٰى سَلَاطِيْنِنَا فَنَقُوْلُ لَهُمْ بِخِلَافِ مَا نَتَكَلَّمُ اِذَا خَرَجْنَا مِنْ عِنْدِهِمْ قَالَ كُنَّا نَعُدُّهَا نِفَاقًا[1]

کچھ لوگوں نے عبداللہ بن عمرؓ سے کہا کہ "ہم اپنے حکمرانوں کے پاس جاتے ہیں تو ان سے جو کچھ کہتے ہیں وہ اُن باتوں کے خلاف ہوتا ہے جنہیں ہم اُن کے پاس سے نکل آنے کے بعد کہتے ہیں"۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے یہ سن کر فرمایا کہ "(عہدِ نبوت میں) ہم اس طرزِ عمل کو منافقت شمار کیا کرتے تھے"۔

حد یہ ہے کہ اصحابِؓ رسول صلعم تک سے یہ جرأتِ کلام چھین لی گئی تھی، اور برسرِ اقتدار امویوں نے انہیں بھی اپنے جبر و استبداد کے شکنجے میں اس طرح کس لیا تھا کہ جو کوئی بھی اُن کے اِس قاہرانہ رویّے کے اور ان کی سیاسی بدعتوں کے خلاف آواز اٹھاتا ان کا منہ بند کر دیا کرتے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، جو ۵۸ھ یا ۵۹ھ تک باحیات رہے تھے اور جنہوں نے مروان کا زمانہ بھی پایا تھا، اپنے آخری ایامِ زندگی میں خود اپنی بے بسی کی بابت فرماتے ہیں:۔

حَفِظْتُ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وِعَائَيْنِ فَاَمَّا اَحَدُهُمَا فَبَثَثْتُهُ فِيْكُمْ فَاَمَّا الْاٰخَرُ فَلَوْ بَثَثْتُهُ قُطِعَ هٰذَا الْبُلْعُوْمُ[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے دو برتن (بھر کر) محفوظ کیے تھے۔ ان میں سے ایک کے اندر جو کچھ تھا اسے تو میں نے تم لوگوں میں پھیلا دیا لیکن دوسرے کے اندر کی چیز بس اگر پھیلاتا تو (میرا) یہ گلا کاٹ دیا گیا ہوتا۔

---

[1] بخاری، جلد دوم، باب مایکرہ من ثناء السلطان واذا خرج قال غیر ذلک۔ [2] بخاری، جلد اوّل باب حفظ العلم۔

اِس 'دوسرے برتن' سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمائے ہوئے وہ ارشادات ہیں جو آئندہ برسرِ اقتدار آنے والے حکمرانوں کے ناموں اور اُن کے مظالم کی صراحت پر اور انکی مذمت پر مشتمل تھے۔

اس جباریت کی ایک عملی مثال سنیے۔ حضرت عائذ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے گورنر عبید اللہ بن زیاد کو جب یہ نصیحت فرمائی کہ "اَیْ بُنَیَّ اِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ علیہ وسلم یَقُوْلُ اِنَّ شَرَّ الرِّعَاءِ الْحُطَمَۃُ فَاِیَّاکَ اَنْ تَکُوْنَ مِنْھُمْ" (بیٹے! میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ سب سے بُرے حکمراں وہ ہوتے ہیں جو لوگوں پر ظلم ڈھانے والے ہوں، سو دیکھنا تم ایسے حکمرانوں میں سے ہرگز نہ ہونا) تو ظالم نے جواب دیا:-

اِجْلِسْ فَاِنَّمَا اَنْتَ مِنْ نُخَالَۃِ اَصْحَابِ مُحَمَّدٍ صلی اللہ علیہ وسلم[1]

بیٹھ جاؤ، تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اُن اصحاب میں سے جو بھوسی چوکر کی حیثیت رکھتے تھے۔

اور اِس افسوسناک حالت کی آخری حد کا اندازہ بعض روایتوں سے کیجیے۔ حضرت ابو سعید خدری بیان کرتے ہیں کہ:-

صَلّٰی بِنَا رسولُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم یَوْمًا صَلٰوۃَ الْعَصْرِ بِنَھَارٍ ثُمَّ قَامَ خَطِیْبًا ...... وَکَانَ فِیْمَا قَالَ اَلَا لَا یَمْنَعَنَّ اَحَدَکُمْ ھَیْبَۃُ النَّاسِ اَنْ یَّقُوْلَ بِحَقٍّ اِذَا عَلِمَہٗ قَالَ فَبَکٰی اَبُوْسَعِیْدٍ فَقَالَ قَدْ وَاللّٰہِ رَاَیْنَا اَشْیَاءَ فَھِبْنَا ...[2] الخ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز کافی دن رہے (یعنی اول وقت) ہمیں عصر کی نماز پڑھائی، پھر آپ تقریر کرنے کھڑے ہو گئے..... اپنی اس تقریر میں آپ نے یہ بھی فرمایا کہ جب تم میں سے کسی کو کوئی حق بات معلوم ہو تو آدمیوں کا خوف اُسے اس بات کے کہنے سے ہرگز باز نہ رکھنے پائے۔ (حضرت ابو سعیدؓ سے یہ روایت سننے والا) راوی کہتا ہے کہ ابو سعیدؓ یہ بیان کرکے رو پڑے

---

[1] مسلم۔ جلد دوم۔ کتاب الامارۃ۔ [2] ترمذی۔ جلد دوم۔ باب ما اخبر النبی صلی اللہ علیہ وسلم اصحابہ بما ھو کائن الی یوم القیامۃ۔

اور فرمایا "بخدا ہم نے ایسی بہت سی چیزیں دیکھیں لیکن (انسانوں کا جبر و قہر دیکھ کر) زبان کھولنے سے ڈر گئے۔"

اسی طرح حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت ہے کہ:۔

..... اِنَّکُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَنْ تُبْتَلُوْا قَالَ فَابْتُلِیْنَا حَتّٰی جَعَلَ الرَّجُلُ مِنَّا لَا یُصَلِّیْ اِلَّا سِرًّا۔[1]

..... (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے کہا) "تمہیں نہیں معلوم کہ شاید تم آزمائشوں میں ڈالے جاؤ۔" حضرت حذیفہؓ نے (حضورؐ کا یہ ارشاد سنا کر) کہا ہم (واقعتہً) آزمائشوں میں ڈالے گئے اور اس آزمائش کی کیفیت یہ رہی کہ ہم میں سے بعض لوگ نماز بھی چھپ کر ہی پڑھتے۔

اندازہ کیجیے کہ ہیبت کی اس فضا کا اور حکام کی اس جابرانہ روش کا معاشرے کی اخلاقیات پر اور شریعت کی حرمت و بالادستی پر کتنا خطرناک اثر پڑا ہو گا۔

۸۔ دین اور عبادت کے جامع تصوّرات پر

اسلام کی آمد کا جو مقصود ہے وہ اس کے بغیر کسی طرح پورا نہیں ہو سکتا کہ اس کے جامع تصورِ دین اور اس کے جامع تصوّرِ عبادت پر غبار نہ آنے پائے۔ ان تصورات میں خلل آجانا اور ان کی وسعت و جامعیت کا محدودیت سے بدل جانا، دراصل رسولِ خدا کی بعثت اور قرآن کے نزول کی حقیقی غایت ہی کا نگاہوں سے اوجھل ہو جانا ہے۔ اس لیے یہ ممکن نہ تھا کہ جاہلیت ان کو ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت کر لیتی۔ چنانچہ اس نے خیر القرون کے ختم ہوتے ہی ان تصوّرات پر ہر طرف سے یلغار کر دی۔ اور یہ اس کی خوش نصیبی تھی کہ اسے اپنی اس مہم میں دنیاداروں ہی کا نہیں، بہت سے دین داروں کا بھی تعاون حاصل ہو گیا۔ اتنے کارگر تعاون

---

[1] مسلم۔ جلد اول۔ باب جواز الاستسرار بالایمان للخائف۔

کے بعد اس کی کامیابی کی رفتار تیز تر ہونی ہی چاہیے تھی۔ اس لیے یہ جو ملت کی بہت بڑی اکثریت دین اور عبادت کے ان وسیع تصورات سے ناآشنا سی ہو کر رہ گئی ہے، اسے خلافِ توقع ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ اس فکری زوال کے بڑے بڑے بنیادی اسباب چار تھے:۔

(۱) حکمرانوں کی اپنے اصل منصبی فرائض کی طرف سے بے پروائی۔

(۲) عوام کی دین سے ناواقفیت یا ادھوری واقفیت۔

(۳) بدعتوں اور بیرونی مذہبی رسوم کی مقبولیت۔

(۴) دینی حلقوں میں راہبانہ تصوّف کا نفوذ۔

آئیے ان باتوں کو ذرا تفصیل سے سمجھ لیں:۔

(۱) حکمرانوں کی بے پروائی:۔ اسلام نے مسلم فرماں رواؤں کے جو منصبی فرائض متعین کیے ہیں، ان میں سے چند کو اوّلین اہمیت حاصل ہے۔ یہ اوّلین اہمیت رکھنے والے فرائض اپنی نظیر آپ ہیں، کسی دوسرے نظامِ اجتماعی میں ان کا نام و نشان تک نہیں پایا جا سکتا۔ یہ فرائض قرآن کریم کی اس آیت میں بیان ہوئے ہیں:۔

....اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (حج۔ ۴۱)	.... اگر ہم ان (اہلِ ایمان) کو زمین میں اقتدار بخشیں گے تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے لوگوں کو معروف کا حکم دیں گے اور منکرات سے روکیں گے۔

اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے، نہ ہو سکتا ہے، کہ حکومت اور اربابِ حکومت کی جو معلوم و معروف انتظامی ذمہ داریاں ہوتی ہیں اور جن کا اس آیت میں بظاہر کوئی تذکرہ موجود نہیں ہے ــــ مثلاً امن و امان کی برقراری، ملک کی حفاظت، عدل و انصاف کی فراہمی، معاشی نظم و نسق اور فلاحی اداروں کا قیام وغیرہ ــــ یہ سب کام مسلم فرماں رواؤں کی منصبی ذمہ داریوں سے باہر ہیں۔ کیونکہ یہ تو وہ ذمہ داریاں ہیں جن کی انجام دہی ہر حکمراں کے لیے، خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، مسلمہ طور پر لازمی ہوتی ہی ہے۔ سوال کیا جا سکتا ہے کہ پھر آیتِ مذکورہ میں اِن ذمہ داریوں کو بھی کیوں بیان نہیں کیا گیا؟ جواب اس سوال کا یہ ہے کہ ان ذمہ داریوں

کو اگرچہ صراحت سے بیان نہیں کیا گیا ہے، مگر ان کا مجمل بیان آیت میں بہرحال موجود ہے۔ کیونکہ زکوٰۃ کی ادائی اور معروف کی تلقین اور منکرات کی روک تھام کی وسعتوں میں یہ سب کام بھی داخل ہیں۔ ان کی بات کو مجمل اس لیے رکھا گیا ہے تاکہ نماز[۱] کی اقامت، زکوٰۃ[۲] کی ادائی، امر[۳] بالمعروف اور نہی[۴] عن المنکر کے فرائض کی ممتاز حیثیت اور اولین اہمیت پوری طرح نمایاں رہے، اور ان پر حکمرانوں کی نظر برابر جمی رہے۔ یہ مدعا ہرگز حاصل نہ ہو پاتا اگر ان چاروں فرائض کو حکومتی ذمّہ داریوں کی کسی جامع فہرست کے ایک جزو کے طور پر بیان کر دیا جاتا۔

اسلامی حکومت کے اِن بنیادی اور اہم تر فرائض کو ذہن میں رکھیے، اور پھر خلافتِ راشدہ کے بعد کی سیاسی تاریخ پر نظر ڈالیے، تو صاف دکھائی دے گا کہ بعد کے اکثر 'خلفاء' اور حکمرانوں نے اپنے اقتدار کی حفاظت کو سب سے پہلی، اور اِن چاروں فرائض کی بجاآوری کو سب سے آخری اہمیت دی۔ اس صورتِ حال کے خلاف نہ تو کوئی عوامی احتساب حرکت میں آسکا، نہ خواص اور علمائے حق کی کچھ چل سکی۔ عوام خود دین کے حقیقی شعور سے کم و بیش بیگانہ ہوتے جا رہے تھے، اور خواص کی زبانوں پر تالے ڈال دیے گئے تھے، پھر اقتدار کے بھوکے حکمرانوں کو کون سیدھا رکھ سکتا تھا۔ امام ابن تیمیہؒ اس صورتِ حال کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"امراء نے بالعموم طرح طرح کے جابرانہ طریقے اختیار کر لیے۔ مثلاً رعایا کے مال کو ناجائز طریقوں سے لے لینا اور جرائم پر ایسی سزائیں دینا جن کا دینا جائز نہ ہوتا، کیونکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے شرعی فریضے کی ادائی میں وہ خود کوتاہی کے مرتکب تھے۔ ورنہ اگر وہ رعایا کا مال صحیح شرعی طریقے سے لیتے اور صحیح مصارف میں اسے خرچ کرتے، اور ایسا کرتے ہوئے انکی نگاہ اللہ کے دین کی اقامت پر رہتی، نہ کہ اپنی کرسیوں کی حفاظت پر، اِسی طرح اگر وہ جرائم کی شرعی سزائیں شریف اور وضیع، یگانے اور بیگانے سبھی پر نافذ کرتے، اور ان کی ترغیبی اور ترہیبی سبھی کارروائیوں سے

ان کا مقصد عدلِ شرعی کا قیام ہوتا۔ تو وہ نہ من مانے ٹکس لگانے کے ضرورتمند ہوتے، نہ جابرانہ سزائیں نافذ کرتے کے، اور نہ اپنے لیے غلاموں اور خادموں کے باڈی گارڈ رکھنے کے[1]"

یہ تو علماء و صلحائے امت کا احساسِ فرض تھا کہ انہوں نے اپنے طور پر دین و شریعت کی شمع حتی الوسع روشن رکھی، اور اپنے مقدور بھر لوگوں کو اسلام سے وابستہ رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ انفرادی کوششیں، ہزار درجہ قابلِ قدر ہونے کے باوجود، اُن نقصانات کی تلافی کسی طرح نہیں کر سکتی تھیں جو اہلِ اقتدار کے کرتوتوں اور ان کی غفلت شعاریوں اور فرض ناشناسیوں کی بدولت دین و ملت کو پہنچ رہے تھے۔

یہ چند صدی پہلے تک کا حال تھا۔ پھر جوں جوں زمانہ گذرتا گیا حالات کی خرابی بھی بڑھتی گئی، یہاں تک کہ اِس بیسویں صدی کے آتے آتے اس کی کوئی حد باقی نہیں رہ گئی ہے۔ خلافت کا رہا سہا جو نظام عثمانی خلافت کے نام سے قائم چلا آ رہا تھا، ایک نام نہاد "غازی، (مصطفیٰ کمال) کے ہاتھوں حرفِ غلط کی طرح مٹا کر رکھ دیا گیا! اس کے بعد منطقی طور پر خلافت یا اسلامی حکومت کے اِن بنیادی فرائض (اقامتِ صلوٰۃ اور امر بالمعروف وغیرہ) کی ادائی کا سوال از خود خارج از بحث ہو کر رہ گیا۔ اور جب بات یہاں تک پہنچ گئی تو دین و عبادت کے اسلامی تصوّرات کی جامعیت کو ماضی کا افسانہ بن ہی جانا چاہیے تھا۔ آج کے بیشتر مسلم فرمانروا اِن تصورات کے بارے میں جو خیالات رکھتے ہیں، اس سے کون ناواقف ہوگا۔ یہ تصورات ایک مکمل اسلامی حکومت کے وجود کو لازم ہیں۔ مگر ان لوگوں کی زبان سے اسلامی حکومت کا نام، اور ان کے ذہن سے اسلامی حکومت کا خیال اس طرح غائب ہو چکا ہے۔ گویا اس طرح کی کسی چیز کا کبھی وجود ہی نہیں رہا ہے۔ ان کے سامنے جب کبھی اسلامی حکومت کی بات رکھی جاتی ہے تو انہیں اپنا دماغی توازن برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ان کو اتنا بھی گوارا نہیں ہوا کہ اسلام غریب کو اپنے مسلمان ملک کا سرکاری مذہب ہونے کی نمائشی حیثیت ہی دے دیتے۔

---

[1] اقتضاء الصراط المستقیم ص ۱۳۵۔

خوف یہ تھا کہ آئین کی یہ نمائشی دفعہ کبھی عوام کے اندر اسلامی نظام کی ہوک نہ پیدا کر دے، اور شرم یہ تھی کہ صاحب بہادروں کو منہ کیسے دکھایا جاسکے گا۔ ان حکمرانوں کی خواہش اور اُن کی کوشش تو یہ رہتی ہے کہ جس اسلامی نظام کا نام لینے کے وہ خود روادار نہیں، دوسرے بھی اس کا نام نہ لیں۔ ان کی یہ خواہش کتنی زبردست، اور یہ کوشش کتنی انتہا پسندانہ ہے، اس بات کا اندازہ اِن لوگوں کے اُس سلوک سے کر لیجیے جسے وہ اپنے ہاں اٹھنے والی اسلامی تحریکوں کے ساتھ اختیار کیا کرتے ہیں۔ یہ بتانے کی مطلق ضرورت نہیں کہ اکثر اوقات یہ سلوک بربریت کی مثال قائم کر چکا ہے، اور اب بھی کر رہا ہے۔ ان تحریکوں کا گلا دبا دینے کی کسی بھی تدبیر اور کسی بھی اقدام سے، انصاف اور انسانیت کے نام پر، باز آجانا ان لوگوں کے لیے ممکن نہیں رہا کرتا۔ مصر میں جو کچھ ہوا، اور اس وقت شام میں جو کچھ ہو رہا ہے، اس کا تصوّر بھی خون کے آنسو رلا دینے والا ہے۔ ترکی کی سرزمین، جو ابھی ساٹھ ستر برس پہلے تک خلافت کا، وہ جیسی کچھ بھی کیوں نہ رہی ہو، مرکز تھی، آج اسلامی نظام کی مانگ اور کوشش کرنے والوں کو وہاں جیلوں میں بند کر رکھا گیا ہے۔ اور وہاں کے فوجی حکمران نے ملک کو جو نیا آئین دینے کا اعلان کیا ہے اس کے بنیادی اصولوں میں سے ایک اصول یہ بھی ہے کہ کیمونسٹ نظام کے لیے اور اسلامی نظام کے قیام کے لیے کوئی جدوجہد نہ کی جاسکے گی۔ پاکستان میں چند سال پہلے تک اسلامی نظام کی بات ناقابلِ معافی جرم تھی۔ لیبیا میں اسلام اور اشتراکیت کا عجیب و غریب ملغوبہ اسلامی نظام کی راہ روکے ہوئے ہے۔ عراق میں اسلامی نظام کی جگہ 'بعثیت' نے لے رکھی ہے، جسے چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔ افریقہ کے غیر عربی مسلم ملکوں میں سنا تا ہے۔ ٹیونیشیا میں اسلامی نظام کی بات تو دور رہی، خود اسلام کی جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ الجزائر کا بھی حال ناگفتہ بہ ہے۔ بعض عرب ملکوں میں اسلامی نظام، ملوکیت کا ذمی بنا ہوا ہے۔ سب سے بڑے مسلم ملک، انڈونیشیا کا حال عجیب و غریب اور سخت افسوسناک ہی نہیں تشویشناک بھی ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک کے حکمرانوں کی روش کے بارے میں ذرا تفصیل سے سن لیا جائے۔ لندن کے ایک مشہور ہفتہ وار، ایکونومسٹ، کا ایک مضمون نگار جنوبی مشرقی ایشیا کے دوسرے ملکوں کی اسلامی تحریکوں کا جائزہ لیتے ہوئے

انڈونیشیا کی اسلامی تحریکات کے بارے میں لکھتا ہے کہ:۔

"یہاں اسلام پسند عناصر سب سے زیادہ مدافعانہ حالت میں ہیں اور حکومت کے زبردست چوطرفہ حملوں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ انڈونیشیا کی حکومت ان کے خلاف سب سے موثر حربہ یہ استعمال کرتی ہے کہ سرکاری طور پر مسلمانوں کی تعداد کم کر کے دکھائی جاتی ہے! اس کا ایک عام طریقہ یہ ہے کہ مردم شماری کے فارم کے اِس سوال کے جواب میں کہ" کیا آپ قرآن پڑھ سکتے / پڑھ سکتی ہیں"؟ اکثر ناخواندہ مسلمان 'ہاں، نہیں لکھ پاتے، تو ان کا نام غیر مسلموں کے خانے میں ڈال دیا جاتا ہے..... اسلام پسند عناصر کو دبانے کے لیے انڈونیشیا کی حکومت کا تیسرا حربہ یہ ہے کہ وہ دوسرے مذاہب کی زبردست حمایت کرتی ہے تاکہ وہ اسلام کی جوابی طاقت کی حیثیت سے ابھریں۔ اسلام کے مقابلے پر پنچ شیلا کے اصول اور سیکولرزم کے قیام اور زبردست پروپگنڈے کے علاوہ انڈونیشیا کی ایک اور پُراسرار حکمت عملی بدھ ازم اور ہندوازم کا پھیلاؤ ہے۔ بدھ ازم کو اس ملک میں پھر سے زندہ کیا جا رہا ہے، جب کہ جزیرۂ بالی کے ہندوازم نے ایک سیاسی پارٹی کو جنم دیا ہے۔ اس کے علاوہ انڈونیشیا کی حکومت ایک اور عجیب و غریب عقیدے کو نشوونما دے رہی ہے، جسے 'کیبا تنان' کہا جاتا ہے۔ یہ ایک طرح سے مظاہر پرستی، باطنیت اور عملِ سحر وغیرہ کا ایک مرکب ہے۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ صدر سہارتو اور ان کے بعض سینئر جنرلوں کا ذاتی عقیدہ ہے، اور یہ اسلام سے ان کی قدرتی وابستگی کے علاوہ ایک اضافی عقیدہ ہے۔ سرکاری سرپرستی کا سب سے زیادہ فائدہ عیسائیوں نے اٹھایا ہے۔ انڈونیشیا میں گزشتہ بیس سال کے دوران گرجا گھروں کی تعداد چار گنی اور عیسائیوں کی تعداد دوگنی ہو چکی ہے۔ پورے ملک میں عیسائی مشنریوں کا ایک جال پھیلا ہوا ہے۔ ان کی اپنی ہوائی

پٹیاں ہیں۔ صرف ایک صوبے میں ان کی تعداد ۱۴۱ ہے۔ جس طرح شاہ ایران اپنی خفیہ سروس میں اقلیتی فرقوں کے افراد کو بھرتی کیا کرتے تھے، بالکل اسی طرح جنرل سہارتو بھی عیسائیوں کو استعمال کرتے ہیں۔ عیسائیوں کو آج کل مسلح افواج کے ڈپٹی چیف آف اسٹاف اور دفاعی خفیہ سروس کے سربراہ جیسے عہدے دیے جاتے ہیں۔ حج کی فیس میں بہت زیادہ اضافہ کر دیا گیا ہے۔ ہوائی جہازوں کا کرایہ بھی بڑھا دیا گیا ہے، نیز مذہبی امور کی وزارت میں کرپشن اور انتظامی سطح پر عازمینِ حج کی دشواریاں آتنی بڑھ گئی ہیں کہ لوگ ہمت ہار جاتے ہیں۔ ڈسپلن اور نظم و ضبط برقرار رکھنے کے نام پر جمعہ کی نماز سرکاری نگرانی میں پڑھائی جاتی ہے، اور اس موقع پر زبردست حفاظتی انتظامات کیے جاتے ہیں۔ جمعہ کے خطبات اور دیگر مذہبی تقاریر کے لیے حکومت کی طرف سے اماموں کو رہنما خطوط مہیا کیے جاتے ہیں۔ دسمبر ۸۰ء میں انڈونیشیا اور ملیشیا کے درمیان "اسلامک کواپریشن ایگریمنٹ" کے نام سے اسلامی امور میں تعاون کا جو معاہدہ طے ہوا تھا اس میں اِس بات کا بھی عہد کیا گیا تھا کہ "اسلام کے منفی اثرات" کا توڑ کیا جائے گا۔ اسلام کی ظاہری باتوں کو بڑے پیمانے پر پھیلایا جاتا ہے..... (البتہ) اسلام کے خلاف سخت ترین جذبات رکھنے والی انڈونیشیا کی یہ مسلم حکومت اسلامی عناصر کے تعلیمی اداروں اور سماجی و ثقافتی سرگرمیوں پر روک نہیں لگا سکی۔"

اِسی ایک 'گلستان'، 'بر پوری' 'بہار' کو قیاس کر لیجیے اور دیکھ لیجیے کہ مسلمان فرمانروا کا بنیادی فریضہ کیا قرار دیا گیا تھا، اور آج کے مسلم حکمراں اسلام، اسلامی نظام اور اسلامی تصورِ دین و عبادت کے ساتھ کیا رویہ اختیار کیے ہوئے ہیں؟

(۲) **عوام کی دین سے ناواقفیت :-** اسلام کا دائرۂ اثر و اقتدار تو حیرت انگیز رفتار سے بڑھتا چلا گیا، اور تھوڑی ہی مدت میں ملک کے ملک فتح ہو گئے، اور پھر اسی تناسب سے پیروانِ اسلام کی تعداد بھی کہیں سے کہیں پہنچتی چلی گئی۔ مگر جس رفتار سے ان کی تعداد

بڑھی، اس کے تہائی چوتھائی حصے کے برابر بھی ان نئے مسلمانوں کی دینی تعلیم و تربیت کا انتظام نہ ہو سکا۔ جس کی اصل وجہ شروع شروع میں تو سیاسی حالات کی بحرانی کیفیت تھی، مگر بعد میں مسلم حکمرانوں کی غفلت اور بے پروائی اس کی خاص اور اصل وجہ بن گئی۔ ایسی حالت میں، قدرتی طور پر، ملت میں خام مواد کی کثرت ہوتی ہی چاہیے تھی، اور ضروری تھا کہ عوام کے اندر دینی فکر رنگ برنگے خودرَو پودوں کی طرح اپنے طور پر پروان چڑھتی رہے۔ پھر ایک خاص بات یہ بھی ہوئی کہ دوسرے مذہبوں کے اندر سے نکل نکل کر اسلام میں آ داخل ہونے والے بالعموم اپنے اپنے پچھلے مذہبوں کے بہت سے افکار و تصورات لیے ہوئے داخل ہوئے تھے، جو ایک فطری بات تھی۔ کوئی بھی شخص چاہے وہ کتنے ہی خلوص کے ساتھ اسلام میں داخل ہوا ہو، بطورِ خود سبھی اسلامی عقائد، افکار اور تصوّرات سے آگاہ نہیں ہو جا سکتا، بلکہ اس بات کا ضرورت مند ہوتا ہے کہ اس کی ذہنی تطہیر اور فکری تربیت کی جائے۔ اس کے بغیر اس کا ذہن اپنے قدیم مذہب کے افکار و رسوم سے پوری طرح صاف نہیں ہو سکتا۔ نومسلموں کی اس ذہنی تطہیر اور فکری تربیت کی ذمّہ داری اگرچہ ملت کے اہلِ علم پر بھی عائد ہوتی ہے، مگر اس فریضے کے ادا کرنے کے اصل ذمّہ دار وہ اربابِ حکومت ہوتے ہیں جنہیں حکمرانی کا منصب ملتا ہی اس غرض سے ہے کہ وہ ملت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا وسیع نظام قائم کریں۔ خیر القرون کے بعد چونکہ ایسا کوئی نظام قائم نہ کیا جا سکا جو اس مقصد کو پورا کرتا، اس لیے عوام کی بہت بڑی اکثریت صحیح دین شناسی سے محروم رہ گئی۔ خصوصًا دین اور عبادت کے وسیع مفہوموں سے تو وہ بہت کم واقف ہو پائی۔ کیونکہ یہ تصوّرات بالکل غیر معمولی قسم کے اور انقلابی نوعیت کے تھے، دنیا کے کسی مذہب میں ان کا وجود نہیں پایا جا رہا تھا۔ اس لیے اسلام میں داخل ہونے والے پہلے بھی ان سے کوئی شناسائی نہیں رکھتے تھے، اور جب وہ اسلام کے دائرے میں آئے تو یہاں بھی ان کی تعلیم و تربیت کا وہ انتظام نہ ہو سکا جو دین اور عبادت کا حقیقی مفہوم ان کے ذہنوں میں اتار دیتا۔ اس کے بخلاف خود دین داروں کے ایک گروہ کے طرزِ فکر و عمل نے انہیں اس بات پر مطمئن کر دیا کہ زندگی کے معاملات و مسائل سے نہ عبادت کا کوئی خاص تعلق ہے نہ دین کا۔

(۳) بدعتوں کی مقبولیت۔ 'بدعت' اس چیز کو کہتے ہیں جو دین و شریعت کی نہ ہو مگر اس کو

شرعی حیثیت سے اپنا لیا جائے۔ یہ طرزِ عمل واضح طور پر ایک طرح کی شریعت سازی ہے، اس لیے بدترین گمراہی ہے۔ حضور ﷺ نے اس سے بڑی سختی کے ساتھ منع فرما رکھا ہے۔ لیکن جاہلیت نے لوگوں کے ذہن پر ایسا چھاپا مارا کہ وہ حضور ﷺ کی اس ممانعت اور تنبیہہ کو یاد نہ رکھ سکے، اور پہلی صدی ہجری کے وسط ہی سے بدعتوں کا ظہور شروع ہو گیا۔ یہ بدعتیں اعتقادی نوعیت کی بھی تھیں، سیاسی نوعیت کی بھی تھیں، اور تشریعی نوعیت کی بھی تھیں۔ اعتقادی نوعیت کی بدعات کی ابتداء خارجیوں اور شیعوں سے ہوئی، جن میں گناہ کبیرہ کے مرتکب کے کافر ہو جانے، اور حضرت علیؓ و ائمہؒ اہلِ بیت کے معصوم اور خدائی صفات سے متصف ہونے کے عقیدے سرِ فہرست ہیں۔ پھر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا طرح طرح کے غلط عقائد کا گویا جنگل تیار ہوتا گیا۔ حد یہ ہے کہ ایک وقت وہ بھی آیا جب اللہ کے بندے اور رسول، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ عقیدہ بھی ایجاد ہو گیا کہ وہ، العیاذ باللہ، خدا کے اوتار تھے۔ یہ اعتقادی بدعات کا حال ہے۔ سیاسی بدعات کا تذکرہ پہلے گزر چکا ہے۔ اب تشریعی بدعتوں کا حال بھی تھوڑا سا سن لیجیے۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ نے اپنے دور تک کی تشریعی بدعتوں کی درج ذیل چند مثالیں قلم بند کی ہیں:-

۱۔ عیدین کے خطبے مسلّم طور پر نماز دوگانہ کے بعد مشروع تھے۔ ایک حکمران (یعنی اموی خلیفہ مروان) کا زمانہ آیا تو اس نے بطورِ خود اس ترتیب کو الٹ دیا، اور خطبہ نماز سے پہلے دینے لگا۔[1] مصلحت یہ بتائی کہ نماز کے بعد لوگ خطبہ سننے کے لیے رکا نہیں کرتے۔

۲۔ بعض حکام نے عیدین میں اذانیں دلانا بھی شروع کر دیا۔[2]

۳۔ بعض لوگوں نے کعبہ کی طرح مسجدِ اقصیٰ کا طواف کرنے یا اس کے پاس سر منڈانے یا قربانی کرنے کا عمل اپنا رکھا ہے۔ اسی طرح بعض لوگ اُس قبّہ کا طواف کیا کرتے ہیں جو عرفات کے میدان میں جبلِ رحمت پر واقع ہے۔[3]

۴۔ بہت سے لوگوں نے بعض خاص اعمال کے لیے خود ہی کچھ خاص دن مقرر کر لیے ہیں۔ مثلاً

---

[1] اقتضاء الصراط المستقیم ص ۱۳۵۔ [2] ایضاً ص ۱۳۴۔ [3] ایضاً ص ۱۴۸، ۱۴۹۔

رجب کی پہلی جمعرات کو روزہ رکھنا، اور اس کے بعد والی رات میں ایک خاص نماز پڑھنا، جسے جہلاء 'صلوٰۃ الرغائب'[1] کہتے ہیں...... یہ بدعت چوتھی صدی ہجری کے بعد وجود میں آئی[2] اسی طرح وسطِ رجب میں ایک اور دن کو ایک خاص نماز کے لیے متعین کر لیا گیا، جسے 'صلوٰۃ اُمِّ داؤد' کا نام دیا گیا۔[3]

۵۔ کچھ بستیوں کے لوگ مغرب کی نماز کے بعد نمازِ مغرب ہی جیسی ایک نماز باجماعت پڑھا کرتے، جسے وہ 'صلوٰۃ بِرّ الوالدین' کہتے۔ اسی طرح بعض لوگ ہر رات اُن تمام مسلمانوں کی، جو دنیا بھر میں کہیں بھی وفات پائے ہوں، باجماعت نمازِ جنازہ پڑھا کرتے۔[4]

۶۔ شیطان نے بے شمار لوگوں کی نگاہوں میں ان کی بداعمالیوں کو خوشنما بنا کر رکھ دیا ہے، اور انہیں اللہ تعالیٰ کی خالص بندگی کی راہ سے ہٹا کر ایک طرح کے شرک میں مبتلا کر دیا ہے۔ چنانچہ وہ ایسے سفر کرتے اور ایسی زیارت کے لیے جایا کرتے ہیں جس کا مقصد کسی غیر اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا اور اس کی ذات کے ساتھ اپنی شیفتگی ظاہر کرنا ہوا کرتا ہے، اور اس غرض سے وہ کسی نبی یا کسی صحابی یا کسی اور مردِ صالح کی قبر پر.... حاضری دیا کرتے ہیں؛.... اور بعض لوگ تو یہاں تک سمجھ بیٹھے ہیں کہ حج کعبہ کا اصل مقصود یہی ہے، اس لیے وہ حج کا سفر جب کرتے ہیں تو ذہن میں خانہ کعبہ کا نہیں، بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کا خیال رکھ کر کرتے ہیں۔ اور بہتوں کے نزدیک یہ (قبر نبوی کی) زیارت کعبہ کے حج سے زیادہ نافع ہوتی ہے.... اسی طرح کچھ لوگ قبروں میں مدفون مُردوں سے اس طرح اپنی مرادیں مانگتے ہیں جس طرح زندۂ جاوید خدا سے مانگی جانی چاہئیں[5]... الخ

۷۔ میں نے کتنے ہی مسلمانوں کو دیکھا ہے جو عیسائیوں کی کچھ ایسی مذہبی نوعیت کی رسمیں اپنائے ہوئے تھے جن سے احتراز لازم ہے۔ حد یہ ہے کہ ان میں سے بہتوں کو یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ (مسلمانوں کی نہیں) عیسائیوں کی مذہبی رسمیں ہیں...[6] الخ

۸۔ بہت سے مدعیانِ اسلام کے لیے شیطان نے اُن کاموں کو پسندیدہ بنا دیا ہے جو وہ

---

[1] ایضاً ص ۱۳۶ ۔ [2] ایضاً ص ۱۴۱ ۔ [3] ایضاً ص ۱۴۱ ۔ [4] ایضاً ص ۱۴۱ ۔ [5] ایضاً ص ۱۴۵ ۔ [6] ایضاً ص ۲۱ ۔ ایضاً ص ۱۰۰

عیسائیوں کے روزے ختم ہونے پر انجام دیا کرتے ہیں، مثلاً ہدیوں کا بھیجنا، خوشیاں منانا، داد و دہش کرنا، بچوں کو اچھے کپڑے پہناتا وغیرہ، جس کے نتیجے میں یہ عیسائی عید مسلمانوں کی اپنی عید کے مانند بن جاتی ہے۔ بلکہ عیسائی علاقوں سے ملے ہوئے مسلم علاقوں کے اُن باشندوں کے ہاں تو، جن کا علمِ دین اور ایمان کچھ یوں ہی سا ہے، یہ عیسائی عید، اللہ اور رسول ؐ کی مشروع کی ہوئی عید سے بھی زیادہ اہم اور بارونق ہوتی ہے، جیسا کہ بہت سے ثقہ لوگوں نے مجھ سے بیان کیا ہے۔ پھر ان کم سواد مسلمانوں ہی کا کیا سوال، میں نے تو دمشق اور اس کے اطراف کے شامی علاقوں تک میں ایسی ہی صورتِ حال دیکھی ہے۔ حالانکہ یہ مقامات علم اور ایمان سے گہری وابستگی رکھتے ہیں[1]..... الخ

یہ تو امام ابن تیمیہؒ کے زمانے تک کی تاریخِ بدعت کا ایک صفحہ تھا۔ اس کے بعد سے آج تک اس وبا نے جس وسیع پیمانے پر قہر ڈھایا ہے اس کا تو اندازہ کرنا بھی مشکل ہے۔

(۴) راہبانہ ذہنیت کا فروغ :- یہ ایک بالکل واضح حقیقت ہے کہ اسلام کا رہبانیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ قرآن کریم نے اسے نصاریٰ کی ایجاد بتایا اور بدعت قرار دیا ہے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف صاف فرمایا ہے کہ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔ مگر بہت زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ بہت سے لوگوں نے ان سب ہدایتوں اور تنبیہوں کو بھلانا شروع کر دیا، اور پھر رہبانی ذہنیت اور عجمی رنگ کے تصوّف کو امت میں خاصا فروغ حاصل ہوگیا۔

مذکورہ بالا پہلی تین چیزیں جہاں اصلاً دنیا طلبی کی پیدا کردہ تھیں، وہاں یہ چوتھی چیز غلط قسم کی خدا طلبی کا نتیجہ تھی۔ اس کا آغاز تو 'احسان'، یعنی معیاری خدا پرستی کا تصور ذہن میں رکھ کر ہوا تھا، مگر جلد ہی اس میں بے اعتدالی آگئی، جو تشدّد پسندی کی پیداوار تھی۔ عبادات میں مشروع اور مسنون حدوں سے قدم آگے بڑھا دیے گئے، اور مباحات سے مکروہات جیسا اجتناب برتا جانے لگا، حالانکہ شارع علیہ السلام نے اس تشدّد پسندی سے سختی کے ساتھ منع فرما رکھا ہے۔ یہی تشدّد پسندی تھی جس نے نصاریٰ کو رہبانیت تک پہنچایا تھا۔ اور اب

---

[1] اقتضاء الصراط المستقیم ص ۹۹-۱۰۰

اسی نے امتِ مسلمہ میں رہبانیت کے بیج بو دیے۔ امام ابن تیمیہؒ کے بقول "ہمارے اکثر عبادت گزار بعض قسم کی تشدد پسندیوں میں مبتلا ہو رہے" دکثیر من عبادنا قد وقعوا فی بعض ذالک[1] اور اسی کا یہ نتیجہ ہوا کہ "مسلمانوں کے بہت سے گروہ کسی نہ کسی رنگ کی، اور کسی نہ کسی حد تک رہبانیت اختیار کر بیٹھے" (وقد امتلیٰ طوائف من المسلمین من الرھبانیۃ بما اللّٰہ بہ علیم[2]) رہبانیت کی منزلِ مقصود وصالِ الٰہی ہے، اس کی راہ عشقِ خداوندی کی راہ ہے، اور اس کی روش دنیوی علائق اور طبعی مرغوبات سے دوری کی روش ہے۔ جب کہ ان تینوں میں سے کوئی ایک چیز بھی قرآنی تعلیمات کے مطابق نہیں ہے۔ اس لیے رہبانی تصوف آدمی کو روحانی حیثیت سے چاہے جتنا بھی اونچا اٹھا دے، انسانی زندگی کے معاملات اور مسائل کے بارے میں اس کے رویہ کو یکسر منفی بنا کر رکھ دیتا ہے۔ اور جب انسانی زندگی کے مسائل سے اس کا کوئی مثبت رابطہ نہیں رہ جاتا تو منطقی طور پر شریعت کے تقریباً نوے فی صد احکام کا وجود و عدم بھی اس کے لیے برابر ہو رہتا ہے۔ اس حقیقت پر رہبانی تصوف کا صرف مزاج اور اس کا فکر و فلسفہ ہی گواہ نہیں ہے، اس کے حلقہ بگوشوں کی پوری عملی زندگی بھی گواہی دیتی رہتی ہے اور دیتی رہتی ہے۔ ان لوگوں کے ہاں دین اور عبادت، نماز روزے اور ذکر و مراقبہ تک محدود ہے۔ ان کے حلقے روحانیت کے ایسے آئینہ خانے ہیں جن میں چند مخصوص عبادات کی تصویروں کے سوا اور کوئی نقش دکھائی نہ دے گا۔ ملت کے کسی معاشرتی، معاشی، تمدنی، تعلیمی، سیاسی، دفاعی یا اجتماعی مسئلے کا تذکرہ ہوتے ہی ان کی پیشانیاں شکن آلود ہو جاتی ہیں۔ ان کے نزدیک یہ سب دنیاداری کی باتیں ہیں۔ دین داری یہ ہے کہ دنیا اور اس کے معاملات بے دینوں، گمراہوں، فاسقوں اور مفسدوں کے ہاتھ میں چھوڑ دیے جائیں۔ اس کے نتیجے میں اگر ہر طرف منکرات کی بارش ہوتی رہے تو ہوا کرے۔ خدا سے بغاوت کی آگ بھڑکتی رہے تو بھڑکا کرے، طاغوت کا ڈنکا بجتا ہے تو بجا کرے فکر کی کوئی بات نہیں۔ اسی طرح اگر خود مسلمان بھی خدا کی شریعت کو پس پشت

---

[1] اقتضاء الصراط المستقیم ص ۴۹-۵۰۔

[2] ایضاً ص ۶۔

ڈال کر اپنے لیے قانون سازی کر رہے ہوں، جائز کو ناجائز اور ناجائز کو جائز بنا ڈالا گیا ہو، اخلاق کی بنیادیں بدل کر رکھ دی گئی ہوں، فسق و فجور کا لاوا ابل رہا ہو، تب بھی اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے۔ دین داری کے اِس راہبانہ یا نیم راہبانہ تصوّر سے اسلام کی تصویر جس حد تک متغیر ہو رہی ہے، اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ پھر بات صرف اجتماعی، معاشرتی، اور سیاسی مسائل ہی تک محدود بھی نہ رہ سکی، بلکہ ذکر و عبادت اور صبر و توکل، نیز عمل اور مجاہدہ وغیرہ بہت سی اسلامی اور قرآنی اصطلاحوں کے حقیقی معنی بھی اپنی جگہ ٹھیک ٹھیک برقرار نہیں رہنے دیے گئے۔ اب بے عملی کا نام عمل ہے، اور عمل 'کرنے' کی چیز نہیں، کلیۃً 'پڑھنے' کی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ اسی طرح ذکر کا مفہوم مخصوص اوقات میں، یا مخصوص آداب کے ساتھ تسبیح و تہلیل تک محدود ہے۔ باقی رہا وہ دائمی عملی ذکر، جس کی طرف قرآن کریم کی آیت "فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ وَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ" میں اشارہ کیا گیا ہے، تو اس کا تصوّر بھی شاید دماغوں سے نکل چکا ہے[ع]۔ یہی حال عبادت کے معاملے کا بھی ہے۔ عبادت کے معنی ان لوگوں کے نزدیک صرف چند مخصوص اعمال کے ہیں۔ باقی سارے اعمال عبادت کے

ع یہ سورۂ جمعہ کی آیت ہے، اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ "جب (جمعہ کی) نماز ختم ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور (اپنے کاروبار میں لگ کر) اللہ کا فضل (یعنی رزقِ حلال) تلاش کرو، اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہو۔" یہاں اللہ کو یاد کرنے کا مطلب صاف طور سے یہ ہے کہ دنیوی کاروبار کے ہنگاموں میں اللہ کی قائم کی ہوئی حدوں کا، اور اُس کی شریعت کے حکموں کا برابر خیال رکھو جہاں قدم قدم پر شیطان کی اکساہٹوں اور نفس کی خواہشوں کے چھاپے پڑتے رہتے ہیں، جہاں اکثر جھوٹ اور خیانت اور حرام خوری اور بد نظری کے مواقع پیش آتے رہتے ہیں اور شیطان ان کے اندر فائدے کی صورت دکھاتا ہے، وہاں تمہیں ہر وقت یہ یاد رہے کہ خدا تم کو دیکھ رہا ہے اور ایک دن اس کی عدالت میں تمہیں حاضر ہونا ہے۔ ہر مرتبہ جب حرام اپنی ظاہری منفعتوں اور لذتوں کے ساتھ، اور حلال اپنے ظاہری نقصانوں اور تلخیوں کے ساتھ دوش بدوش تمہارے سامنے آئیں تو خدا کا خوف تمہیں حرام کو چھوڑ دینے اور حلال کو اختیار کر لینے پر آمادہ کر دے۔ یہ ہے اصل یادِ الٰہی، جس میں صبر بھی موجود ہے، تقویٰ بھی موجود ہے، توکل بھی موجود ہے اور مجاہدہ بھی موجود ہے۔ (ص)

دائرے سے خارج ہیں، خواہ ان کی انجام دہی میں خدا کی رضا، رسولؐ کی اقتداء اور شرعی حدود کی پابندی کا کتنا ہی اہتمام کیوں نہ کیا گیا ہو۔ پھر بسا اوقات تو ان چند مخصوص اعمال کی بھی روح سے بحث کم اور ظاہری شکل اور مقدارات زیادہ ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص صرف فرض عبادتیں ہی ادا کرے، اور اس کے بعد اپنا پورا وقت کفر اور جاہلیت کی طاقتوں سے لڑنے اور اسلام کا کلمہ بلند کرنے کی کوششوں میں لگاتا رہے، یا دنیا کو دین کی دعوت دینے، ملت میں دین کا شعور پیدا کرنے، خلق خدا کی خدمت کرنے، مظلوموں کو راحت پہنچانے یا اہی جیسے کسی اور کام کے لیے وقف کیے رہے تو وہ عبادت گذار نہیں، بلکہ سیاست زدہ اور دنیادار ہے۔ کیونکہ وہ مسجد یا خانقاہ نہیں نہیں، بلکہ کسی دفتر میں بیٹھا ہوا یا کسی گلی میں دوڑتا پھرتا دکھائی پڑتا ہے، اور عبادت کی ان صورتوں سے ہمارے یہ بزرگ آشنا نہیں۔ قرآن حکیم نے اپنے ارشاد "مَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ" میں جس عبادت کو انسان کی پیدائش کی کلی غرض و غایت بتایا تھا، اس کا یہ محدود مفہوم لینا کتنی عجیب بات ہے۔

دین اور عبادت کے وسیع تصورات سے ان بڑوں کی یہ بیگانگی یا بے پروائی اگر انہی تک محدود رہتی تب بھی صبر کر لیا جا سکتا تھا، مگر ستم یہ ہوا کہ ان حضرات کے اس اسوے نے عوام کے لیے ایک اونچی سند جواز مہیا کر دی، جس نے انہیں بھی دین اور دین داری کے اسی ادھورے مفہوم پر مطمئن کر کے رکھ دیا، اور ان کے ذہن کے دروازے اس طرح بند کر دیے کہ دین و عبادت کے حقیقی تصورات کا انہیں سمجھانا آسان نہ رہ گیا۔ جس کے دو سبب ہیں:۔

ایک تو یہ کہ جب آدمی کا اپنا دینی علم ناقص اور دین سے عملی رابطہ کمزور ہوتا ہے تو وہ نفسیاتی طور پر آسانیوں اور بے قیدیوں کا بھوکا بن جاتا ہے، اور ایسے فکر و فلسفہ کی تاک میں رہتا ہے جو اس کے لیے یہ آسانیاں اور بے قیدیاں مہیا کر دینے والا ہو۔

دوسرے یہ کہ متصوفانہ رنگ ڈھنگ میں ایک ایسی مخصوص کشش ہوتی ہے جو عام لوگوں کو بہت جلد اپنا گرویدہ بنا لیا کرتی ہے۔

ان دونوں چیزوں نے مل کر عوام کی بڑی اکثریت کو دین داری کے ایک آسان نسخے پر قانع بنا کر رکھ دیا۔ فطری بات ہے کہ جب ایک عام آدمی یہ دیکھتا ہے کہ دین داری کا کمال

اسلام اور جاہلیت کے چوطرفہ معرکہ سے دور بیٹھ کر بھی حاصل کیا جاسکتا ہے، اور حاصل کیا جارہا ہے، تو وہ اپنا سر اوکھلی میں کیوں دینے لگا۔

یہ ہیں وہ چار بنیادی اسباب جنہوں نے امت کے سوادِ اعظم کو دین اور عبادت کے حقیقی اور وسیع تصورات سے، اور اسلامی نظام کی فکر سے عظیم پیمانے پر بے بہرہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ پہلے تین اسباب نے اسلام کی روح کو مفلوج بنا دیا، اور چوتھے سبب نے اس کے جسم کو لہو لہان کر ڈالا۔ اور پھر خدا کا دین اس طرح جاہلیت کے گھیرے میں آگیا کہ نہ اس کی روح کی توانائی برقرار رہ سکی، نہ اس کا جسم تندرست باقی رہ گیا۔

۹۔ دین کے ماخذ اور شریعت کے احکام کی اہمیتوں کی ترتیب پر

شارع نے دین کے ماخذ میں اور شریعت کے احکام میں اُن کی اہمیتوں کے لحاظ سے جو ترتیب رکھی تھی، اسے الٹ پلٹ کر رکھ دیا گیا۔ دین کے ماخذ میں صحیح ترتیب یہ تھی کہ پہلی جگہ اللہ کی کتاب کو حاصل تھی، اس کے بعد رسولِ خدا کی سنت کو، اور آخر میں ائمہ دین کے اجتہادات کو۔ مگر اب صورتِ حال یہ بن گئی ہے کہ سب سے پہلے ان ائمہ دین کے اجتہادات کو اور اُن بزرگوں کے اقوال کو، جن سے لوگوں کو موروثی عقیدت ہے، سامنے رکھا جاتا ہے، پھر احادیثِ رسول کی طرف توجہ دی جاتی ہے اور ان کا علم بھی بالعموم اس غرض سے حاصل کیا جاتا ہے کہ اپنے پسندیدہ فقہی مسلک کی تائید میں دلائل فراہم ہوں، اور آخر میں قرآن کریم کی باری آتی ہے، اور اُس کو بھی پڑھنے کا اصل مقصد بالعموم محض ثواب کا حصول ہوتا ہے، یا پھر کلام الٰہی کی بلاغت اور اس کے لفظی محاسن سے لطف اندوزی پیشِ نظر ہوتی ہے۔ اسی طرح عقائد میں شارع نے ترتیب یہ رکھی تھی کہ سب سے پہلے ایمانیات پر نظریں جمائی جائیں، پھر اعتقادی جزئیات کو لیا جائے، جن میں تعبیر اور تاویل کے اختلاف کی پوری گنجائش ہے۔ مگر عام طور سے اس ترتیب کو بھی الٹ دیا گیا ہے، اور ہر گروہ نے اسے اپنے ذوق اور خواہش کے مطابق اس طرح کر دیا ہے کہ سب سے پہلے وہ جزئی عقیدے آگئے ہیں جن سے اسے خاص دلچسپی ہے۔ اس کے بعد وہ ایمانیات آتے ہیں جن پر اعتقاد رکھنے کے باوجود دوسروں کو صرف اس لیے گمراہ، بدعقیدہ، فاسق

اور کبھی کبھی کافر و زندیق تک ٹھیرا دیا جاتا ہے کہ وہ اُن سے کسی ایک دو جزئی عقائد میں متفق نہیں ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس اوامر میں ترتیب یہ رکھی گئی تھی کہ سرِ فہرست فرائض ہوں، پھر موکدہ سنتیں ہوں، اور آخر میں مستحب چیزیں ہوں۔ اِس ترتیب کو بھی باقی نہیں رہنے دیا گیا، اور ہر گروہ نے اپنے ذوق اور اپنی دل چسپیوں کے مطابق اسے کچھ سے کچھ کر دیا۔ اب اُن اوامر کو، جو اصلاً استحباب اور استحسان کے درجے کے ہیں، عملاً سب سے زیادہ اہمیت دے دی گئی ہے۔ ان کے بعد موکدّ سنتوں کا نمبر آتا ہے، اور آخر میں فرائض کی پوچھ ہوتی ہے۔ یہی حال منہیات و محرمات اور مکروہات کی ترتیب کا بھی ہے۔ شارع نے سب سے بڑھ کر محرمات اور کبائر کی ممانعت پر زور دیا ہے، اس کے بعد صغائر کی روک تھام کا مرتبہ آتا ہے، اور سب سے آخر میں وہ مکروہات ہیں جن کی ممانعت صراحت کے ساتھ وارد نہیں ہوئی ہے، بلکہ تخریج اور استنباط کے ذریعہ نصوص کے اشاروں اور ان کی دلالتوں سے نکالی گئی ہے۔ مگر بالعموم ہر گروہ نے اپنے ذہنی رجحان کے زیر اثر اس ترتیب کو الٹ دیا۔ اب تیسرے درجے کے مکروہات پر سب سے زیادہ داروگیر کی جاتی ہے، اس کے بعد صغائر سے اجتناب پر زور دیا جاتا ہے، اور اکثر کبائر و محرمات کو سب سے آخر میں جگہ ملتی ہے، اور اُن کا ذکر زبانوں پر کم ہی آتا ہے۔

یہ پوری صورتِ حال اپنی حقیقت اور اپنے عواقب کے لحاظ سے بڑی خطرناک ہے۔ کیونکہ اسے تفقُّہ اور تشرُّع کا لباس پہنا دیا گیا ہے۔ جب کہ حقیقت واقعی یہ نہیں ہے۔ یہ دراصل ایک طرح کا دینی فتنہ ہے جس کی شاخیں بے شمار، اور جس کے نتائج بڑے دوررس ہیں۔ فکری جمود، دینی مزاج کا بگاڑ، فرقہ بندی کا زور، مسلکی نزاعات کی گرم بازاری، اہم مسائل کی طرف سے بے پروائی، لاطائل بحثوں میں انہماک، کرنے کے کاموں کو چھوڑے رہنا اور غیر ضروری مشاغل میں اپنی قوتوں کو ضائع کر دینا ــــ یہ ساری خرابیاں اور نقصانات اسی فتنے کے برگ و بار ہیں۔ حاملینِ دینِ متین مطمئن ہیں کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں، ٹھیک کر رہے ہیں، اور جاہلیت بغلیں بجا رہی ہے کہ جو امت قرآن جیسی 'خطرناک' کتاب رکھتی تھی، جس سے اندیشہ تھا کہ وہ اس کا

تخت پھر کبھی بچھنے دے گی، اس کو وہ اس ذوقِ فضول کے اندر الجھا دینے میں کامیاب ہو گئی۔

۱۰۔ دینی احکام کی مخلصانہ پیروی پر

اس دینی فتنے سے، جس کا ابھی تذکرہ ہوا، قریبی رشتہ رکھنے والے دو ایمانی امراض اور بھی ہیں، جو یہاں خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں: ایک[۱] تو دین و شریعت کی روح سے زیادہ ظاہرِ شریعت پر زور دینے کا مزاج۔ دوسرے[۲] احکامِ دین کے ساتھ حیلہ بازی۔

ظا[۱]ہرِ شریعت پر زور دینے والوں کے طرزِ عمل سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے نزدیک دین کوئی محسوس و مرئی چیز ہے، جس کو ناپا تولا اور آنکھوں سے دیکھا بھالا جا سکتا ہے۔ ان لوگوں نے 'مسلمان' کا ایک پیمانہ بنا رکھا ہے۔ جہاں کوئی شخص سامنے آیا، فوراً ہی اپنا یہ پیمانہ اس پر رکھ کر اس کا دین و ایمان ناپ لیتے ہیں۔ اگر وہ اس پیمائش میں پورا اتر گیا تو اس کو دین داری اور تشرع کا سرٹیفکیٹ عطا کر دیا گیا۔ پھر چاہے وہ اپنے اعمال اور اخلاق میں کھلے یا چھپے قانونِ الٰہی کی کتنی ہی خلاف ورزیاں کرتا رہے، مگر دین داری بہرحال اس کے ساتھ چپکی رہے گی۔ اس کا شمار متشرع لوگوں ہی میں ہوگا۔ اور وہ بھی اپنی ظاہری حالت سے دنیا کو، اور شاید اپنے نفس کو بھی، عمر بھر دھوکے میں مبتلا رکھے گا۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص ان کے اس مقررہ پیمانے پر پورا نہ اتر سکا، تو اس کا شمار غیر دیندار لوگوں میں کیا جائے گا۔ پھر اس کی نماز، اس کا روزہ، اس کا انفاق فی سبیل اللہ، اس کی پرہیزگاری، اس کی اخلاقی پاکیزگی، اس کی دینی اور ملّی خدمات، سب کی سب ان کے نزدیک ناقابلِ اعتناء ٹھہریں گی، محض اس لیے کہ فلاں فلاں چند جزئیات اور ظواہر میں اس کا عمل ناقص ہے، جب کہ ان کے ہاں یہ جزئیات اور ظواہر اصولِ دین سے کم اہم نہیں ہیں۔ بلاشبہ شریعت کی جزئیات بھی اپنی اہمیت رکھتی ہیں اور اس کے ظواہر کی بھی قیمت ہے۔ مگر یہ تو نہ ہونا چاہیے کہ انہی کو ایمان و عمل صالح کی اصل کسوٹی بنا دیا جائے۔ یہ تو اک گونہ وہی اندازِ فکر ہے جسے بنی اسرائیل

کے علماء نے اختیار کیا تھا، جس کے نتیجے میں انہوں نے دین کی حقیقی روح اور اس کے واقعی مقاصد کو گم کرکے رکھ دیا تھا اور نرے ظاہر پرست بن کر رہ گئے تھے' یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ ع کو انہیں سفیدی پھری قبریں کہنا پڑا۔

حیلہ بازی کا مطلب یہ ہے کہ فقہی تدبیروں سے حرام کو حلال بنا لیا جائے، یعنی اعمال کی ظاہری شکل میں اس طرح الٹ پھیر کر دیا جائے کہ ناجائز جائز بن جائے۔ اس رویہ کو دین و شریعت کے ساتھ مذاق ہی کہا جا سکتا ہے۔ مگر بڑے دکھ کی بات ہے کہ ایسا بہت ہو رہا ہے' اور ایسا کرنے والے عوام نہیں، کچھ 'خواص امت' ہیں۔ چند مثالوں سے بات اچھی طرح واضح ہو جائے گی:۔

۱۔ بہت سے علماء، خصوصًا اہلِ مدرسہ، زکوٰۃ کا فرض ادا ہو جانے کے لیے 'تملیک' کو شرط کہتے ہیں، یعنی یہ کہ زکوٰۃ دینے والا جس مستحقِ زکوٰۃ کو زکوٰۃ دے اسے اس مالِ زکوٰۃ کا مالک بنا دے، تب جا کر اس کی زکوٰۃ ادا ہوگی۔ اس شرط کی وجہ سے زکوٰۃ مدرسوں کے عام فنڈ میں داخل نہیں ہو سکتی لیکن اگر کوئی شخص ان کے پاس مدرسہ میں دینے کے لیے اپنی زکوٰۃ لاتا ہے تو لے لیتے ہیں، اور اس کی ترکیب یہ کرتے ہیں کہ کسی غریب طالب علم کو بلا کر اسے تلقین کرتے ہیں کہ تم اس مالِ زکوٰۃ کو لے لو، اور لے کر اسے مدرسہ کو ہبہ کر دو۔ اس طرح جو چیز مدرسے کے لیے ناجائز تھی ہاتھ بدلنے سے جائز ہو جاتی ہے!

۲۔ کتنے ہی علماء کے نزدیک اس امر میں کوئی قباحت نہیں کہ ایک شخص، جس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے رکھی ہوں، کسی دوسرے شخص کو کچھ دے کر اس بات کے لیے تیار کرے کہ وہ اس کی مطلقہ عورت سے نکاح کرے اور پھر اسے طلاق دے دے، تاکہ وہ اس کو از سر نو اپنے نکاح میں لے آسکے، اور وہ اس کے لیے حلال ہو جائے۔ جو لوگ اپنی بیویوں کو تین طلاقیں دے کر بعد میں پشیمان ہوتے ہیں اور انہیں دوبارہ اپنے عقدِ نکاح میں لے لینا چاہتے ہیں، انہیں حلالہ کرانے کی یہ تدبیر ہمارے بہت سے دار الافتاؤں میں بلا جھجک سکھائی جاتی ہے، اور ذرا نہیں سوچا جاتا کہ اس سے قرآن حکیم کا مقصد ہی فوت

فوت ہوجاتا ہے۔ اس نے تحلیل کی شرط لگائی ہی اس لیے ہے کہ اس کڑی شرط کی وجہ سے لوگ تین طلاقیں دینے سے ڈریں گے۔ مگر اس حیلہ بازی نے مال دار اور با اثر لوگوں کے لیے اُس چیز کو آسان بنادیا جس کو اللہ تعالیٰ نے مشکل بنا کر رکھنا چاہا تھا۔

۳- بعض لوگ سال ختم ہونے سے کچھ دن پہلے اپنا روپیہ پیسہ اپنی بیوی کو ہبہ کر دیتے ہیں، اور جب دوسرا سال ختم ہونے کے قریب آتا ہے تو اُسے بیوی سے اپنے نام ہبہ کرا لیتے ہیں، اور اس طرح زکوٰۃ ادا کرنے کے فرض سے، 'بزعمِ خویش'، بری الذمہ ہوجاتے ہیں۔

یہ تین مثالیں صورتِ حال کے سمجھنے کے لیے کافی ہیں۔ کیا اِس حیلہ بازی کو کوئی معمولی غلط فکری کہا جا سکتا ہے؟ کیا اس طرزِ فکر کو دیکھ کر ایسا گمان نہیں کیا جا سکتا کہ ان لوگوں کے خیال میں اِن ظاہری تغیرات سے خدا کے نزدیک بھی حقیقت بدل جایا کرتی ہے؟ ان حیلوں کے جواز کے لیے شاید حضرت ایوب علیہ السلام کے واقعے سے سند پکڑی جاتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان حرکتوں پر حضرت ایوبؑ کے تحنُّث کی نہیں، بلکہ اصحابُ السَّبْت کی بازی گری کی مثال صادق آتی ہے، جن کی جھوٹی دینداری کا پول کھولنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے سنیچر (سَبْت) کے دن ان کے لیے مچھلیاں پکڑنا حرام قرار دے دیا تھا۔ مگر انھوں نے یہ ترکیب نکال لی کہ جمعہ کی شام کو جال پانی میں پھینک دیتے، اور اتوار کی صبح کو جا کر جال کھینچ لیتے، اور اس میں پھنسی ہوئی مچھلیوں کو پکڑ لیتے۔ اس طرح ان کا کام تو بن ہی جاتا، ساتھ ہی ان کے خیال میں اتباعِ شریعت کا حق بھی ادا ہو رہتا۔ گویا وہ سمجھتے تھے کہ ان تدبیروں سے خدا بھی دھوکا کھا جائے گا۔ مگر ہوا یہ کہ اللہ کے دین کے ساتھ یہ فراڈ انھیں لے ڈوبا۔ افسوس کہ اس تاریخی مثال سے کبھی عبرت نہ حاصل کی گئی اور بہتوں نے احکامِ دین کے ساتھ حیلہ بازی کا رویہ اختیار کر کے جاہلیت کی تمنا برآری کی حد کر دی۔

یہ ہے سَیُعُودُ غَرِیبًا کی اُس لمبی داستان کا خلاصہ جسے ہم مسلمان تیرہ سو برسوں سے اپنے فکری، ایمانی اور عملی زوال کے ہاتھوں مرتب کرتے چلے آ رہے ہیں۔ جب ہم نے اپنے کو اس حد تک بدل لیا تو اللہ کی اُس سنت کو ظہور میں آنا ہی چاہیے تھا جس کے الفاظ یہ ہیں:-

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ (رعد-۱۱) حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی بھی قوم کی حالت نہیں بدلا کرتا جب تک وہ خود اپنے اندرون کو نہ بدل لے۔

پس جب ہم نے اپنے اندرون کو اس حد تک بدل لیا، اور ہمارے افکار و اعمال میں غیر اسلامی روحِ فاسد اس قدر سرایت کر گئی جس کی تفصیل اوپر کے صفحات میں گزری، تو ہمارے ظاہری حالات بھی قدرت نے بدل کر رکھ دیے۔ کہاں ہم اقوامِ عالم کے فکری اور تہذیبی امام تھے۔ اور اب کہاں ان کی صفِ پائیں میں دو زانو بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس درد انگیز انقلابِ حال کی بنیاد اسی دن پڑ گئی تھی جب ہم نے خود فراموشی کے عالم میں مغرب کو ایک ہاتھ سے قلم اور دوسرے ہاتھ سے تلوار حوالہ کرتے ہوئے اپنی زبانِ حال سے کہا تھا کہ تو

یہ تیغ ہے، یہ طشت ہے، یہ ہم ہیں کشتنی

اپنے طرز کی اس انوکھی خود حوالگی کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ موجودہ جاہلیت اور مادی تہذیب کا بے رحم نشتر اسلامی افکار و اصول اور اس کی ہمہ گیر تعلیمات کی ایک رگ کاٹ لے تو دوسری اس کے سامنے پیش کر دی جائے۔ مغرب[1] سے آواز آئی کہ چودہ سو برس کا پرانا مذہب اب تمدن کے اس برقی اور ایٹمی دور میں انسانی زندگی کی رہنمائی کا کام نہیں دے سکتا۔ ہم نے اپنی زبانِ عمل ہی سے نہیں، زبانِ قول تک سے اس کی ہاں میں ہاں ملا دی۔ اس[2] نے اپنا معاشی نظام سودی بینکنگ اور انشورنس پر قائم کیا، تو ہمارے بادشاہ حکمرانوں کو کون کہے، ہمارا مفتی تک بول اٹھا کہ بینک کا "انٹرسٹ" اور چیز ہے اور قرآن کا حرام کیا ہوا ربوا دوسری چیز ہے، اور اگر ایسا نہ بھی ہو تو دارالکفر میں سود کا لینا بجائے خود جائز ہے جائز ہی نہیں "مفادِ ملت" کو دیکھتے ہوئے مستحسن بھی ہے! ایک[3] خالص الحادی اور مادہ پرستانہ نظام غریبوں، محنت کشوں اور مظلوموں کی دادرسی کا لال جھنڈا لیے آندھی طوفان بن کر آگے بڑھا تو ہم نے یہ کہتے ہوئے اس کا خیر مقدم کیا کہ اسلامی نظامِ عدل و مواسات، اور اشتراکیت صرف نام کی حد تک دو ہیں، ورنہ حقیقت اور مقصد کے اعتبار سے دونوں ایک ہی ہیں۔ تہذیب[4] جدید نے خود نمائی، بے حیائی، عریانی اور فحاشیت کے تانے بانے والے فیشن ایجاد کیے، تو ہمارے "تعلیم یافتہ" اور "روشن خیال" لوگوں نے اسلامی وضع قطع کو

دقیانوسیت کا نشان کہنا شروع کر دیا، اور اس کی طرف تمسخر آمیز اشارے کر کر کے "وَإِذَا مَرُّوا بِهِمْ يَتَغَامَزُونَ" کی یاد تازہ کر دی۔ اباحتِ نفس مغرب کی مرغوب ترین چیز بن گئی تو اس نے پردے کو تاریک خیالی اور انسانیت کی تحقیر ٹھیرا دیا۔ ہم نے اس کی یہ بات سُنی تو اس کے سر میں سر ملانا ضروری سمجھا، اور کتاب و سنت میں پردے کی ہدایات دیکھ کر دل ہی دل میں کٹنے لگے۔ مغربی تہذیب نے تعدد ازواج کو معیوب قرار دیا تو ہمارے دانش وروں اور مصلحوں نے اسے معیوب ہی نہیں قابلِ نفرین کہہ ڈالا۔ قوم پرستی اور وطن پرستی کے نظریات کا بول بالا ہوا تو ہم نے 'حُبُّ الوطن مِن الایمان' کے مقولے کو حدیثِ رسولؐ کے طور پر پیش کر کے ان کی تائید شروع کر دی، اسلامی قومیت کے آفاقی اصول کو دیوار پر دے مارا، اور اس کی عالمگیر وحدت کو عربی، ایرانی، افغانی، ترکی، ہندی، ملیشیائی، انڈونیشی، غرض بے شمار قومیتوں میں تقسیم کر کے رکھ دیا۔ یہاں تک کہ مصر میں بات 'نحن ابناء الفراعنۃ' تک جا پہنچی، ایران میں دو ہزار سال پہلے کی جاہلی تہذیب کو زندہ کرنے کا منصوبہ بن گیا، ترکی میں اسلامی قومیت کے ایک ایک نشان کو مٹا ڈالنے کی مہم چل پڑی۔ اسلامی قوانین کو چھوڑ کر مغربی قوانین اختیار کر لینے پر تو گویا 'اجماع' سا ہو گیا۔

اسلامی افکار و تصورات اور اقدار و قوانین سے یہ ذہنی اور عملی دوری کچھ دو چار ملکوں تک محدود نہیں رہی۔ جو مسلمان ملک بھی ترقی کا منصوبہ لے کر اٹھا، اس نے 'کعبۂ فرنگ' کی طرف منھ کر لیا۔ اِلّا ماشاء اللہ۔ قریب قریب ہر جگہ کے 'ملأِ قوم' نے اپنے ذہن کے دریچے جاہلیتِ جدیدہ کے اکثر افکار و اقدار کے لیے کھول دیے، اور یہ افکار ہمارے نظامِ زندگی کے ایک ایک شعبہ میں سرایت کر گئے۔ اس طرح ہماری اجتماعی فکر پر اس دشمنِ حق کا اتنا گہرا زنگ چڑھ گیا ہے کہ ٹھیٹھ اسلامی افکار کا کوئی نقش اس پر مشکل ہی اتر پاتا ہے۔ صبغۃ اللہ جس ملت کا امتیازی نشان تھا، اس کے سربراہوں کی بڑی اکثریت مغرب کا 'اصطباغ' لینے کے لیے دوڑ لگائے ہوئے ہے، اور قدرتی طور پر عوام بھی کشاں کشاں ان کے پیچھے چلے جا رہے ہیں۔ ان کے ذہنوں کے اندر یہ خیال جما ہوا ہے کہ صحیح الفکری کا کوئی معیار اور ترقی و سربلندی کا کوئی سرچشمہ ہے تو وہ اہلِ مغرب کا قول و فعل ہے۔ گویا

جس طرح قرآن کریم پچھلی کتابوں کی محرّف تعلیمات کا 'مُہیمن' تھا کچھ ویسا ہی بلند مقام ، معاذ اللہ ان مغربی افکار و نظریات کا بھی ہے اور وہ اسلامی اصول و افکار کے مہیمن ہیں ! جاہلیت کی اس سے بڑی تمنا اور کیا ہو سکتی تھی ؟ اس کے بعد اگر یہ کہا جائے کہ اسلام کی حقیقت اور اس کی صورت ، دونوں ہی چیزیں اس کے پیروؤں کی بہت بڑی اکثریت کے لیے کافی حد تک 'غریب' اور اجنبی بن چکی ہیں تو یہ کہنا کیسے غلط ہوگا۔



سَیَعُوْدُ غَرِیْبًا کَمَا بَدَءَ (۲)

[بیرونِ ملت]

اسلام اور تہذیب جدید

جب اسلام کا حال خود اس کے اپنے گھر میں یہ ہو گیا ہو اور وہ اپنے 'وطن' ہی میں مختلف پہلوؤں سے اِس حد تک غریب اور اجنبی بن چکا ہو تو باہر کی دنیا میں اس کی غربت اور اجنبیت کا جو بھی حال نہ ہو جاتا کم ہی تھا۔ جب اس دین کے پیرو جاہلیت کی یلغاروں سے خود اپنا تحفظ نہ کر سکے تو وہ دوسروں کو اس کی غارت گری کے خلاف کیا مدد پہنچا سکتے تھے۔ اس لیے اسے وہاں ہر طرف میدان کھلا مل گیا، اور وہ اپنی گرفت آسانی سے مضبوط سے مضبوط تر کرتی چلی گئی۔ جس کے فطری نتیجے میں باہر کی پوری دنیا اسلام سے بے گانہ ہو کر رہ گئی، نہ اس کی حقیقت سے واقف، نہ اس کی صورت کی شناسا۔

جاہلیتِ جدیدہ کی علم برداری مغربی تہذیب کر رہی ہے۔ اس تہذیب کی بنیاد یورپ کے صنعتی انقلاب نے ڈالی تھی۔ اور خود اِس انقلاب کی داغ بیل فکر و نظر کی اس آزادی کا صدقہ تھی جو مغرب کو اسلام کے طفیل ملی تھی۔ مگر جاہلیت کی خوش قسمتی کہ اِس تہذیب نے اسلام کی اِس ایک چیز کو تو لے لیا مگر اس کی مزید قدر شناسی نہ کی، اور اس کی تعلیمات سے یکسر بے نیازی برتتے ہوئے اپنے من مانے رُخ پر آگے قدم بڑھاتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ جب مسلمانوں کی خالی کی ہوئی علمی اور تہذیبی مسند اس کے قبضے میں آئی تو اس حال میں آئی کہ اسے اسلام سے عناد اور توحّش کا روگ بری طرح چمٹا ہوا تھا۔ اس عناد اور توحش نے اُسے اسلام سے، اسلامی تصورِ حیات سے، اور اسلامی اصول و اقدار سے بیگانہ بنا ڈالا۔

اس بیگانہ پن کو ایک بیرونی انقلابِ فکر نے اور بڑھاوا دے دیا اور اسے انتہاء پر پہنچا دیا۔ یہ فکری انقلاب عیسائیت کی زبوں حالی کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ اس دور میں جو عیسائیت رائج تھی وہ بے جان اور محرّف عیسائیت تھی، اور عقلیت و آزادیٔ فکر کا گلا بری طرح دبوچے ہوئی تھی۔ جب اسلام کی بدولت ملی ہوئی روشنی پا کر یورپ نے اوہام کے اندھیرے سے نکلنا چاہا تو اس نے خشمناک ہو کر اس کی مخالفت کی، حتیٰ کہ جنگِ مغلوبہ تک شروع کر دی۔ حریت پسند کافر قرار دے دیے گئے۔ اور مذہبی عدالتیں قائم کر کے انہیں انتہائی وحشیانہ سزائیں دی گئیں۔ جس کے بعد آزادیٔ فکر کا یہ شعلہ دبنے کے بجائے اور بھڑک اٹھا۔ پہلے تو اس شعلے نے پوپ اور چرچ کے 'مقدس' اقتدار کو پھونکا پھر آگے چل کر خود عیسائیت کی خبر لے ڈالی۔ اور آخر میں نفس مذہب ہی کے درپے ہو گیا۔ کیونکہ عیسائیت کی اس بے محابا حریت دشمنی نے یہ خیال پیدا کر دیا تھا کہ علم و حکمت اور مذہب میں فطری بیر ہے' اس لیے جب تک راستہ کا یہ بھاری پتھر ہٹا نہیں جاتا علم و تحقیق کے میدان میں قدم نہیں بڑھایا جا سکتا۔ چونکہ مذہب کی بنیاد خدا اور آخرت کے اعتقاد پر ہوتی ہے اس لیے آزادیٔ فکر کے علم برداروں نے آگے چل کر انتقام اور مخالفت کے جوش میں خدا اور آخرت کے تصوّر ہی پر کلہاڑا چلا دیا، اور اسرارِ کائنات کی گتھی سلجھانے، سائنسی تحقیق کرنے اور علوم و فنون کی تدوین کے سلسلے میں وحیِ الٰہی سے رہنمائی حاصل کرنے کے بالکل روادار نہ رہ گئے۔ اب خدا سے بے نیازی کی فضا میں مغربی فلسفے اور سائنس نے جب اپنا قدم آگے بڑھانا شروع کیا تو اس کا مدار نیچریت اور مادیت ہی پر رہ سکتا تھا۔ اگرچہ سترھویں صدی تک اس فکری اور علمی تحریک کے علم بردار اپنے اِس رجحان کو اچھی طرح محسوس نہیں کر سکے تھے، اس لیے نیچریت کے ساتھ ساتھ وہ خدا کے وجود اور اخلاق کی ضرورت کے خیال کو بھی نباہنے کی کوشش کرتے رہے۔ مگر یہ دو کشتیوں کا سفر دیر تک جاری نہیں رہ سکتا تھا، نہ رہ سکا۔ چنانچہ اٹھارہویں صدی میں ہولباخ، لابٹری، مانٹیکیو اور روسو وغیرہ آزاد خیال فلسفیوں نے اس فکری انقلاب کے رخ کو قریب بالکل ہی مادّیت پرستی کی طرف پھیر دیا۔ پھر بعد کی صدی میں یہ مادّیت اپنے نقطۂ کمال کو پہنچ گئی۔ اور نام نہاد عقلیت کی عدالت میں کسی

ما فوق الفطرۃ ہستی کے اعتقاد سے بڑھ کر کوئی نا قابلِ معافی جرم نہیں رہ گیا۔ ڈارون کے نظریۂ ارتقاء نے، اور اس نظریے کی ترجمان کتاب "اصل الانواع" نے، جو ۱۸۵۹ء میں شائع ہوئی تھی، اس نظریے کو ایسا مقام دے دیا گویا وہ ایک سائنٹفک حقیقت ہے، جسے چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وہ نظریہ ہے جس کے پیٹ سے مغرب کے موجودہ نظامِ تہذیب کا، اس کے معاشی تصورات کا، اس کے اخلاقی نظریات کا، اس کے معاشرتی اصولوں کا اور اس کے سیاسی افکار کا جنم ہوا ہے۔ فاشزم بھی اسی کی پیداوار ہے۔ ظالمانہ سرمایہ پرستی اور اشتراکیت کی خاردار جھاڑیاں بھی اسی کی جڑ سے نکلی ہیں۔ غرض زندگی کا پورا نظامِ فکر و عمل، عقلِ سلیم اور فطرتِ صحیح کے تقاضوں کو ٹھکرا کر مادیت اور بے دینی کی بنیادوں پر کھڑا کر دیا گیا۔ اور پھر تقریباً پوری دنیا میں اس کا سکہ جاری ہوتا چلا گیا۔

یہ صحیح ہے کہ باہر کی پوری دنیا اس تہذیب کی دہریت اور خدا بیزاری سے اتفاق نہیں رکھتی، بلکہ اکثریت خدا اور مذہب کی قائل ہی ہے، مگر اسلام کی حد تک اس سے کوئی بڑا فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ یہ تہذیب کوئی معمولی قسم کی اور محدود حلقہ اثر رکھنے والی تہذیب نہیں ہے، بلکہ تقریباً پوری دنیا کی حکمراں تہذیب ہے، اور خواہی نہ خواہی قریب قریب سبھی اقوامِ عالم کی گردنوں میں اس کی پیروی کا قلادہ پڑا ہوا ہے۔ آج اگر فلسفہ مقبول ہے تو اُس کا، علوم اگر مانے ہوئے ہیں تو اس کے، افکار و نظریات قابلِ اتباع کہے جاتے ہیں تو اُس کے، قدریں اگر لائقِ تسلیم قرار دی جاتی ہیں تو اس کی، تمدنی اور تعلیمی، معاشرتی اور معاشی، سیاسی اور قانونی، قومی اور بین الاقوامی نظام اگر موجبِ فلاح و ترقی سمجھے جاتے ہیں تو اس کے، آئین اور قوانین اگر سند ٹھہرائے جاتے ہیں تو اس کے۔ اس لیے جب ہم اس تہذیب کی بات کرتے ہیں تو اس سے مراد وہ پوری دنیا ہوتی ہے جو طوعاً یا کرہاً اس کے پیچھے چلی جا رہی ہے۔ اس تہذیب سے اور اس کی پیرو دنیا سے اس بات کی ہرگز کوئی توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اسلام سے، اسلامی تہذیب سے، اسلامی قدروں سے، اس کے قوانین سے، اس کے افکار و تصورات سے، اس کے معیارِ خیر و شر سے اور اس کی تعلیمات سے کوئی اُنس رکھ سکے گی، اس کی باتوں سے وحشت نہ کھائے گی، اس کی دعوت کا مذاق نہ اڑائے گی۔ آخر اس مُریدِ نفس تہذیب کو دینِ فطرت کی ان تعلیمات سے پوری

پوری اجنبیت کیوں محسوس نہ ہوگی جن کی تہ میں نفسانیت اور حیوانیت کا کوئی عنصر نام کو بھی نہیں پایا جاسکتا، جب کہ جاہلیت کی اس شاہکار تہذیب کی پوری اٹھان ہی اِسی نفسانیت اور مادہ پرستی کی بنیاد پر ہوئی ہے۔ دونوں کا یہ جوہری تضاد اور یہ اختلافِ مقاصد انہیں ایک دوسرے کا شناسا کیسے بننے دے سکتا ہے۔ کیا دو بالکل الٹی سمتوں کے مسافروں میں کوئی جان پہچان ہوسکتی ہے؟ اگر نہیں ہوسکتی تو ماننا پڑے گا کہ یہ نئی تہذیب بھی اسلام کو جان پہچان نہیں سکتی، نہ اس کی باتیں اس کی سمجھ میں آسکتی ہیں۔ بلاشبہ اس تہذیب نے عقل و خرد کا خوب استعمال کیا ہے اور تحقیق و اکتشاف کے میدان میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ مگر اس سے دھوکا نہ کھانا چاہیے۔ عقل و خرد کا یہ قابلِ رشک استعمال اس نے صرف مادیات کے سلسلے میں کیا ہے، اخلاقیات اور روحانیات کی طرف تو اس کا کبھی رخ ہی نہیں ہوسکا ہے۔ اس لیے اس تہذیب کی دل دادہ دنیا چاہے فضا سے آگے بڑھ کر بعید ترین خلا تک جا پہنچے اور سمندروں کی آخری گہرائی تک اتر تی چلی جائے، اُس قرآن عزیز کی بلندیوں تک اور اس کے معانی کی گہرائیوں تک ہرگز نہیں پہنچ سکتی جو کائنات کے اسرار و حقائق پر فضا سے نہیں، خلا سے بھی نہیں، عرش سے نظر یں ڈالتا ہے اور جب اس کے لیے یہ ممکن نہیں تو اس کا اسلام شناس بن پانا بھی ممکن نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سَیَعُوْدُ غَرِیْبًا کی جو پیش گوئی فرمائی گئی تھی وہ امتِ مسلمہ سے باہر کی دنیا کی حد تک کب کی پوری ہو چکی ہے۔ اس سے افراد تو مستثنیٰ ہوسکتے ہیں، کوئی قوم مستثنیٰ نہیں ہوسکتی۔ قوموں کے لیے تو وہ کم و بیش ویسا ہی اجنبی اور نامانوس بن چکا ہے جیسا اجنبی اپنے ظہور کے وقت اُس دور کے جاہلی معاشرے کے لیے تھا۔ چنانچہ مشاہدہ بتا سکتا ہے کہ قرآن کریم کی باتوں کو سن کر آج کے 'دانش وروں' پر تمسخر کا وہی دورہ پڑ جاتا ہے جو چودہ سو اچودہ سو برس پہلے کے جہلاء پر پڑ جایا کرتا تھا۔ دینِ حنیف کی پاکیزہ اور بلند تعلیمات کی سمائی جس طرح ساتویں صدی عیسوی کے عربوں کے تنگ و تاریک دماغوں میں نہیں ہو پا رہی تھی اُسی طرح بیسویں صدی کے 'وسیع النظر' اور 'روشن' دماغوں میں بھی نہیں ہو رہی ہے۔ دنیا کی 'فکرِ رسا' اپنی حیرت انگیز اڑانوں کے باوجود توحید، آخرت اور رسالت کے بارے میں ویسی ہی بے بال و پر دکھائی دیتی ہے جیسی کہ پرانی جاہلیت تھی۔

اسلام ناشناسی کی انتہا

مغربی تہذیب کی پیرو دنیا اسلام سے کتنی بیگانہ ہو چکی ہے اور اسلام اس کے لیے کتنا اجنبی بنا ہوا ہے، اس امر کا پورا پورا اندازہ اُسی وقت ہو سکے گا جب زندگی کے مختلف مسائل کے بارے میں اُس کا نقطۂ نظر ہمارے سامنے ہو، اور اس کی وہ تنقیدیں بھی سامنے ہوں جو اس نے ان مسائل کے سلسلے میں اسلام پر کی ہیں۔ اس لیے آئیے ذرا تفصیل سے دیکھیں کہ زندگی کے اہم مسائل اور حقائق کے بارے میں ان دونوں ازلی حریفوں کے مابین افکار و خیالات کے قُرب و بُعد کا کیا حال ہے۔

۱۔ عقل انسانی کے معاملے میں

سب سے پہلے عقل کے مسئلے کو لیجیے، جو نوعِ انسانی کا مخصوص اور امتیازی جوہر ہے اور جس کی بدولت انسان تمام جانداروں سے الگ ایک ممتاز مخلوق بنا ہے۔ اس عقل کو اسلام نے جو مقام دیا ہے اسے کتاب کی ابتدائی بحث میں آپ وضاحت کے ساتھ معلوم کر چکے ہیں۔ تہذیبِ جدید کے علم بردار اسے جو حیثیت دیتے ہیں وہ اس کے ٹھیک برعکس ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ عقل کا فریضہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ آدمی کی خواہشوں کی تکمیل کے لیے ایک باوفا اور باتدبیر خادم بنی رہے۔ اس طائفے کا ایک مشہور فرد، پروفیسر جوڈ، اپنی کتاب "گائڈ آف ماڈرن تھاٹ" میں نہایت صفائی سے لکھتا ہے:

> "عقل دراصل ہماری خواہشوں کی لونڈی ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ جو مقاصد ہم غیر شعوری طور پر متعین کریں وہ ان کے حصول کے ذرائع بہم پہنچائے، اور جو کچھ ہم کرنا چاہیں اس کے جواز کے لیے دلائل فراہم کر دے۔"

اور ڈارون یہ بتا ہی چکا ہے کہ انسان فی الواقع ایک ترقی یافتہ حیوان ہے۔ اس لیے جوڈ نے جس چیز کو "ہماری خواہشات" کہا ہے، اس سے مراد انسان کی حیوانی خواہشات ہی ہو سکتی ہیں۔ اس نظریے کی بنیاد پر انسان کی خوش بختی اور کامیابی کی سبیل، منطقی طور پر

صرف یہی ہوسکتی ہے کہ وہ اپنی نفسانی اور حیوانی خواہشوں کو پورا کرنے کے لیے کارگر سے کارگر طریقے ایجاد کرتا اور انہیں ترقی دیتا رہے۔ پرانی جاہلیت میں، اس کی تمام ترظلمت پسندیوں اور نفس پرستیوں کے باوجود، پھر بھی کچھ نہ کچھ حیا موجود تھی۔ وہ کم سے کم انسان کو انسان تو تسلیم کرتی تھی۔ مگر آفریں ہو آج کی مہذب جاہلیت پر، کہ اس نے یہ ہلکا سا پردۂ حیا بھی اپنے چہرے پر باقی نہیں دیا، اور پوری 'محققانہ' شان کے ساتھ انسان کو حیوان اور عقل کو نفس کا غلام قرار دے دیا۔ جب کہ اسلام انسان کو زمین پر اللہ رب العالمین کا 'خلیفہ' اور فرشتوں کا 'مسجود' بتاتا، اور عقل کو انسانیت کا اصل جوہر کہتا ہے۔ دونوں کا یہ نظریاتی فرق بداہتہً مشرق اور مغرب کے فرق سے ذرہ برابر بھی کم نہیں۔ ظاہر ہے کہ بنیاد کا یہ فرق آگے کہیں بھی دونوں کو باہم قریب نہیں آنے دے سکتا۔ اس لیے اسلام کے دوسرے تمام تصورات بھی اس جاہلیت کے لیے ناقابلِ فہم اور راجعو بہ ہی قرار پائیں گے۔ آگے کی بحثوں میں اس حقیقت کی تصدیق آپ کو قدم قدم پر ملتی جائے گی۔

۲- وجودِ باری کے معاملے میں

قدیم جاہلیت خدا کے وجود کی منکر نہ تھی۔ وہ خدا کے صرف ایک ہونے کا انکار کر رہی تھی۔ اور انکار اس لیے کر رہی تھی کہ توحید کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ وہ دراصل الوہیت کو بشریت پر قیاس کر کے کہتی تھی کہ اکیلا ایک خدا اتنی بڑی کائنات کو کیسے چلا سکتا ہے؟ اتنے بڑے کام کے لیے تو مددگاروں کی ایک فوج درکار ہونی چاہیے۔ اپنے اسی خیال کی بنا پر اس نے خدا کو بہت سے شریک اور مددگار ٹھیرا کر خدائی کے کاموں کو ان میں تقسیم کر رکھا تھا۔ مگر یہ تقسیم خدائی کے صرف کچھ کاموں تک محدود تھی، خدا کی اکثر بنیادی صفات تک تجاوز نہیں کر سکی تھی۔ ان صفات کو، مثلاً تخلیق کو، رزاقی کو، حکمت کو، قدرت اور علمِ کُل کو وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کے لیے مخصوص مانتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ جہاں یہ بہت سے چھوٹے بڑے معبود اور رب اور شفیع و شریک ہیں، اُسی طرح ہمارا اور ان سب کا ایک اِلٰہُ الآلِہَۃ اور ربُّ الارباب بھی ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ ہے۔ مگر جاہلیتِ جدیدہ سرے سے خدا کے وجود ہی کی منکر ہے۔ وہ

اِس کائنات اور اِس مستحکم نظام کے لیے کسی خالق اور کسی مدبّر اور کسی فاعلِ خود مختار کی کوئی ضرورت ہی تسلیم نہیں کرتی۔ اس کی نام نہاد عقلیت (ریشنلزم) کا دعویٰ ہے کہ کائنات کا یہ بھاری بھرکم اور باحکمت نظام ایک ایسی اندھی فطرت اور ایک ایسی جاہلِ محض طبیعت کارہینِ منت ہے جو نہ علم رکھتی ہے نہ ارادہ، نہ کچھ سوچ سکتی ہے نہ دیکھ سکتی ہے اور نہ سن سکتی ہے۔ اس سے اگر آپ کہیں کہ یہ گراموفون، یہ ریڈیو، یہ ٹیلیویژن، یہ کمپیوٹر خود بخود بن گئے ہیں، یا انہیں ایک ایسی طاقت نے بنایا ہے جو ریاضی کی ابجد سے بھی واقف نہیں، بلکہ جو اندھی اور بہری بھی ہے اور بے علم و بے شعور بھی ہے ــــ تو وہ آپ پر ہنسے گی، اور کہے گی کہ کیا باولوں کی سی بات کرتے ہو۔ مگر وہ خود پوری بے تکلفی سے یہ حکم لگاتی ہے کہ یہ عظیم الشان کارخانۂ عالم کسی علیم و حکیم اور قادرِ مطلق صانع کے بغیر آپ سے آپ بن گیا ہے اور اس کے بغیر ہی چل بھی رہا ہے، مادّے میں زندگی ایک طبعی عمل سے خود بخود پیدا ہو جاتی ہے، مادّے کے بے جان اور بے شعور ذرات سے بے شمار انواع نت نئے ڈزائن پر خود بخود ایک طبعی ارتقاء کے نتیجے میں بنتی چلی جاتی ہیں، انسان جیسی حیرت انگیز مخلوق کو محض 'تنازع للبقا'، اور 'انتخابِ طبیعی' اور 'بقائے اصلح' کے قانون نے ایک خلیےؔ کے کیڑے سے انسان بنا دیا ہے، اور اس میں عقل ایک بے عقل طاقت نے پیدا کر دی ہے، اس میں شعور ایک بے شعور قانون کے زور سے وجود میں آگیا ہے، اور اس کے اندر محبّت، شفقت اور رحم دلی، غصہّ، غضب اور نفرت وغیرہ کے جذبات ایک ایسے سرچشمہ کا فیضان ہیں جہاں اِن جذبات کا نام و نشان تک نہیں پایا جاتا ــــ آتنی چکرا دینے والی باتیں وہ حیرت انگیز ڈھٹائی سے کہتی ہے اور اسی ڈھٹائی کے ساتھ ان کو سائنس اور حکمت اور عقلیت کے نام سے کتابوں میں لکھتی اور دانش گاہوں میں پڑھاتی ہے۔ پھر تعجب کی انتہاء یہ ہے کہ اس کو ہنسی اپنی جہالت اور بے عقلی کی اِن باتوں پر نہیں آتی، بلکہ اُس دینِ مبین کی باتوں پر آتی ہے جو اسے فی الواقع حقیقت کا علم دینا چاہتا ہے اور کائنات کے صحیح عقلی مطالعے کی راہیں سُجھاتا ہے۔ اس دینِ مبین کی کتاب، خدا کے وجود اور اس کی صفات جمال و کمال پر فطرت اور وجدان کی شہادتیں پیش کرتی ہے تو اسے وہ وہم اور سخن سازی قرار دیتی ہے، آفاق و انفس کے اندر خالقِ حکیم کی ہستی کے کھلے ہوئے آثار کا مشاہدہ کراتی ہے

تو وہ منہ بنا کر ان کی نام نہاد سائنٹفک توجیہیں کرنے لگتی ہے۔ جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اینٹوں اور پتھروں کو ایک معمولی سی عمارت کے بارے میں تو تو یہ سننا بھی نہیں چاہتی کہ یہ نہ کسی بنانے والے کی بنائی ہوئی ہے نہ اس کے بننے کا کوئی مقصد ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ کائنات کی اس وسیع ترین اور محکم ترین خوبصورت عمارت کے بارے میں تو نہ کسی باکمال معمار کی ضرورت تسلیم کرتی ہے نہ اس کی تعمیر کا کوئی مقصد مانتی ہے، تو وہ اپنی زبانِ قال سے نہ سہی، زبانِ حال سے یہ جواب دیتی ہے کہ 'بے شک کوئی عمارت کسی معمار کے بغیر نہیں بن سکتی، مگر اس کائنات کے بارے میں صحیح بات یہی ہے کہ وہ محض اتفاق سے وجود میں آگئی ہے اور اس کے اندر کام کرنے والے قوانین کسی قانون بنا والے کے بغیر خود بخود بن گئے ہیں، اور کسی نافذ کرنے والے کے بغیر آپ سے آپ نافذ ہو گئے ہیں'۔ گویا اس کے نزدیک یہ بات صرف اس لیے صحیح ہے کہ اس کے مانے بغیر چارہ نہیں، ورنہ خدا کا ماننا لازم آجائے گا، جب کہ خدا کو کسی حال میں نہیں ماننا ہے۔ قرآنِ حکیم پھر سمجھانے کی کوشش کرتا ہے، اور کائنات کی محکم ساخت کی طرف توجہ دلا کر پوچھتا ہے کہ غور تو کرو اس کے مختلف اجزاء میں حیرت انگیز توافق کہاں سے اور کیسے وجود میں آیا ہے؟ اس بھاری بھرکم مشین کے لاکھوں کروڑوں پرزے کیونکر آپس میں فٹ ہو گئے ہیں؟ اگر یہ زمین اور آسمان، یہ چاند اور سورج، یہ ان گنت تارے اور سیارے اور یہ بے شمار کُرے کسی حکیمانہ منصوبے کے بغیر خود پیدا ہوتے چلے گئے ہیں تو ان کے درمیان توازن اور ٹھیک اندازہ کیسے قائم ہو گیا ہے؟ زمین کے اندر یہ بات کیسے پیدا ہو گئی کہ وہ جانداروں کے رہنے سہنے اور چلنے پھرنے کی ضرورتوں کے سامنے سرفگندہ اور 'ذلول' بنی رہے؟ مٹی کے اندر یہ صلاحیت کہاں سے آئی کہ بادلوں کی برسائی ہوئی بارش کو قبول کر کے اپنے اندر پڑے ہوئے بیجوں کو روئیدگی بخش دے؟ پانی کے مزاج میں بھاپ بن کر ہوا کے کندھوں پر اڑتے پھرنے، اور پھر پلٹ کر قطروں کی شکل اختیار کر کے زمین پر برس جانے کی استعداد کس طرح پیدا ہوئی؟ کیا کائنات کے ان سارے اجزاء میں اس اثر آفرینی اور اثر پذیری کی موجودگی، ہزار ہا کروں کی یہ ہم آہنگی، اور متضاد عناصر کا یہ باہمی توافق و تعاون اپنے پیچھے کسی دانا، حکیم، مدبر اور فعالٌ لِمَا یُرِیْدُ ہستی کا ہاتھ نہیں

رکھتا ؛ قرآنِ عزیز کا یہ استدلالی وار سخت اور بے پناہ سہی، مگر سائنس اور فلسفے کے نام نہاد ہتھیاروں سے مسلّح جاہلیت کب ہار ماننے والی ہے۔ چنانچہ وہ فوراً 'اتفاقات' اور 'مادّے کے طبعی خواص' کی ڈھال سامنے کر دیتی ہے۔ اور جب اس سے بھی کام نہیں چلتا تو جھنجھلا کر چیخ پڑتی ہے کہ میں خدا وداکو ہرگز نہ مانوں گی جب تک اسے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لوں۔ اس کی طرف سے اس ہٹ دھرمی کا مظاہرہ ہو جانے کے بعد بھی اگر اس کا تعاقب جاری رکھا جائے اور کہا جائے کہ اچھا، اگر کسی چیز کے ماننے کا انحصار اسی بات پر ہے کہ اسے آنکھوں سے دیکھ لیا جائے، تو بتا کیا تو نے اُن 'اتفاقات' کے عملِ تخلیق کو ہوتے ہوئے دیکھا ہے جنہیں تخلیقِ کائنات کا سبب قرار دیتی ہے ؟ تو اس کا جو جواب ہو گا وہ شاید یہی ہو گا کہ یہ کیا فضول سوال ہے۔ اس کے بعد بھی اگر اس کا پیچھا نہ چھوڑا جائے اور پھر پوچھا جائے کہ جب خدا کا وجود اور 'اتفاق کا عملِ تخلیق'، دونوں ہی چیزیں دیکھے نہ جانے میں برابر کی شریک ہیں تو بتا، خارجی قرائن اور دلائل کس قیاس کے حق میں ہیں ؟ آیا اس قیاس کے حق میں کہ کوئی قادرِ مطلق خدا ضرور ہے جس نے اس عظیم کائنات کو پیدا کیا اور اسے چلا رہا ہے، یا اس قیاس کے حق میں کہ کسی اتفاقی حادثے نے اس کائنات کو جنم دے دیا ہے ؟ اغلب یہ ہے کہ اس سوال پر جاہلیت کی بھنویں تن جائیں گی، اور وہ گفتگو کا دروازہ بند کر دے گی۔ اب کون کہہ سکتا ہے کہ پچھلے زمانوں کی 'پس ماندہ' جاہلیتوں اور اس 'ترقی یافتہ' جاہلیت کے درمیان حق بے زاری کے معاملے میں کوئی فرق ہے ؟ ہاں، اتنا فرق ضرور ہے پچھلی جاہلیتوں نے جو بات پھوہڑ پن اور نامعقولیت کے ساتھ کہی تھی، ٹھیک ویسی ہی نامعقول بات یہ جاہلیت فلسفیانہ آب و رنگ دے کر کہتی ہے۔ لیکن 'جامہ پوشی' کا انداز بدل جانے سے آنکھوں والوں کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ 'جامہ' جیسا بھی پہن لیا جائے، 'اندازِ قد' تو اپنی جگہ برقرار ہی رہتا ہے۔ ایک قدیم جاہلیت کے علمبردار (فرعون) نے اپنے مدار المہام (ہامان) کو حکم دیا تھا کہ ذرا میرے لیے ایک (اونچا سا) محل تو بنوا دو، تاکہ اس پر چڑھ کر موسیٰ کے خدا کا پتہ لگاؤں (سورہ غافر آیت ۳۶-۳۷) اور اس دور کا ایک امام جاہلیت (برژنیف) اپنے اسپوتنیک خلا میں بھیج کر دنیا کو یہ بتاتا ہے کہ 'جائزہ لے کر

دیکھ لیا گیا، کائنات کی پہنائیوں میں کہیں بھی خدا کا وجود نہیں۔ غور کیجیے، جو لوگ جاہلیت کے سحر سے اس حد تک مسحور ہو چکے ہوں کہ خدا کے وجود جیسے اہم ترین مسئلے میں بھی اس طرح کے تمسخر سے باز نہ رہ سکیں، کیا اُن سے رائی برابر بھی یہ توقع رکھی جا سکتی ہے کہ ان کے لیے وہ اسلام کوئی قابلِ فہم شے ہو سکتا ہے جس کی بنیاد ہی خدا کے وجود اور اس کی توحید پر رکھی ہوئی ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ دنیا میں سرخ اور زرد اور سفید دہریے ہی تو نہیں بستے، خدا کے ماننے والے بھی کروڑوں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں' ان کے لیے تو اسلام کی کم از کم یہ ایک چیز، ایمان باللہ، کوئی نامانوس اور اجنبی بات نہ ہوگی۔ مگر یہ کہنا اور ایسا سمجھنا صحیح اُسی وقت ہو سکتا تھا جب خدا کے ماننے والے یہ کروڑوں افراد خدا کو اُسی طرح مانتے ہوتے جس طرح ماننے کی اسلام تلقین کرتا ہے۔ مگر یہاں حال تو یہ ہے کہ ان سب نے ایمان باللہ کی حقیقت کھو دی ہے۔ اس لیے یہ لوگ خدا کو ماننے کے باوجود اسلام کے تصورِ خدا کو اپنے لیے کم و بیش ایک اجنبی تصور ہی پائیں گے۔ اور اگر کچھ لوگ خدا کو فی الجملہ صحیح طور پر مانتے بھی ہیں تو وہ ایسے لوگ ہیں جو اپنے سینوں میں دل کے بجائے پتھر لیے ہوئے ہیں' اور اس سنگدلی نے ان کے ایمان باللہ کو نسلی غرور اور ملی تعصب کی بھاری سلوں کے نیچے دبا کر رکھ دیا ہے۔ دل کے ایسے بے حس لوگوں سے یہ توقع ہرگز نہیں کی جا سکتی کہ ان کے لیے اسلام کا تصورِ خدا قابلِ قبول ہو سکے گا۔

۳۔ عقیدۂ آخرت کے معاملے میں

قیامت اور آخرت کے عقیدے کے بارے میں بھی غیر مسلم دنیا اگرچہ غیر مذہبی اور مذہبی، دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے، مگر جہاں تک اس کے اسلامی تصور کا سوال ہے، دونوں ہی کی اجنبیت کا حال تقریبًا یکساں ہے۔ لامذہبوں کی تو کچھ پوچھیے ہی نہیں۔ مرنے کے بعد از سرِ نو زندہ کیے جانے کی بات جس طرح قبل از نوح ؑ سے لے کر ڈیڑھ ہزار برس پہلے تک پائی جانے والی قوموں کے ہاں قابلِ حیرت، بعید از فہم اور مضحکہ خیز سمجھی جاتی رہی ہے، اسی طرح، بلکہ اس سے بھی زیادہ، اس بیسویں صدی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ڈاکٹروں اور اسکالروں کے نزدیک بھی قابلِ حیرت اور مضحکہ خیز سمجھی جا رہی ہے۔ ان کی بھی سمجھ میں

نہیں آتا کہ جسم کے جو ذرات مٹی میں مل کر مٹی بن چکے ہوں، یا جنہیں ہوا کے جھونکوں اور پانی کی لہروں نے دور دور تک بکھیر ڈالا ہو، وہ یکایک اکٹھے ہو کر پھر زندہ جسم کی شکل کیسے اختیار کر لیں گے۔ ان کا کہنا ہے کہ مارنے اور جلانے والی کسی قادرِ مطلق ہستی کا تخیل محض وہم کی پیداوار ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ بے جان مادی اجزاء کو نہ کوئی بیرونی طاقت ترتیب دے کر اور جوڑ کر جسم کی شکل دیتی ہے نہ ان میں جان پیدا کرتی ہے۔ مادہ کے اجزاء خود اپنے اندرونی نظم میں ترقی کرتے کرتے جاندار ہیئت میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ جب یہ نظم درہم برہم ہو جاتا ہے تو وہ انرجی اور قوتِ حیات، جسے مادّے کے ایک خاص امتزاج نے طبعی طور پر پیدا کر رکھا ہے آپ سے آپ فنا ہو جاتی ہے، اور یہ فنا اِس جسم کی فنائے محض ہوتی ہے۔ کوئی قیاس اور علمی تحقیق اس بات کی نشاندہی نہیں کرتی کہ جسم کے قالب میں 'روح' نام کی کوئی چیز باہر سے آکر داخل ہوتی ہے، جو اس سے نکل جانے کے بعد بھی کہیں باقی رہتی ہے۔ اِسی طرح لاکھوں برس سے، جب تخلیقِ انسانی کی ابتداء ہوئی تھی، آج تک اس امر کا بھی کوئی مشاہدہ نہیں ہو سکا ہے کہ کوئی شخص مر کر جی اٹھا ہو۔ لٰہذا یہ حشر و نشر، یہ حساب و کتاب، یہ جزا و سزا، سب باتیں محض باتیں ہی ہیں، اور ان کا سرچشمہ وہم اور ضعیف الاعتقادی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ جو چیز تجربے یا مشاہدے میں آئے، یا عقل جسے قبول کرے، وہی حقیقت ہو سکتی ہے۔ اِن کسوٹیوں پر پوری نہ اترنے والی چیزیں صرف افسانہ، تاریک خیالی اور عجائب پسندی ہوتی ہیں۔ ہست اور زیست کے سلسلے میں مظاہر کو دیکھ کر ہم یہ تو تسلیم کر سکتے ہیں کہ یہ نظامِ عالم کبھی ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔ اس امکان سے بھی انکار نہیں کہ کبھی کوئی آسمانی کرہ زمین سے ٹکرا جائے اور زمین پاش پاش ہو کر رہ جائے کیونکہ فضا میں ایسی ٹکڑوں کا مشاہدہ کیا جا چکا ہے لیکن انسان کی فنا کے بعد اس کو دوبارہ زندگی مل سکتی ہے، یہ بات مشاہدے میں کبھی نہیں آئی ہے۔ اس لیے کیسے مان لیا جائے کہ آئندہ کبھی ایسا ہو سکے گا۔ یہ لوگ اپنی اِس منطق پر اس قدر مصر ہیں کہ قرآن حکیم کی تفہیموں اور دلیلوں کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا، ٹھیک اسی طرح جس طرح عرب کے جاہل منکروں پر نہیں ہوا تھا۔ حالانکہ یہ دلیلیں اتنی دل نشین ہیں کہ کسی بھی حق پسند کو اپنا

قائل بنائے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ وہ کہتا ہے کہ اگر بے جان مادے میں آئے دن جان پیدا ہوتی رہتی ہے اور اس کے نتیجے میں ذی حیات مخلوقات برابر وجود میں آتی رہتی ہیں تو مرنے کے بعد اِسی عمل کو کیوں نہیں دہرایا جا سکتا؟ اگر مہینوں اور برسوں سے مردہ پڑی ہوئی زمین بارش سے دوبارہ زندگی پا جاتی ہے تو مرے ہوئے جانداروں کو پھر سے کیوں زندہ نہیں کیا جا سکتا؟ تمہیں موت کے بعد زندگی کی بات سن کر حیرت ہوتی ہے، حالانکہ اس سے بدرجہا زیادہ حیرت انگیز واقعہ تو تمہارا عدمِ محض سے وجود میں آنا ہے۔ جب اتنی بڑی حیرت انگیز بات وقوع میں آ گئی تو اِس سے کم تر درجے کی بات پر تمہیں اچنبھا کیوں ہوتا ہے؟ تمہارا یہ خیال ایک غلط خیال ہے کہ آج تک مر کر جی اٹھنے کا کوئی مشاہدہ نہیں ہوا۔ زندگی سے خالی مادے میں حیات کے آثار پیدا ہوتے تو تم روز دیکھتے ہو۔ پھر تمہاری سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی کہ جو مادہ ایک بار آثارِ حیات قبول کر چکا ہے وہ دوبارہ بھی قبول کر سکتا ہے۔ اگر بے جان مادہ زندگی کے آثار قبول نہ کرتا تو یہ بے شمار جاندار، جو روز ہی پیدا ہوتے رہتے ہیں، کیسے پیدا ہو جاتے؟ آخر یہ کیسی 'عقلیت' اور 'روشن خیالی' ہے جس کو عقلی اشاروں اور ربانی کرشموں سے بھری ہوئی اور تمہاری آنکھوں کے سامنے کھلی ہوئی اس پُرحکمت کائنات کے اندر حیات بعد الموت کا کوئی نشان نظر ہی نہیں آتا۔ پھر آخرت کی عقلی اور اخلاقی ضرورت کے مسئلہ پر بھی تمہاری نظر کیوں نہیں جاتی؟ تمہیں تسلیم ہے کہ انسان ایک ذی عقل اور ذی علم ہستی ہے، مگر ساتھ ہی تم یہ بھی کہتے جاتے ہو کہ تمہیں کسی ایسی بے شعور، بے عقل اور بے علم طاقت نے بنایا ہے جو سالہا سال تک تم سے محنت اور عمل کرانے کے بعد تم کو اور تمہارے کاموں کو یوں ہی خاک میں ملا دے گی۔ سوچو یہ کتنا عجیب خیال ہے؟ تم اپنی زندگی کے کسی کام کو بے مقصد، بے نتیجہ اور عبث نہیں سمجھتے، مگر حیف ہے تمہاری سمجھ پر، کہ جس زندگی کا ایک ایک جزو تمہاری نگاہ میں بھی با مقصد ہے، خود وہ زندگی تمہارے نزدیک عبث، بے مقصد اور بے نتیجہ ہے!

غور کیجیے، خدا ہی کی طرح زندگی بعد موت اور آخرت کے خلاف دلیل یہ نہیں ہے کہ اس کے عدمِ وقوع پر دلائل کی شہادت موجود ہے، بلکہ دلیل یہ ہے کہ ہم نے ایسا ہوتا کبھی

دیکھا نہیں۔ اور ہم کسی ایسی چیز کا مان لینا بے عقلی کی بات سمجھتے ہیں جو لیبوریٹری میں کبھی ناپی تولی اور دیکھی نہ جا سکی ہو۔ یقیناً اس دلیل کی داد نہیں دی جا سکتی۔ اگر ابھی ماضی قریب میں اس بات کی تحقیق نہ ہو گئی ہوتی کہ جو تارے اور ستارے ہمیں نظر آتے ہیں ان کے علاوہ بھی اربوں ارب اجرامِ فلکی خلا میں تیرتے پھر رہے ہیں، ہمارے نظامِ شمسی اور ہماری کہکشاں کے سوا بے شمار نظامہائے شمسی اور کہکشائیں اور بھی ہیں، سورج کی کرنیں انرجی اگلتی رہتی ہیں، زمین سورج کے گرد بھی اور اپنے محور پر بھی گردش کر رہی ہے، فضائے بسیط ایتھر سے بھری ہوئی ہے ــــ تو آج 'حقیقت نواز' جاہلیت پر یہ فرض عائد ہوتا کہ وہ پورے جزم و یقین کے ساتھ ان سب چیزوں کے وجود کی نفی کر دے۔ کیا غیبی حقائق کے خلاف چودہ سو برس یا چار، چھ اور دس بیس ہزار برس پہلے کی جاہلیتوں نے خدا اور قیامت و آخرت کے خلاف اس سے مختلف کوئی دلیل پیش کی تھی؟ ان کی آنکھوں پر بھی تو ایسے ہی محسوس پرستی اور ضد و تعصب کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی تو یہی کہا تھا کہ 'مرنے کے بعد جی اٹھنا ایک عجیب و غریب تخیل ہے، لیکن اگر اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہیں اپنی اس بات پر اصرار ہی ہے تو ہمارے باپ دادا کو زندہ کر دکھاؤ، تبھی ہم مانیں گے۔ یہ صحیح ہے کہ قدیم اہلِ جاہلیت اپنا یہ اعتراض یا انکار بالکل سیدھے سادے انداز میں کیا کرتے تھے، اور آج کے اہلِ جاہلیت اپنی بات فلسفے اور عقلیت کا ملمع چڑھا کر کہتے ہیں، حالانکہ وہ سراسر جھوٹا ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ بھی اُسی کج نظری اور ہوا پرستی کے مریض ہیں جو ان کے قدیم مورث ترکے میں چھوڑ گئے ہیں۔ اس لیے بَلْ قَالُوْا مِثْلَ مَا قَالَ الْاَوَّلُوْنَ (مومنون۔ ۸) کے ٹھیک ٹھیک مصداق ہیں۔ نفس کی چھوٹ اُنہیں بھی مطلوب تھی، اور اِنہیں بھی محبوب ہے۔ جب کہ آخرت کا تصور اِس چھوٹ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہنے دیتا۔ لہٰذا ان لوگوں کی 'مشکل' کا حل یہی ہو سکتا تھا کہ اِس 'بے رحم' تصور کا کلیتہً انکار کر دیا جائے۔ اس انکار کی جو دلیل انہوں نے مہیا کی، اس کا طول و عرض ابھی آپ دیکھ چکے ہیں۔

یہ تو نئی جاہلیت کے 'مخلصین کاملین' کی بات تھی! اس کے دوسرے درجے کے پیرووں کا حال بھی، جو دہریے نہیں بلکہ خدا اور مذہب کے ماننے والے ہیں، اس سے بس تھوڑا ہی سا

مختلف ہے کیونکہ وہ بالعموم آخرت کا ایسا تصور رکھتے ہیں جو ایمان بالآخرت کی روح سے خالی ہے، اور اسلامی تصورِ آخرت سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔ ان کی سب سے بڑی تعداد نے، جو پیروانِ عیسائیت پر مشتمل ہے، کفّارے کا ایک ایسا عقیدہ ایجاد کر رکھا ہے جس کے ہوتے ہوئے محاسبۂ آخرت کا کوئی اندیشہ باقی ہی نہیں رہ سکتا۔ اس لیے ان کا آخرت کو ماننا بالکل بے معنی ہو کر رہ گیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ (معاذ اللہ) خدا کے بیٹے تھے، انہیں اس نے صلیب دلوا کر ان کے سبھی نام لیواؤں کے تمام گناہوں کا کفارہ ادا کرا دیا ہے۔ عرب کے جاہلوں نے اپنے لیے خود ساختہ معبودوں کی شفاعت کا جو عقیدہ گھڑ رکھا تھا، کہنا چاہیے کہ عیسائیوں نے اپنے لیے اس سے زیادہ کارگر نسخۂ مغفرت تیار کر لیا ہے۔ عیسائیوں کے بعد بدھ مت اور ہندو دھرم کے ماننے والوں کی بات سامنے آتی ہے جو تناسخ (آواگون) کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ تناسخ کے عقیدے اور اسلامی عقیدۂ آخرت میں جو غیر معمولی فرق ہے وہ کسی وضاحت کا محتاج نہیں۔ ان تینوں مذہبی گروہوں کے بعد جو اور چھوٹے موٹے گروہ باقی رہ جاتے ہیں، ان کے تصوراتِ آخرت بھی بالعموم اسلامی تصورِ آخرت سے کچھ اسی طرح کی دوریاں رکھتے ہیں۔ پوری غیر مسلم دنیا کے عقیدوں کے اس اجمالی جائزے سے یہ حقیقت بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ اجنبیت کی ایک اونچی دیوار ہے جو ان کے اور اسلامی تصورِ آخرت کے درمیان حائل ہے۔ جس کے بعد پوری غیر مسلم دنیا کے لیے اسلام کے عقیدۂ آخرت سے بیگانہ پن محسوس نہ کرنے کی کوئی صورت نہیں رہ جاتی۔

۴۔ دین اور عبادت کی جامعیت کے معاملے میں

جب خدا اور آخرت کے اسلامی تصوّرات سے جاہلیتِ حاضرہ کی بے گانگی کا یہ حال ہے تو اس کے تصوّراتِ دین و عبادت کی جامعیت کو سمجھ سکنے کے لیے وہ دل و دماغ کہاں سے لاسکتی تھی۔ وہ تو نفسِ مذہب ہی کو جینے کا حق دینے پر تیار نہیں۔ اور اگر کہیں اس نے کچھ چشم پوشی سے کام لے کر اس کو سانس لینے کی اجازت دی بھی ہے تو اسے 'خانہ قید' کر کے رکھا ہے، اور حکم دے دیا ہے کہ خبردار! پوجا پاٹ اور گیان دھیان کے گوشوں سے آواز باہر

نہ نکلنے پائے۔ دنیا کے کسی معاملے سے تجھے ہرگز کوئی تعرض نہ کرنا چاہیے۔ زندگی کے تمام شعبے تیری مداخلت سے آزاد ہیں۔ اور ایک مکمل دستورِ حیات ہونے کی بات تو تجھے کبھی سوچنی ہی نہ چاہیے۔ تیری حیثیت بس ایک شخصی عقیدے کی حد تک تو برداشت کی جاسکتی ہے، لیکن تمدّنی، معاشرتی، معاشی، سیاسی اور اجتماعی مسائل سے تجھے دور کا واسطہ بھی نہ ہونا چاہیے۔ مغرور جاہلیت نے مذہب کے بارے میں یہ فرمان تو جاری کر دیا، اور خالص مادی مصالح و مقاصد کو سامنے رکھ کر علم اور سائنس کی نام نہاد روشنی میں اپنا ایک نظام حیات بھی بنا دیا مگر جلد ہی جب وہ کڑوے کسیلے پھل دینے لگا اور زندگی کے سکون کو لوگ ترسنے لگے تو آنکھیں کسی قدر کھلیں، اور محسوس ہوا کہ جس چیز کو انہوں نے آبِ حیات سمجھا تھا وہ فی الواقع سراب تھا، جس کی طرف وہ اپنے جگر کی پیاس بجھانے دوڑے تھے۔ اس تلخ تجربے نے ابھی ماضی قریب میں کچھ لوگوں کو مذہب کی پھر یاد دلائی، اور ان کے اندر ایک ایسے مذہب کی ضرورت کا احساس کروٹیں بھی لینے لگا جو اُن کے درد کا درمان بن سکے، ان کے دلوں کو چین دے سکے اور ان کی زندگی کے مسائل کو حل کر سکے۔ ساتھ ہی روشن خیال بھی ہو، حُرّیت نواز بھی ہو، علم و تحقیق کا علم بردار اور سائنسی ترقی کا ہم نوا بھی ہو، اور فطرت سے ہم آہنگ بھی ہو۔ چونکہ دنیا میں پائے جانے والے سبھی مذہبوں سے، جن میں دین اسلام بھی شامل ہے، انہیں بدگمانی اور نفرت تھی اور ان کے نزدیک یہ سب کے سب ناقص، دقیانوسی اور ناکارہ تھے، اس لیے انہوں نے ایک نیا مذہب بنانے کی سوچی، اور اسے 'دینِ فطرت' کا نام دیا۔ لیکن بندوں کی 'خدائی' کا جو حشر ہوا کرتا ہے، وہی اس تحریک کا بھی ہوا، اور زیادہ دن گزرنے پائے تھے کہ دین سازی کی یہ مہم بھولی بسری کہانی بن کر رہ گئی۔ یہ اسلام سے ان کی مکمل بے خبری اور بے گانگی ہی کا کرشمہ تھا کہ انہوں نے ناقص اور دقیانوسی اور ناکارہ قرار دیے ہوئے مذاہب کی فہرست میں اسے بھی شامل کر دیا۔ ورنہ وہ پاتے کہ یہ ایک ایسا دین ہے جو ان کے تمام ہی دکھوں کا علاج بن سکتا ہے، انہیں دل کا سکون بھی بخش سکتا ہے اور روح کی غذا بھی دے سکتا ہے، ان کی آخرت بھی سنوار سکتا ہے اور دنیا بھی خوش آئند بنا سکتا ہے۔ پھر یہ اپنی نوعیت کا ایک ہی دین ہے جو انسان کو علم و تحقیق اور تمدنی ارتقاء سے روکنے

کے بجائے اس پر ابھارتا ہے، اور اس کے بارے میں ضروری رہنما خطوط بھی مہیا کرتا ہے، تاکہ یہ تحقیق و ترقی نوع انسانی کے لیے انجام کار بربادی اور فساد کی موجب نہ بن جائے۔ اسی طرح یہ ایک ایسا دین ہے جس کی اساس تمام تر فطرتِ صحیحہ پر رکھی گئی ہے، اور فی الواقع 'دینِ فطرت' اگر کوئی دین ہو سکتا ہے تو وہ یہی دین ہے، اور کوئی بھی انسان اس کی گہرائیوں میں اتر کر اس حقیقت کی شہادت دے سکتا ہے بشرطیکہ خود اس کی اپنی فطرت سلیم ہو، اور اس پر نفسانیت، تعصب، آباء پرستی اور تقلیدِ جامد کے پردے نہ پڑے ہوں۔ مگر یہ ایک ایسی شرط تھی جسے وہ پورا کرسکنے سے قاصر تھے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ جاہلیت کی پیروی کے تلخ نتائج بھگتنے کے باوجود اس کی گرفت سے آزاد نہ ہوسکے تھے، اس لیے اس دین کی معرفت ان کے لیے ممکن نہ ہوسکی۔

اسلامی تصوراتِ دین و عبادت سے بے اعتنائی اور بدگمانی کا یہ مرض مغرب کے مراکزِ جاہلیت تک محدود نہیں، مشرق کے مذہبی حلقوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے۔ صرف ایک مثال اس کا اندازہ کرلینے کے لیے کافی ہوگی۔ آزادیِ ہند سے کچھ ہی مدت پہلے کی بات ہے کہ ملک کے ایک بہت بڑے زعیم نے جب عام مسلمانوں کے اس مطالبہ کو سنا کہ آزاد ہندوستان میں ان کی اجتماعی زندگی کا نقشہ اسلامی خطوط پر تشکیل دیا جانا چاہیے تو بے طرح جھنجھلا اٹھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر مذہب کو اجتماعی زندگی کے مسائل سے کیا واسطہ ہو سکتا ہے، اور وہ بھی اس بیسویں صدی میں؟ بولے 'میں تو جنتا کو بھوک، بے کاری اور ناخواندگی کو دور کرنا چاہتا ہوں، یہاں ہندو مت اور اسلام کا کیا سوال ہے؟ ارشادِ عالی کا منشا یہ تھا کہ تمدنی اور معاشی اور اجتماعی معاملات میں مذہب اور مذہبی 'خطوط' کی بحث اٹھانا ہی غلط ہے۔ مذہب تو عبادت گاہوں کی چیز ہے۔ اس کا تعلق صرف عقائد اور عبادتی امور سے ہونا چاہیے۔ اگر اس قسم کے بے تکے مطالبات کیے گئے تو اختلافات کا ایک طوفان برپا ہو جائے گا اور آزادی کی جدوجہد کو تباہ کرکے رکھ دے گا۔ اس لیے مذہب کے دائرے کو اتنا نہ پھیلاؤ کہ وہ عبادت گاہوں کی خاموش فضا سے نکل کر زندگی کے اجتماعی مسائل کی ہماہمی میں داخل ہو جائے۔ وہی اپنے ہاتھ سے

روٹی بانٹے، اپنی مرضی کے مطابق درس گاہیں قائم کرے، معاشی نظام بنائے، معاشرتی قوانین وضع کرے، حتیٰ کہ وہی اپنے حکم سے سیاسی پارٹیاں تشکیل کرائے، وہی الیکشن لڑائے، وہی اسمبلیوں اور پارلیمنٹ میں تقریر کرائے، بِل پیش کرائے، قانون بنوائے اور عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر فیصلے کرے۔ یہ مذہب نہیں مذہب کا خود غرضانہ سیاسی استعمال ہے۔

'مغرب' کو بھی آپ نے سن لیا اور 'مشرق' کو بھی دیکھ لیا۔ اب خود فیصلہ کر لیجیے کہ اسلامی تصوراتِ دین و عبادت کی حقیقت اور جامعیت آج کی پڑھی لکھی دنیا کے لیے بھی کتنی جانی پہچانی ہو سکتی ہے؟

۵۔ خلافت اور اسلامی حکومت کے معاملے میں

خلافت اور اسلامی حکومت کے تو نام تک سے آج پوری غیر مسلم دنیا کو ایک چڑ سی ہے۔ اس چڑ کے پیچھے اس کے صرف قومی تعصب اور نفرت و عداوت کے جذبات ہی نہیں کام کر رہے ہیں، بلکہ ان سے بڑھ کر اس میں عمل دخل اِس خیرِ عظیم سے اُن کی بے خبری اور بے گانگی کا ہے۔ وہ محسوس ہی نہیں کر پاتے کہ ایک اوسط معیار کی اسلامی حکومت بھی صرف اہلِ اسلام ہی کے لیے نہیں، پوری انسانیت کے لیے خیر کی موجب ہوگی۔ اس بے خبری اور بے گانگی میں وہ اتنا آگے بڑھے بڑھے ہوئے ہیں کہ 'مسلم حکومت' یعنی کسی ملک کے مسلمانوں کی قومی حکومت کو اسلامی حکومت پر آنکھ بند کر کے ترجیح دیتے ہیں۔ اِسی اندھے پن کی وجہ سے انہوں نے ابھی ساٹھ باسٹھ برس پہلے خلافتِ عثمانیہ کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو گل کرا کے دم لیا۔ اور پھر یہی وجہ ہے کہ وہ دورِ حاضر کی ہر اُس مسلم حکومت کو، جو اسلامی نظام کے قیام کی طرف قدم بڑھاتی ہے یا جس کے ہاں ایک حد تک شرعی نظام عملاً قائم ہے، طعنوں سے نوازتے اور غصّے سے گھورتے رہتے ہیں، اور اس کے خلاف پروپگنڈوں کا طوفان اٹھائے ہوئے ہیں۔ ایران میں، پاکستان میں، اور سعودی عربیہ میں اگر اسلامی نظام اور شرعی قوانین سے اُسی طرح اظہارِ برأت کیا جاتا ہوتا جیسا کہ ترکی، شام، عراق، ٹیونس، یمن اور انڈونیشیا وغیرہ اکثر مسلم ملکوں کے حکمرانوں کی طرف سے کیا جاتا رہتا ہے، تو چاہے وہاں جو کچھ بھی ہوتا رہتا ہے، ان لوگوں کی آنکھیں

کوئی جلن محسوس نہ کرتیں۔ لیکن چونکہ ان چند مسلم ملکوں میں یہ بات نہیں پائی جاتی، اس لیے ان کی آنکھیں جلن ہی محسوس نہیں کرتیں، بلکہ ان میں خون اترا آرہا ہے۔ یہ صورتِ حال اس امر کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ اسلامی نظامِ حکومت کے معنی و مقصد کے قریب سے بھی ان لوگوں کا گزر نہیں ہو سکا ہے۔ اور اگر کچھ ہوا ہے اور اس کے باوجود ان کی روش یہ ہے، تو پھر یہ کہنا پڑے گا کہ اُن مقاصدِ خیر ہی سے انہیں بیر ہے جو اس نظام کے مقاصد ہیں۔ دونوں ہی صورتیں اِس حقیقت کی دلیل ہیں کہ پوری دنیا اشتراکی الحاد، مغربی مادّیت اور سیکولرزم کی دلدل میں گہری دھنسی ہوئی ہے، جو انہیں خلافتِ الٰہیہ، اسلامی حکومت اور دینی نظام اجتماعی کا مفہوم سمجھ پانے اور اس کے مقاصدِ خیر کا اعتراف کرسکنے کی اجازت ہی نہیں دے رہی ہے۔

۶۔ سربراہِ مملکت کے اصولِ انتخاب کے معاملے میں

اسلام نے سربراہِ مملکت کے انتخاب کے لیے صالحیت اور صلاحیت کو جو بنیادی اور فیصلہ کن اہمیت دی ہے، وہ آج کی 'روشن خیالی' اور 'بلند نظر' جاہلیت کے لیے ایک اعجوبہ سے کم نہیں۔ کوئی اپنے وقت کا صدیق اور فاروق ہی کیوں نہ ہو، اگر اس کے پاس کسی خاص قومیت کا پروانہ اور کسی خاص وطنیت کی سند نہیں، تو وہ کسی سیاسی منصب کا اہل نہیں ہو سکتا۔ خلافت اور فرماں روائی تو بڑی چیز ہے، عام شہری حقوق بھی اسے نہیں مل سکتے۔ کیونکہ آج کا مسلّم اور متفق علیہ معروف یہ ہے کہ جغرافیائی حدیں وطن بنانے والی ہیں، وطن قوم کی تشکیل کرنے والا ہے۔ قوم اپنے افراد میں سے اپنے نمائندے منتخب کرنے والی ہے، اور یہی نمائندے اس کے لیے قوانین بنانے والے اور حکمراں (صدر اور وزیر اعظم) چننے اور مقرر کرنے والے ہیں۔ اس متفق علیہ معروف یا مسلّم اصول میں استثنا صرف ایک ہے، جو جاہلیت نخواستہ، یہ نہیں ہے کہ ہم قوم اور ہم وطن ہونے کی یہ شرط اُس شخص کی حد تک اٹھا دی جائے گی جس کے اندر راستی دیانت، امانت، خدا ترسی، عدل گستری اور احساسِ ذمہ داری کی نمایاں خوبیاں پائی جاتی ہوں اور جو معاشرے میں بھلائیوں کو فروغ دینے والا اور برائیوں کی بیخ کنی کرنے والا ہو، بلکہ یہ ہے کہ یہ شرط اُن 'سپر قوموں' اور 'سپر مینوں' کی حد تک ساقط رہے گی جو آرین نسل

سے ہوں، جن کی رنگت گوری ہو، جن کے ہاتھوں میں ایٹم بم اور بین براعظمی مزائیلیں ہوں۔ اِس صدی کے وسط تک تو یہ استثناء بالکل عام تھا اس کے بعد ذرا زیرِنقاب ہوگیا ہے۔ دورِحاضر کا ایک واقعہ خصوصیت سے بطورِ مثال یاد رکھنے کے قابل ہے۔ جب ہندوستان نے انگریز سامراج سے للکار کر کہا کہ بہت ہو چکی، اب ہماری حدود سے باہر نکل جاؤ، تو برطانوی دارالقضا سے پہلے ہٹلر نے 'فتویٰ' دے دیا کہ ہرگز نہیں، پس ماندہ، نیم متمدن اور کالے ہندوستانیوں پر سفید فام اور متمدن انگریزوں کو حکومت کرنے کا فطری حق حاصل ہے۔

۷۔ اسلام کی امن پسندی کے معاملے میں

اسلام سے امن و سلامتی کا وہی تعلق ہے جو سورج سے روشنی اور گرمی کا ہے۔ خود اسلام کا لفظ بھی اس حقیقت کی منادی کرتا ہے جو 'سلم' یعنی سلامتی سے بنا ہے۔ اس لیے امن و سلامتی تو اس کے خمیر میں شامل ہے۔ البتہ چونکہ گندم نمائی اور جو فروشی سے اس کی فطرت ناآشنا ہے، اس لیے وہ امن کا صرف وعظ نہیں کہتا، نہ شر و فساد کی قوتوں سے مدارات کا رویّہ اختیار کرتا ہے، بلکہ ان کی راہ روکنے کے لیے بدرجۂ آخر طاقت بھی استعمال کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر امن و سلامتی کے مفاد کا تحفظ ہو ہی نہیں سکتا۔ بدی کی طاقتیں اتنی شریف نہیں ہوا کرتیں کہ حق و عدل کو ہاتھ روکے دیکھ کر متاثر ہو جائیں، اور ان کی سننے اور ماننے پر آمادہ ہو رہیں۔ ان کی پوری تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ وہ سچائی اور نیکی کو خاموش پا کر اور زیادہ شیر ہو جاتی ہیں، اور خدا کی زمین کو شر و فساد سے اور زیادہ تیزی سے بھرنے لگتی ہیں۔ اس لیے اسلام کے سرچشمۂ امن ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ امن کو بچانے کے لیے بھی کسی وقت صف آرائی کا نام نہیں لیتا، بلکہ یہ ہے کہ اس کی تعلیمات امن و سلامتی کا حقیقی ذریعہ ہیں، جب کہ دوسرے سارے نظریے اور فلسفے یا تو انجام کار بگاڑ اور بدامنی کا سبب بن جایا کرتے ہیں، یا پھر ان خرابیوں کی راہ کھلی چھوڑ کر چپ چاپ الگ کھڑے رہتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے واضح کیا جا چکا ہے، یہی مدعا تھا قرآنِ حکیم کے اُس تبصرے کا جو اس نے منافقینِ مدینہ کی پالیسی پر کیا تھا۔ اس نے جب انہیں یہ تلقین کی تھی کہ اِفساد فی الارض کا وطیرہ چھوڑ دو، تو ان

بے بصیرت لوگوں نے پورے یقین کے لہجے میں کہا تھا کہ "اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ" (ہم تو اصلاح کرنے والے لوگ ہیں) اُن کی اِس بات کو سُن کر قرآن نے حقیقتِ نفس الامری یہ بتائی تھی کہ "اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ" (سن رکھو! بے شک یہی لوگ حقیقی مفسد ہیں، لیکن اس بات کا انہیں شعور نہیں)۔ یہ اسبابِ فساد کا شعور نہ ہونے کی بات کچھ ان منافقوں ہی کی ذات تک محدود نہ تھی، بلکہ ہر مریدِ جاہلیت کے ہاں، اور ہر دورِ جاہلیت میں، یکساں طور پر موجود رہا کی ہے۔ حضرت موسیٰ کی دعوت کے جواب میں فرعون نے بھی اپنی اِسی بے شعوری کا مظاہرہ کیا تھا جب اس نے اپنے ہم قوموں کو اس دعوت کے "خطروں" سے آگاہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ "مجھے ڈر ہے کہ یہ شخص تمہارا دین بدل کر رکھ دے گا، یا ملک میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑکا دے گا۔" (اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ۔ غافر۔ ۲۶) خدا کی کتابیں اور یہ آخری کتاب امن و آشتی کی تنہا ضامن کس طرح اور کیونکر تھیں، اور ہیں، اِس گہری حقیقت سے ہو وہ شخص واقف ہو سکتا ہے جس نے امن و سلامتی کے حقیقی اسباب کو سمجھنے کی کوشش کی ہو، جس نے اسلامی تاریخ کا (نہ کہ مسلم تاریخ کا) صاف ذہن سے مطالعہ کیا ہو، جس نے واقعات کی یہ شہادت غور سے سنی ہو کہ عرب جیسا گہوارۂ فتنہ و فساد اس دین کی بدولت ایسا امن کدہ بن گیا کہ صنعاء سے حضرموت تک ایک بڑھیا تنِ تنہا سفر کرتی چلی جا سکتی تھی اور اس کا بال تک بیکا نہ ہو سکتا، جس نے بین الاقوامی تعلقات کے سلسلے میں اللہ رب العالمین کی دی ہوئی یہ ہدایت نظر میں رکھی ہو کہ برسرِ جنگ دشمن جب بھی صلح کی طرف مائل ہو، بلا درنگ صلح کے لیے آمادہ ہو جاؤ (وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا۔ انفال۔ ۶۱) تاکہ جس قدر جلد ہو سکے امن قائم ہو جائے، جسے قرآن کا یہ حکم معلوم ہو کہ مخالفوں سے کیے ہوئے معاہدۂ امن میں اپنی طرف سے ہرگز کوئی خیانت اور فریب نہ کیا جائے، جو اسلام کی اس تعلیم سے بے خبر نہ ہو کہ دشمن کو ایک معمولی مسلمان فوجی کی دی ہوئی امان کا بھی پوری طرح پاس رکھا جائے، جسے فتحِ مکہ کے موقع کا وہ حیرت انگیز منظر یاد ہو جس کو رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے عفوِ عام کے اعلان نے دنیا کی نگاہوں کے سامنے کھینچا تھا ـــ اسلام کی امن پسندی کی ان ساری شہادتوں کے باوجود اگر کوئی اس کا اعتراف نہیں کرتا تو اسے

سچائی کے دشمن کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ لیکن جن قوموں کا یہاں ذکر ہو رہا ہے، تقریباً ان سبھی کا یہی حال ہے۔ انہیں دوپہر کے وقت بھی سورج دکھائی نہیں دیتا، اور بلا جھجک اسلام کو امن پسند دین کے بجائے ایک امن دشمن دین کہنے سے باز نہیں رہتیں۔ اس ڈھٹائی کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

ایک[۱] برطانوی وزیر نے پارلیمنٹ کے اندر قرآن کریم کو ہاتھ میں لے کر کہا تھا: جب تک دنیا میں یہ کتاب موجود ہے کبھی امن قائم نہیں ہو سکتا۔

لارنس[۲] براؤن کا کہنا ہے: صحیح معنوں میں اگر کوئی بڑا خطرہ ہے تو وہ اسلامی نظام میں پوشیدہ ہے۔

یہی[۳] ناآشنائے خیر و عدل اپنے ہم مشربوں کو یہ انتباہ دیتا ہے کہ "کسی ایک بھی سلطنت میں اگر تمام مسلمان متحد ہو جائیں تو بہت ممکن ہے کہ وہ پوری دنیا کے لیے لعنت اور عذاب بن جائیں۔"

جہاں[۴] تک ہمارے اپنے ملک کا تعلق ہے، اس کے اندر تو اس طرح کے 'ارشادات' آئے دن سننے میں آتے رہتے ہیں، جن سے کوئی باخبر شخص ناواقف نہ ہوگا۔

کیا کوئی دیانت دار اور صداقت شعار انسان سوچ بھی سکتا تھا کہ اسلام اور قرآن کے بارے میں ایسے تبصرے کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن جاہلیت جب دلوں اور دماغوں میں سما جاتی ہے تو ان کے لیے اسلام کی کسی خوبی کا اعتراف کرنا ممکن نہیں رہ جاتا۔

۸۔ جہاد کے معاملے میں

جہاد کا حقیقی مفہوم و مدعا اس دور کی تعلیم یافتہ دنیا کے لیے بھی ویسا ہی ناقابلِ فہم اور نامانوس ہے، جیسا کہ عرب کے جاہلوں کے لیے تھا۔ جہاد کا نام سنتے ہی چہرے بگڑنے لگتے ہیں حالانکہ آج ہر مقصد کے لیے تلوار اٹھائی جاتی رہتی ہے اور بے دریغ انسانی خون بہایا جا رہا ہے۔ اور یہ ایک ایسا 'معروف' ہے جس کی پیروی کا 'ثواب' لوٹنے میں نہ کوئی سرخا پیچھے رہنا چاہتا ہے نہ کوئی گورا۔ ہر طاقت ور کو حق حاصل ہے کہ کمزور کو اپنے خونی جبڑوں میں کس لے۔ اس

میں کوئی حرج نہیں کہ اپنے سامراجی مقاصد کے لیے جبرالٹر سے لے کر ہانگ کانگ تک کی ساری قوموں کو غلامی کی زنجیریں پہنا دی جائیں۔ اس میں بھی کوئی شرم کی بات نہیں کہ اگر چین کو افیون کا عادی بنا دینا ہو تا کہ اسے آسانی کے ساتھ اپنا 'ذلول' بنا کر رکھا جاسکے، تو اس کے لیے فوجی طاقت استعمال کرلی جائے۔ یہ بھی کوئی قابلِ اعتراض حرکت نہیں کہ بڑی طاقتیں خام پیداوار سستے داموں حاصل کرنے اور اپنا تیار کیا ہوا سامان بھاری قیمتوں پر بیچنے کے لیے منڈیوں کی تلاش میں جس ملک پر چاہیں چڑھ دوڑیں۔ اور اس امر کے جواز پر تو ان 'مہذب' اور ترقی یافتہ قوموں کا اجماع ہی ہے کہ اپنے اقتصادی، سیاسی اور مسلکی مفادات کی خاطر بندگانِ خدا کی بستیوں پر توپوں، ٹینکوں، ہوائی جہازوں، سمندری بیڑوں، بموں، مزائلوں اور زہریلی گیسوں کی بارش کر دی جائے۔ یہ سب معقول، مہذب اور جائز کام ہیں۔ اگر نامعقول، وحشیانہ اور ناجائز کوئی کام ہے تو صرف یہ ہے کہ معاشی اغراض، سیاسی مفادات اور سامراجی اقتدار کے لیے نہیں، بلکہ اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے' دنیا سے شر و فساد مٹانے کے لیے اور حق وانصاف کا بول بالا کرنے کے لیے کوئی جنگی کارروائی کی جائے۔ جس جاہلیت کا اصل مزاج ہی فساد پسند ہو' وہ اگر جہاد کے نہ مفہوم سے آشنا ہو نہ اس کے مقصود کی قدر شناس ہو تو اِس پر کوئی تعجب نہ کرنا چاہیے۔

۹۔ قوم پرستی کے معاملے میں

اسلام نے قوم اور وطن، طبقہ اور فرقہ، فرد اور جماعت، سبھی کے حقوق تسلیم کیے ہیں۔ البتہ کسی طرح کی 'معبودیت' کا حق کسی کو نہیں دیا ہے۔ لیکن جاہلیتِ جدیدہ' ایک خدا کو چھوڑ کر' اپنی مصلحت کے مطابق جس کو چاہے' معبودیت کا حق دینے کے لیے تیار رہتی ہے۔ اور اس معاملے میں اس کی نظرِ عنایت سب سے زیادہ 'قوم' پر پڑی ہے' چنانچہ اس نے آج قوم کو سب سے بڑے 'معبود' کا درجہ دے رکھا ہے' اور 'قوم پرستی' وقت کی سب سے محترم اور باعثِ فخر اصطلاح بنی ہوئی ہے۔ اگر کوئی شخص خدا کی معبودیت ہی کا نہیں، اس کے وجود تک کا انکار کر دے تو اسے مرحبا کہا جائے گا' نبوت اور وحی اور شریعت کا مذاق اڑائے تو اسے

دانشور ٹھیرایا جائے گا، عفت اور اخلاق کی قدروں کے پرخچے اڑائے تو اسے روشن خیالی کا نوبل پرائز پیش کیا جائے گا، لیکن اگر کسی نے قومیت اور وطنیت کے بتوں کو سجدہ کرنے کو غلط کہہ دیا تو اس کی جان نہ بخشی جاسکے گی۔ کفارِ قریش نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منتجبانہ گلہ کیا تھا کہ اپنی قوم کے شیرازے کو بکھیر کر اور اسے باہم ٹکرا کر آپ اس کے بہترین مفادات کو جو نقصان پہنچا رہے ہیں، اسے کون شخص معقول حرکت قرار دے سکتا ہے؟ عبداللہ بن اُبَی شدتِ غیظ سے بے تاب تھا کہ مکے سے آئے ہوئے غیر ملکی ہماری یثربی قومیت کی جڑیں کاٹے دے رہے ہیں۔ آج کے پیروانِ جاہلیت کی پروازِ فکر بھی اس سے کچھ اونچی نہیں ہوسکی ہے۔ ان کا ایک بڑا نمائندہ اور فرانس کا مشہور ادیب و سیاست داں، والٹیر، حیرت بھرے انداز میں یوں زہر اگلتا ہے:۔

"سیلؔ وغیرہ کو آخر عرب کے اس شتربان (روحی فداہ) میں عظمت کا کونسا پہلو نظر آیا؟ قوم نے اسے سردار منتخب کیا ہوتا، یا اپنے ملک اور وطن کی حمایت میں اس نے اغیار سے جنگ کی ہوتی تو خیر ایک بات بھی تھی۔ لیکن جو شخص خدا کے نام کی آڑ بنا کر خود اپنے ملک والوں سے جنگ کرے، اسے کوئی اچھا کس طرح کہے؟"

اب پرانی جاہلیت اور نئی جاہلیت کا موازنہ کر کے نتیجہ خود نکال لیجیے۔

۱۰۔ اسلام کے عائلی نظام کے معاملے میں

اسلام کے عائلی نظام کو آج جس نظر سے دیکھا جا رہا ہے، اس کا علم کم و بیش ہر پڑھے لکھے شخص کو ہوگا۔ اس نظام کا بنیادی ستون نکاحؔ کا قانون ہے، اور دوسرے دو ستون اور ہیں، جن میں سے ایکؔ تو مرد اور عورت کے الگ الگ فرائض و دائرۂ کار کی تعیین پر، اور دوسراؔ مرد کے لیے حقِ طلاق اور عورت کے لیے حقِ خلع کے ضوابط پر مشتمل ہے۔

نکاحؔ کے بارے میں اسلام کا بنیادی تصور یہ ہے کہ وہ ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان ان کی آزاد مرضی سے قائم ہونے والا دائمی معاہدۂ رفاقت ہے، جس کا انعقاد

چند اہم اخلاقی اور تمدنی مقاصد کی خاطر ہوا کرتا ہے۔ مثلاً عفت کا تحفظ، نسلِ انسانی کی بقا، نسلی پاکیزگی، اور معاشرے کو وجود میں لانے والی اکائیوں کی تشکیل۔ نری لذت جوئی اور نرا معاشقہ اس رشتۂ نکاح کی بنیاد نہ ہونا چاہیے۔ قرآن کریم نے مرد کو بھی یہی ہدایت دی ہے کہ وہ اپنے صالح تمدنی مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ، اور اپنے اخلاق کی حفاظت کے لیے ایک مستحکم قلعہ سمجھ کر نکاح کرے، اور ٹھیک یہی ہدایت اس نے عورت کو بھی دی ہے۔

مرد[۲] اور عورت، دونوں کے الگ الگ فرائض اور دائرۂ کار کی تعیین ایک بڑی جامع مصلحت اور ایک ٹھوس حیاتیاتی حقیقت کو سامنے رکھ کر کی گئی ہے۔ مصلحت یہ ہے کہ نکاح کے مقاصد صحیح شکل میں اسی طرح پورے ہو سکتے ہیں۔ اور حیاتیاتی حقیقت یہ ہے کہ دونوں کی ساخت اور جبلی خصوصیات میں کھلا ہوا فرق ہے۔ اس لیے ان کے فرائض اور دائرۂ کار میں بھی فرق کا ہونا لازمی ہے، اور ضروری ہے کہ ہر ایک کے فرائض اس کی خلقی ساخت اور جبلی خصوصیات کے مطابق ہوں۔

مرد[۳] کو طلاق کا حق اور اختیار بھی ایک فطری حقیقت کی بنا پر دیا گیا ہے، اور وہ یہ کہ مرد کے اندر صبر و تحمل اور عاقبت اندیشی کی صفت عورت کے مقابلے میں بالعموم زیادہ ہوتی ہے، اور عورت اس کے مقابلے میں نسبتہً زیادہ جذباتی، غیر متحمل اور جلد باز واقع ہوئی ہے۔ اس لیے طلاق کا حق، جسے بالکل ناگزیر اور مجبور کن حالات ہی استعمال کیا جانا چاہیے اگر عورت کو دے دیا جاتا تو نکاح کے بندھن آئے دن ٹوٹتے رہتے، جب کہ شریعت چاہتی ہے، اور خاندانی اور معاشرتی مفاد تقاضا کرتا ہے کہ یہ بندھن اسی وقت توڑا جائے جب نباہ کی کوئی صورت باقی نہ رہ جائے اور حدود اللہ کی برقراری سخت دشوار ہو جائے۔ اسی طرح عورت کو خلع کا حق اس مصلحت کی خاطر دیا گیا ہے کہ اگر اس کی ازدواجی زندگی ناقابلِ برداشت ہو گئی ہو اور وہ اسے برقرار رکھنے کے لیے اب بالکل آمادہ نہ رہ گئی ہو، ادھر شوہر کا حال یہ ہو کہ وہ اس کے ہزار مطالبوں کے باوجود اسے آزاد کر دینے کے لیے تیار نہ ہو رہا ہو، تو اس پیچیدہ صورتِ حال کا ایک حل عورت کے پاس بھی موجود رہے۔

انہی تینوں بنیادی اصولوں کو سامنے رکھ کر اسلام نے ازدواجی قوانین بنائے ہیں۔

اسی طرح اُن مقاصد کی خاطر، جو نکاح کے مقاصد ہیں، اس نے ایک طرف تو تعدّد ازواج اور پردے کے احکام، دوسری طرف وراثت اور وصیت کے قوانین بھی وضع کیے ہیں۔ اِن سارے قوانین کے اندر انسانی فطرت کے جمیع تقاضوں اور ایک صالح تمدّن کی تمام مصلحتوں کو نہایت حکیمانہ انداز میں سمو دیا گیا ہے، جس نے انسانیت کو اخلاقی انارکی، سماجی بگاڑ اور عائلی انتشار سے اس طرح محفوظ کر دیا ہے کہ کوئی صاحب نظر اور حق پسند شخص اس پر اطمینان کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ قدیم جاہلیت ان باتوں کا تھوڑا بہت لحاظ رکھتی بھی تھی، مگر نئی جاہلیت سب کچھ الٹ کر رکھ دینا چاہتی ہے۔ اس کا حد سے بڑھا ہوا فاسد مزاج اِس قابل ہے ہی نہیں کہ وہ اسلام کے عائلی نظام کے مصالح اور اقدار کو سمجھ سکے۔ نکاحؔ کے رشتے کی حرمت ماضی کی یادگار بنتی جا رہی ہے۔ نوجوان طبقہ اسے خواہ مخواہ کی ایک ناروا بندش سمجھنے لگا ہے۔ نکاح کا لفظ سُن کر اب تک صرف ایک مرد اور ایک عورت ہی کا تصور ذہن میں آتا رہا ہے، لیکن اِس دور کی مادر پدر آزاد اور بے لگام جاہلیت کے ہاں یہ تصور لازمی نہیں رہ گیا ہے، بلکہ دو مردوں کا تصور بھی ذہن میں آسکتا ہے۔ کیونکہ اب قانوناً مرد کا مرد کے ساتھ بھی نکاح ہوسکتا ہے اور ہو رہا ہے۔ ابھی تھوڑے دنوں قبل یورپ کی ایک 'ترقی پسند' پارلیمنٹ اس طرح کا قانون منظور کر چکی ہے۔ اور کچھ بعید نہیں کہ کل کلاں کو کوئی اور زیادہ 'ترقی پسند' پارلیمنٹ دو عورتوں کے باہمی نکاح کو بھی از روئے قانون جائز قرار دے دے۔ جہاں تک نکاح کے سب سے اہم بنیادی مقصد، تحفظِ عفت، کا تعلق ہے، وہ تو کب کا قصۂ پارینہ بن چکا ہے۔ نکاح کے معاملے کے بعد مرد اور عورت کے الگ الگ فرائض اور دائرۂ کار کے معاملے کا جہاں تک سوال ہے، تو اس کا حال اور زیادہ دگرگوں ہے۔ اس کا تو تذکرہ ہوتے ہی اِس جاہلیت کے ہونٹوں پر تبسم کھیلنے لگتا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ وہ دونوں صنفوں کے خلقی فرق کو تسلیم بھی کرتی ہے، اور اس لیے کرتی ہے کہ حیاتیات کا علم اُسے اِس کے لیے مجبور کرتا ہے، لیکن جب ان دونوں کے فرائض و دائرۂ کار کا سوال سامنے آتا ہے تو وہ اِس فرق کو بھول جاتی ہے، اور اصرار کرتی ہے کہ عمل کے میدان میں دونوں برابر کی سطح پر رہیں گے، اور اس کے لیے دلیل یہ دیتی ہے کہ مرد و زن کی یہ ہمہ جہتی مساوات انسانیت اور انصاف کا تقاضا ہے۔ مساوات

کے اس من مانے تخیل نے مرد کو قوامیت سے معزول کر کے آزادیٔ نسواں کا ایسا زوردار صور پھونکا کہ پوری انسانی زندگی میں بالعموم، اور عورتوں کی زندگی میں بالخصوص ایک طرح کی قیامت برپا ہو گئی۔ مگر جاہلیت کا اقبال دیکھیے کہ اس کے خیمہ بردار ترقی اور تہذیب کے نشے میں اس طرح کھوئے ہیں کہ بہت کچھ بھگت چکنے کے بعد بھی ان کی آنکھیں نہیں کھل رہی ہیں۔ اور المیہ بالائے المیہ یہ ہے کہ اس مدہوشی میں عورت مرد سے بھی دس قدم آگے ہے۔ وہ بالکل نہیں سمجھ پارہی ہے کہ آزادی و مساوات کے نام پر اسے مشقت اور جنسی استحصال کی جہنم میں ڈال دیا گیا ہے۔ ایک طرف تو مساوات کا فریب دے کر معاش کا آدھا بوجھ اس کے سر پر منتقل کر دیا گیا ہے، دوسری طرف اس کی آزادی کے نام پر اسے چراغِ خانہ کے بجائے شمعِ محفل بنا دیا گیا، اور پھر اس مقام سے بھی ترقی دے کر کیبرے ناچ گھروں کی زینت بنا ڈالا گیا۔ اور یوں اس کا نسوانی شرف نیلام پر چڑھ گیا۔ یہ تو فریب خوردہ عورت کا اپنا حال ہوا۔ اس کی اولاد کا حال یہ ہو رہا ہے کہ جوں جوں جاہلیت کی لے بڑھتی جا رہی ہے، وہ ماں کی شفقت اور تربیت سے محروم ہوتی چلی جا رہی ہے۔ گھر کے بڑے بوڑھوں کا حشر یہ ہوتا جا رہا ہے کہ وہ اپنے لگائے ہوئے اور اپنے خونِ جگر سے سینچے ہوئے 'باغ' پر بس دور ہی سے حسرت بھری نظریں ڈال لیا کریں، یہاں تک کہ جب مریں تو سعادت مند اولاد کو اس کی خبر بھی نہ ہونے پائے۔ اس طرح اجتماعیت کے بنیادی اینٹوں اور معاشرے کی اکائیوں کا نقشہ کچھ ایسا بنتا جا رہا ہے کہ باپ کسی فیکٹری میں، ماں کسی دفتر میں، بچے کسی چلڈرن ہاؤس میں، اور دادا دادی کسی سرکاری محتاج گھر میں۔ اب اگر آپ ایسے گھرانوں میں اُس اخلاقی پاکیزگی کو، اُس پدرانہ مادرانہ شفقت کو، تربیتِ اطفال کے اُس اہتمام کو، بزرگوں کی اُس خدمت و تکریم کو، اور خاندان کے اُس استحکام کو دیکھنا چاہیں جو اسلامی نظامِ عائلی کا مقصود اور امتیاز ہیں، تو مایوسی کے سوا اور کیا ہاتھ آسکتا ہے؟ لیکن کتنی حیرت کی بات ہے کہ تہذیبِ جدید جس جاہلیت کا نام ہے، وہ اسلام کے اس عائلی نظام کی طرف نہ متوجہ ہوتی ہے، نہ اسے خاطر میں لاتی ہے۔ اور اگر کوئی اسے اِس سرچشمۂ خیر و صلاح کی طرف متوجہ کرنا چاہے تو اسے حقارت بھری آنکھوں سے گھورنے لگتی ہے۔

۱۱۔ اخلاقی نظام کے معاملہ میں

اچھے اخلاق کو جو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے، فرد کی سطح پر بھی اور جماعت کی سطح پر بھی، اس سے کون ناواقف ہوگا۔ دنیا میں ہر فکر، ہر نظریے اور ہر مذہب کے بارے میں اختلاف ہوا، مگر حسنِ اخلاق کے بارے میں کبھی اختلاف نہیں ہوا۔ سبھی اس کی ضرورت کے معترف اور اس کی عظمت کے ثناخواں رہے ہیں۔ اسلام میں تو اس کا مقام اتنا بلند ہے کہ اس کے آگے بلندی کا کوئی درجہ باقی ہی نہیں رہ جاتا۔ اپنے وسیع مفہوم کے اعتبار سے اسے دین کی روح کا مظہر اور بعثتِ محمدی کی غایت ہونے کا شرف حاصل ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خود فرمانا تھا کہ "میں اچھے اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں (بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ حُسْنَ الْاَخْلَاقِ)[1]۔ پاک دامنی، سچائی، حیا، صلہ رحمی، ایفائے عہد، اطاعتِ والدین، بڑوں کی عزت، چھوٹوں پر شفقت، نرم خوئی، خوش گفتاری، رحم دلی، غریبوں کی مدد، مظلوموں کی دادرسی اور خلقِ خدا کے ساتھ احسان کا سلوک، غرض جس اخلاقی خوبی کا نام لے لیجیے، دینِ حق کے ماتھے کا دمکتا ہوا موتی دکھائی دے گا۔ کہنے کو تو آج کا ترقی یافتہ انسان بھی اِن اخلاقیات میں سے کسی کی عظمت کا منکر نہیں۔ مگر امرِ واقعی کیا ہے؟ اسے ہر دیکھنے والی آنکھ دیکھ رہی ہے۔ اور وہ یہ کہ یہ اعتراف بالعموم صرف زبانوں تک محدود رہتا ہے۔ عمل سے اس کا اظہار شاید ہی کبھی ہوتا ہو۔ اور یہ زبانوں کا اعتراف بھی دراصل ذہن کی تہوں میں دبے چھپے اُن مذہبی اثرات کا نتیجہ ہوتا ہے جو اِن لوگوں کے اندر موروثی طور پر منتقل ہوتے چلے آرہے ہیں، اور اس کی حیثیت قریب قریب ایسی ہی ہوتی ہے جس طرح کہ پکے دہریوں کی زبان پر بھی کبھی کبھی بے اختیار خدا کا نام آجاتا ہے۔ ورنہ سوچنے کی بات ہے کہ جو لوگ انسان کو اصلاً ایک ترقی یافتہ حیوان سمجھتے ہوں، جو خدا اور آخرت کو، وحی اور رسالت کو وہم کی خلاقی قرار دیتے ہوں، اور اگر ان دینی حقائق کے کسی درجے میں قائل ہوں بھی تو ان کے منطقی تقاضوں کو انسانی زندگی کے مسائل کا حل تلاش کرتے وقت کسی لحاظ کے قابل بالکل نہ سمجھتے ہوں، وہ بھلا حسنِ خلق کو کیوں خاطر میں لانے لگے

---

[1] موطا امام مالکؒ۔

اور اخلاقی بندشوں کو کیوں یہ حق دینے لگے کہ وہ ان کی خواہشاتِ نفس کو اپنے کنٹرول میں رکھیں؛ تہذیب جدید، جو فی الواقع ایک اونچے پائے کی جاہلیت ہے، اس کے علم برداروں اور پیروؤں کی عام روش کا جائزہ لے کر دیکھیے تو قدم قدم پر اس حقیقت کی تصدیق ملتی جائے گی۔ کیا آج کوئی قوم ایسی مل سکتی ہے جو دوسروں سے کیے ہوئے اپنے معاہدوں کا بہر حال احترام کرتی ہو؛ لینن کی صاف گوئی کہیے یا اس کی ڈھٹائی، جس نے اپنے دل کی یہ بات کھول کر کہہ دینے میں کسی تکلف سے کام نہیں لیا تھا کہ "سوویٹ یونین کو صرف عالمی سوشلزم کے مقصد کو پورا کرنے پر یقین ہے، اور یہ کہ وعدے تو توڑنے ہی کے لیے کیے جاتے ہیں۔" اسی طرح کیا صلہ رحمی اور بزرگوں کی اطاعت وخدمت کا وصف اِن جاہلیت زدہ قوموں میں عنقا ہوتا چلا نہیں جارہا ہے؛ کیا سچائی کے التزام کو حماقت باور نہیں کیا جارہا ہے؟ غرض کون سا اخلاقی وصف ہے جس کی دھجیاں نہ بکھیر دی گئی ہوں۔ سب سے زیادہ درگت عفت و پاکدامنی کی ہوئی۔ اِس درگت کی تھوڑی سی تفصیل سن لینا مناسب ہوگا۔ اس سے ایک ایسا آئینہ ہاتھ آجائے گا جس میں اِن اہلِ جاہلیت کے اخلاقی فالج کی پوری تصویر دیکھی جاسکے گی۔ بدکاری جیسا مرض ہے، اس کی اخلاقی اور تمدنی آفتوں کا حال سب پر عیاں ہے۔ یہ گندی بیماری ایک طرف تو فرد کے جوہرِ انسانیت اور جوہرِ اخلاق کو تباہ کر کے رکھ دیتی ہے، دوسری طرف معاشرے کو زہر آلود بنا ڈالتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اس کے خلاف منفی اور مثبت کوئی تدبیر بھی اٹھا نہیں رکھی اور کوشش کہ اگر اس کے امکان کو ختم نہ کیا جاسکے تو انتہائی حد تک کم ضرور کر دیا جائے۔ منفی تدبیر تو اس نے یہ اختیار کی کہ اس کے ارتکاب پر انتہائی سخت اور عبرت ناک سزا مقرر کی، ایسی سزا جیسی کسی بھی دوسرے جرم کے لیے اس نے مقرر نہیں کی تھی۔ اور ایسا اس لیے کیا تاکہ اس سزا کے نفاذ کو دیکھ کر اس طرح کی مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے دوسرے افراد کا بھی ذہنی تنقیہ ہوجائے۔ مثبت تدبیریں ایسی اختیار کیں جو اُن سبھی سوراخوں کو بند کر دینے کی صلاحیت رکھتی ہیں جن سے اِس اخلاقی طاعون کے جراثیم ذہنوں میں گھسا کرتے ہیں۔ مردوں اور عورتوں کی مخلوط محفلوں پر بندش، پردے کا حکم، نگاہیں نیچی رکھنے کی تاکید، نیم عریاں لباسوں اور تبرّجِ جاہلیہ کی ممانعت، فحش تحریروں اور بدکاری کے تذکروں کی

روک تھام، رقص و سرود پر پابندی ــــ اور پھر ازدواجی زندگی اختیار کرنے کی ہدایت، تجرد کی زندگی پر اظہارِ ناپسندیدگی، نکاحِ بیوگان کی تلقین، بوقت ضرورت تعددِ ازواج کی اجازت ۔ اِن ساری ہدایات کی سب سے اہم مصلحت یہی ہے کہ اُن تمام ناکوں پر کڑے پہرے بٹھا دیے جائیں جن سے یہ دشمنِ اخلاق بالعموم حملے کی راہ پایا کرتا ہے، اور معاشرے میں کوئی بھی ایسی چیز اور ایسی حالت باقی نہ رہنے دی جائے جو زنا کی محرک بن سکتی ہو ۔ حق یہ ہے کہ اسلام کی اِس دور بینی کی داد نہیں دی جا سکتی جس سے اس نے اس اہم انسانی مسئلے کے سلسلے میں کام لیا ہے، اور انسانیت اُس احسانِ عظیم کا شکر یہ ادا نہیں کر سکتی جو اِس دین نے اس کی اخلاقی پاکیزگی کی حفاظت کا اتنا ہمہ گیر اہتمام کر کے اُس پر کیا ہے ۔ مگر آج علم و عرفان کی مدعی تہذیب کو اس سورج جیسی روشن حقیقت کا بالکل ادراک نہیں ہو رہا ہے، اور اسلام کے اخلاقی نظام کا نام سن کر اُس پر ہذیانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے ۔ اس کے نزدیک معاشرے کو بدکاری کی غلاظت سے پاک رکھنے کی مذکورہ بالا منفی تدبیر ایک وحشیانہ حرکت ہے، اور ساری مثبت تدبیریں حماقتوں کا پلندا ہیں ۔ اس کے خیال میں آزاد شہوت رانی بجائے خود کوئی معیوب چیز ہے ہی نہیں ۔ یہ تو آدمی کی، بالخصوص مرد کی فطری آزادی کا بنیادی حق ہے ۔ انسان آزاد پیدا ہوا ہے ۔ اس کی آزادیوں کو بیڑیاں نہیں پہنائی جا سکتیں ۔ انسان کے جبلّی مطالبات ہر حال میں قابلِ احترام ہیں، اور اس احترام کا تقاضا یہی ہے کہ 'آزاد محبت' (فری لَو) کو مردوں اور عورتوں کے تعلقات کا اصل الاصول قرار دیا جائے ــــ اس 'مہذب' نظریے کا واضح مدعا، اور اس کی 'معقولیت کی دلیل' اگر آپ سننا چاہیں تو ایک روسی مصنف کے الفاظ سن لیں ۔ وہ اپنے ایک ناول میں لکھتا ہے :۔

> "شراب خوری اور زنا کوئی قابلِ شرم چیزیں نہیں ہیں ۔ گناہ کوئی چیز نہیں ۔ محبت کرنا، خوب پینا، اور عورت کا تعاقب کرنا خاصۂ مردانگی ہے، ایک فطری جذبہ ہے، اور فطری جذبہ گناہ نہیں ہو سکتا ۔"

کمیونسٹ دانش ور کی اِس پروازِ خیال پر ابھی انگلی دانتوں میں نہ دبایئے ۔ کیونکہ یہ تو جاہلی منطق کے 'عشق' کی ابتداء ہے، اس کی انتہاؤں کی تو کوئی حد ہی نہیں دکھائی دیتی ۔ معاملہ عورت

کے تعاقب، سے کہیں آگے بڑھ چکا ہے۔ 'خاصۂ مردانگی' اور بدکاری کے 'فطری جذبہ' کے دائرۂ طلب میں اب مرد کو بھی داخل کر لیا گیا ہے، اور اس بیسویں صدی کی تیسری دہائی سے اس داخلے کو قانونی حیثیت بھی ملنی شروع ہوگئی ہے۔ جرمنی کا ایک فاضل، ڈاکٹر ہرشفلڈ، اس عملِ بد کی قانونی حمایت کے اٹھ کھڑا ہوا جس کو چار ہزار برس پہلے حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کے ہاں صرف ایک لت اور رواجِ عام کی حیثیت حاصل تھی۔ اس جرمن فاضل نے چند سال کی مسلسل تبلیغ سے رائے عام کو اپنا ہم نوا بنا لیا۔ یہاں تک کہ جرمن پارلیمنٹ میں رایوں کی اکثریت سے یہ عملِ قومِ لوط بعض شرطوں کے ساتھ قانوناً جائز فعل بن گیا۔ یہ صحیح ہے کہ قوم لوط کا عام لائسنس کی قائل تھی، جب کہ جرمن قوم نے اس عمل کے جواز کو بعض شرطوں کے ساتھ مشروط رکھا۔ لیکن اس فرق کی بنا پر یہ سمجھنا صحیح نہ ہوگا کہ جدید جاہلیت اس معاملہ میں قدیم جاہلیت سے پس ماندہ ہی۔ کیونکہ سدوم والوں کے اس عمل کے پیچھے قانون کی سند نہیں تھی، صرف ایک لت تھی جس میں وہ بری طرح مبتلا ہوگئے تھے۔ جب کہ جرمنی والوں نے اس فعل کو قانون کی سند مہیا کر دی۔ کسی فعل کو قانونی جواز کی سند دینے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس قانون کے بنانے والوں کے ذہن میں اس فعل کے اندر کوئی اخلاقی یا تمدنی قباحت نہیں ہے۔ لیکن اسے ایک ذوق اور لت کے طور پر اپنا لینے کے معنی لازماً یہ نہیں ہوتے، بلکہ اس امر کا پورا امکان ہوتا ہے کہ اس کو کسی نہ کسی حد تک قبیح فعل سمجھتے ہوئے بھی عادت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنا لیا گیا ہو۔ چنانچہ قومِ لوطؑ کا یہی معاملہ تھا۔ انہوں نے اس فعلِ بد کے اندر لت پت ہو رہنے کے باوجود اس کی برائی کو ذہن سے یکسر نکال نہیں دیا تھا۔ حضرت لوطؑ اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں ان کا یہ طنزیہ ریمارک کہ "یہ بڑے پاک باز لوگ ہیں" (إِنَّهُمْ أُنَاسٌ يَتَطَهَّرُونَ - اعراف[۸۲]) اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ اپنے اس فعل کو وہ نظری طور پر اخلاقی طہارت کے تصور سے کلیتہً ہم آہنگ نہیں یقین کرتے تھے۔ البتہ اس سے دوسروں کو باز رکھنے کی کوشش کو اخلاقی طہارت کا ایک انتہا پسندانہ رویہ ضرور خیال کرتے تھے۔ لیکن ان جرمن 'دانش وروں' اور 'فاضلوں' کا حال یہ نہ تھا۔ ان لوگوں نے اس عملِ بد کو قانونی جواز عطا کر کے اس حقیقت کا ثبوت دے دیا کہ اس کے اندر ان کے نزدیک اخلاقی حیثیت سے کوئی قباحت بالکل نہیں ہے۔ یعنی وہی

بات کہ "یہ ایک فطری جذبہ ہے، اور فطری جذبہ گناہ نہیں ہو سکتا۔"

اور یہ بھی نصف صدی قبل کی بات ہے۔ اب تو یہ کے یہاں تک بڑھ چکی ہے کہ کتنے ہی مغربی ملکوں میں، بالفاظِ دگر معیاری جاہلیت کدوں میں، صنفِ ذکور کی آپس میں باضابطہ شادیاں ہونے لگی ہیں، اور اسے پارلیمنٹ بہادر نے قانونی حیثیت دے دی ہے۔ کچھ بعید نہیں کہ آگے چل کر صنفِ اِناث کی بھی باری آجائے، جس کی داغ بیل پڑ بھی چکی ہے۔ تازہ خبر ہے کہ "اٹلی میں ایک پارک کے اندر دو عورتوں، چوبیس[۲۴] سالہ مسز روزا نامزا اور تینتالیس[۴۳] سالہ مسز مریانہ فان توزو، کو برسرِعام بوس وکنار کی فحش حرکتیں کرنے پر سسلی کی ایک عدالت نے سات ماہ کی سزائے قید سنائی۔" واضح رہے کہ عدالت نے یہ سزا اس فعلِ مذکور پر نہیں سنائی ہے، بلکہ اس بات پر سنائی ہے کہ یہ حرکت "پارک میں برسرِعام" کی گئی۔ گویا 'معزز' عدالت کی نگاہ میں دو عورتوں کا باہمی اختلاط بجائے خود کوئی جرم نہ تھا۔ 'ترقی پسندی' اور 'روشن خیالی' کی شاہکار اس خبر کا باقی حصہ یہ ہے کہ "اس سزا کے سنائے جانے پر اطالوی خواتین نے علمِ بغاوت بلند کر دیا۔" اور پھر یہ خبر اپنے نقطۂ کمال کو اس طرح پہنچتی ہے کہ "خواتین کی جماعتوں نے اپنے ایک بیان میں دھمکی دی ہے کہ وہ کل سے بولوگنا میں شروع ہونے والی عورتوں کی ایک 'قومی ہم جنسی کانگرس' کے اندر مزید احتجاج کریں گی۔"

غور کیجیے، جس تہذیب کا مزاج اس حد تک فاسد ہو چکا ہو اور جو بے حیائی اور جنسی شیطنت میں جانوروں کو بھی میلوں پیچھے چھوڑ چکی ہو، وہ اسلامی اخلاقیات کو دورِ ظلمت کی یادگار کے سوا اور کیا قرار دے سکتی ہے؟ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ اخلاقی نظام اس کے لیے اور اس کے حلقہ بگوشوں کے لیے قابلِ فہم ہو سکے گا؟ اور وہ اس کو "شیئٌ عجیب" نہ کہیں گے؟

۱۲۔ معاشی نظام کے معاملے میں

آج پوری دنیا کا سب سے اہم اور مشکل مسئلہ معاش کا مسئلہ ہے۔ جدھر دیکھیے علمی، فنی اور تحقیقی صلاحیتیں پیٹ کی چاکری میں لگی ہوئی ہیں، اور قریب قریب زندگی کے سارے ہی مسائل و معاملات اسی محور پر گھوم رہے ہیں۔ لیکن بشری فکر و فہم کی یہ کتنی عبرت ناک

ناکامی ہے کہ وہ پیہم کوششوں اور بار بار کی بین الاقوامی کانفرنسوں کے باوجود اپنے اِس اہم ترین مسئلے کی گتھی سلجھا نہ سکی، اور اب نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ جس انسان کو اپنے خالق ورزاق اور مالک و معبود کے نام پر اکٹھا ہونا اور اکٹھا رہنا چاہیے تھا، وہ روٹی کے نام پر امتیں، بنا رہا ہے، معاشی طبقوں کے درمیان خلیجیں کھود رہا ہے، اور جنگ و جدال کی صفیں آراستہ کر رہا ہے۔ ایک طرف آزاد معیشت کا سرمایہ پرستانہ نظام ہے، جس کی بنیاد سود اور بے قیدی اور لوٹ کھسوٹ پر ہے۔ سرمایہ دار افراد اور ممالک اپنی انہی تدبیروں سے غریب افراد اور ممالک کا خون چوستے چلے جا رہے ہیں اور خود بھی اندرونی کش مکش میں گرفتار ہیں۔ دوسری طرف پرولتاری نظامِ معیشت ہے، جس نے عوام کو ان کے اپنے نجی حقوقِ ملکیت سے محروم کر کے معیشت کے سارے ذرائع اسٹیٹ کے قبضے میں دے دیے ہیں، اور انہیں مشین کے بے حس اور بے اختیار پرزوں کی حیثیت دے کر ان کے لیے اپنی مرضی کے مطابق راتب، مقرر کر دیے ہیں۔ جس کے نتیجے میں ان کے اندر معاشی جدو جہد اور پیداواری ترقی کا وہ فطری جذبہ سرد پڑ گیا ہے جو آدمی کے اندر ذاتی ملکیت کا حق حاصل رہنے ہی کی شکل میں پوری طرح سرگرم رہا کرتا ہے۔ جہاں تک دوسری مملکتوں سے مالی لین دین کا تعلق ہے، اس کے معاملے میں یہ کمیونسٹ نظام بھی سرمایہ دارانہ نظام ہی کی طرح سود کے بغیر لقمہ نہیں توڑتا۔ غرض پورے عالمی نظامِ معیشت کی ریڑھ کی ہڈی یہی سود ہے۔ اس لعنت پر مستزاد وہ خود غرضانہ اور پُر فریب تجارتی چالیں ہیں جنہیں دونوں ہی نظاموں نے غریب ملکوں کو اپنی معاشی غلامی میں جکڑے رکھنے کے لیے اختیار کر رکھا ہے۔ پھر نظام چاہے یہ ہو چاہے وہ، خود اپنے ملکوں میں بھی فی الواقع خدمت گار صرف محدود تعداد کے اونچے طبقوں ہی کا ہے۔ عوام بے چارے اس گاڑی میں مجبوراً جُتے ہوئے ہیں۔ کمیونسٹ نظام کے اندر تو وہ، بندھوا، مزدور ہونے کے باعث زبان ہلا نہیں سکتے۔ ویسے جہاں انہیں پھڑ پھڑانے کا کوئی موقع مل جاتا ہے وہاں اُن کے احساسِ محرومی کا آتش فشاں پھٹ بھی پڑتا ہے، جیسا کہ ابھی سال دو سال پہلے پولینڈ میں ہو چکا ہے اور اب بھی اس کی آگ اندر ہی اندر دہک رہی ہے۔ رہا سرمایہ دارانہ نظام، تو اس کے اندر چونکہ جمہوری آزادی ہے، اس لیے وہاں آئے دن مزدوروں اور بے کاروں

کے ہنگامے، ہڑتالیں اور مار دھاڑ تک سب کچھ ہوتا رہتا ہے اور انتظامی وصنعتی امن درہم برہم ہو جایا کرتا ہے۔ ان سب باتوں کے علاوہ یہ سارا سودی نظام رہ رہ کر بے روزگاری اور کساد بازاری کا شکار بھی ہوتا رہتا ہے۔ سود کی پجاری دنیا یہ سب کچھ بھگتتی رہتی ہے، مگر اسکی بغل میں جو ایک اور نظام معیشت ــــ اسلامی نظام معیشت ــــ موجود ہے، اس کی طرف توجہ کرنے کا نام نہیں لیتی۔ حالانکہ وہی اس کے تمام معاشی دکھوں کا تنہا علاج ہے۔ جہاں بھی اسے اپنایا جائے گا، وہاں اُن الجھنوں، پریشانیوں اور کشاکشوں کے رونما ہونے کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہو رہیں گے جن سے آج مشرق اور مغرب سب دوچار ہیں۔ کیونکہ اس نظام کی بنیاد جن تین چیزوں پر استوار کی گئی ہے وہ ایسی فضا پیدا ہی نہ ہونے دیں گے جس میں یہ خرابیاں پروان چڑھ سکیں یہ تینوں چیزیں بس یہ ہیں: سود کی قطعی ممانعت، زکوٰۃ اور صدقات کی فرضیت کے ذریعے محتاجوں اور پست حالوں کی کفالت کا اجتماعی نظم، کمانے اور صرف کرنے، دونوں کاموں پر معقول اور موثر بندشوں کا نفاذ۔ اسلامی نظام معیشت کے ان بنیادی اصولوں پر صاف ذہن کے ساتھ نظریں ڈالنے والا کوئی بھی شخص ان کی غیر معمولی خوبیوں کا انکار نہیں کر سکتا۔ پھر حقیقت یہ بھی ہے کہ یہ کوئی خیالی اور نرالی کتابی نظام نہیں ہے، بلکہ ایسا نظام ہے جو ایک مدت تک نافذ رہ چکا ہے، اور اس کی کامیابی کا مسلسل مشاہدہ کیا جا چکا ہے۔ لیکن اپنی عافیت کی دشمن اِس دنیائے جاہلیت کا تغافل دیکھیے کہ وہ اس نظام کو کوئی معاشی نظام سمجھتی ہی نہیں، اور اسے کچھ اخلاقی ہدایات کی ایک فہرست قرار دے کر نظر انداز کر دیتی ہے۔ اگر اس کو بتایا جائے کہ یہ ایک منفرد قسم کا معاشی نظام ہے اور نہایت کامیاب نظام ہے، تو مسکرا کر رہ جاتی ہے۔ اسے یہ بات کسی طرح قابلِ فہم معلوم ہی نہیں ہوتی کہ سود فرد اور سماج سبھی کے لیے ایک لعنت ہے، اور زکوٰۃ میں فرد اور سماج سبھی کی فلاح ہے۔.....

"یَمْحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی الصَّدَقَاتِ" (بقرہ۔ ۲۷۶) کی حقیقت اور معاشی صداقت جس طرح ساڑھے تیرہ سو برس پہلے عرب کے جاہل بدو کی سمجھ میں نہ آتی تھی، اسی طرح آج بیسویں صدی میں معاشیات کے پروفیسر اور ڈاکٹر کی کھوپڑی میں بھی نہیں اتر رہی ہے۔ اور اس کا دماغ بھی اِس حکیمانہ نکتے کے سمجھنے سے قاصر ہے کہ سودی کاروبار سے اجتماعی دولت گھٹتی

اور زکوٰۃ کے نظم سے بڑھتی ہے۔ یہ بھی انہی نظریاتی بھول بھلیوں میں پھنسا ہوا ہے جن میں عرب کا ان پڑھ سود خوار پھنسا ہوا تھا، اور سود کو بیع ہی کی ایک شکل کہتا ہے جس طرح وہ کہا کرتا تھا۔

معاشی تصورات کے سلسلے میں نئی جاہلیت کو اپنے قدیم مورث سے وراثت میں ایک لعنت اور بھی ملی ہوئی ہے۔ عرب کا جاہل اور غیر متمدن بدو اپنی اولاد کو، بالخصوص لڑکیوں کو، رزق کی قلت کے اندیشے سے قتل کر ڈالتا تھا۔ آج تہذیب کا 'امام' بھی یہی کر رہا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس نے اپنی اس ظالمانہ حرکت کو علم اور فلسفے کا لباس پہنا رکھا ہے، اور دنیا اس کو جاہل کہنے کے بجائے ڈاکٹر صاحب کہتی ہے۔ عرب کے ان پڑھ نے یہی کام کیا تو جاہل، سنگدل ظالم، غیر مہذب اور وحشی کہلایا، اور اس کی یہ حرکت 'قتلِ اولاد' کہلائی۔ لیکن جب یہی ظالمانہ معاشی نظریہ اس نے پیش کیا تو اس کی تحسین و آفریں ہونے لگی، اور اس بربریت کا نام 'برتھ کنٹرول' رکھ دیا گیا۔ اور اب تو جاہلیت کے علم برداروں کی دیکھا دیکھی ایروں غیروں پر بھی ترقی پسندی اور روشن خیالی کا خبط سوار ہو گیا ہے، اور وہ بھی اپنے استادوں کی ریس میں رزاقیت کا درد اپنے سر میں محسوس کرنے لگے ہیں۔ اگرچہ اسلام کے معاشی تصورات اور احکام و ہدایات ان سب کے سامنے موجود ہیں، اور ان کے نفاذ کی کامیاب تاریخ سے بھی انہیں بے خبر نہ ہونا چاہیے، مگر تعجب ہے کہ ان سب کے لیے اس نظامِ رحمت کا وجود و عدم برابر ہے۔ وجہ اس اندھے پن کی یہ ہے کہ اسلامی نظامِ معیشت وہ 'شجرِ طیب' ہے جس کی جڑ اللہ تعالیٰ کی ہستی کے یقینِ کامل سے، اور تنہا اللہ کی رزاقیت پر سچے ایمان سے بنا ہے، جب کہ جاہلیت کے اماموں اور ان کے پیرودں کو یا تو خدا کا وجود ہی تسلیم نہیں، یا اگر تسلیم ہے تو اس کی صفتِ رزاقیت پر وہ ایمان نہیں جو ہونا چاہیے۔ جب ذہنوں اور دماغوں پر انکار کا ایسا پردہ پڑا ہوا ہو، یا بے یقینی کی ایسی دھند چھائی ہوئی ہو تو "اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّۃِ الْمَتِیْنُ[۱]" (اللہ خود ہی سب کو روزی دینے والا، بڑی قوت والا اور زبردست ہے) یا "فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰہِ الرِّزْقَ[۲]" (پس اللہ کے پاس رزق تلاش کرو) یا "اَللّٰہُ یَبْسُطُ الرِّزْقَ

---

[۱] سورۂ ذاریات۔ ۵۸۔ [۲] عنکبوت۔ ۱۷۔

لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ[1] "اللہ جس کو چاہتا ہے زیادہ روزی دیتا ہے، اور جسے چاہتا ہے نپی تلی دیتا ہے) یا" وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَکُمْ خَشْیَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِیَّاکُمْ"[2] (اپنی اولادوں کو ناداری کے اندیشے کی بنا پر قتل نہ کرو، ہم ان کو بھی روزی دیتے ہیں اور تم کو بھی) کے ایمانی حقائق انہیں کیوں اپیل کرنے لگے؟ اور جب اسلامی نظام معیشت کی اس اصل روح ہی سے وہ محروم ہوں تو اس کے "قالب" سے انہیں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ اور جس چیز سے آدمی کو سرے سے کوئی دلچسپی ہی نہ ہو اس کی وہ قدر کیسے پہچان سکتا ہے؟ قدر کا پہچاننا تو الگ رہا، وہ اسے جاننے اور سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی دیگر باتوں کی طرح اس کا معاشی نظام بھی اس دنیائے جاہلیت کے لیے بالکل غیر مانوس بنا ہوا ہے۔

ایک غیر مسلم کی شہادت

جاہلیتِ جدیدہ کے امام ممالک اسلام دشمنی کے ساتھ ساتھ اسلام ناشناسی میں بھی کس انتہاء کو پہنچے ہوئے ہیں، اس امر کا اندازہ اوپر کے مباحث سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ اور اس اندازے کی تائید ایک بڑی حد تک خود اُن مغربی اہلِ قلم سے بھی ملا کرتی ہے جن کے ضمیر میں جان باقی ہے۔ مثال کے طور پر مشہور امریکی نقاد ایڈورڈ ڈبلیو ساد کو لے لیجیے، جو اپنی کتاب "ذرائعِ ابلاغ اور اسلام" میں لکھتا ہے کہ:۔

> "آج کل امریکہ اور یورپ میں عام لوگوں کے لیے اسلام کا مطلب ایسی خبریں ہیں جو خاص طور پر ناگوارِ خاطر ہوں۔ ذرائعِ ابلاغ، حکومتیں اور دانشور، سب اس پر متفق ہیں کہ اسلام مغربی تمدن کے لیے خطرہ ہے۔ اسلام کی منفی باتیں دوسری باتوں کے مقابلے میں زیادہ رائج ہیں اس لیے نہیں کہ ان کا اسلام سے کوئی واسطہ ہے، بلکہ اس لیے کہ

---

[1] سورۂ رعد۔ ۲۶۔ [2] بنی اسرائیل۔ ۳۱۔

سوسائٹی کا ایک متقدر طبقہ (جو اسلام کے خلاف ہے) ان کو ایسا ہی گردانتا ہے۔ یہ طبقہ بڑا با اثر ہے، اور اس نے اسلام کے اِس (منفی) تصور کو پھیلانے کا ارادہ کر رکھا ہے۔" (صفحہ ۱۳۶)

اسی کتاب میں وہ ایک اور جگہ لکھتا ہے:۔

"میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ امریکہ میں ٹیلویژن پر مقبول ترین اوقات میں شاید ہی کوئی پروگرام ہو جس میں نسلی عداوت شامل نہ ہو، اور جہاں مسلمانوں کا مذاق نہ اڑایا گیا ہو، اور جہاں مسلمانوں کو 'جرک' کا نام دے کر برا بھلا نہ کہا گیا ہو۔ اسلام کے معاملے میں امریکہ کی رائے عام یہ ہے کہ جو چیزیں انہیں ناپسند ہیں وہ اسلامی ہیں۔" (صفحہ ٦٩)

جب اسلام کے بارے میں امریکہ ابنٹکو کا یہ رویہ ہو تو روس اور اس کے حواری ملکوں میں اِس دینِ خدا کو کیا کچھ نہ کہا اور بتایا جاتا ہوگا، جن کا بنیادی نظریہ ہی خدا اور مذہب کی نفی سے تشکیل پایا ہوا ہے، اور جن کی بنیادی پالیسی ہی یہ ہے کہ خلقِ خدا کو مذہب سے متنفر کر دینے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جائے۔

حقائق کا فیصلہ

جدید جاہلیت، جس کا معروف نام 'جدید تہذیب' ہے، اسلام کے بارے میں کیا ذہن رکھتی ہے؟ اسے کس نگاہ سے دیکھتی ہے؟ اور اسلام اس کے لیے کتنا قابلِ فہم ہے؟ ان سوالوں کا ایک اجمالی جواب آپ کے سامنے آچکا۔ اگر آپ چاہیں تو اس اجمال کو تفصیل کی شکل میں آسانی سے بدل لے سکتے ہیں۔ کیونکہ اس بحث سے تعلق رکھنے والے حقائق بھی معلوم و مشہود ہیں اور نظائر و شواہد بھی موجود ہیں۔ اس تہذیب کی بعض افادیتوں اور خوبیوں کا انکار نہیں۔ لیکن سوال یہاں ٹہنیوں اور پتیوں کا نہیں ہے، بلکہ جڑوں اور پھلوں کا ہے۔ اور کوئی بھی صاحبِ نظر، بشرطیکہ اس کا ذہن مغرب سے مرعوب نہ ہو، اس

تہذیب کی جڑوں کو 'صالح' قرار نہیں دے سکتا، نہ اس کے پھلوں کو خوش گوار کہہ سکتا تھا کیونکہ ان جڑوں کو جس بیج نے جنم دیا ہے' وہ خالص جاہلیت کا بیج ہے۔ اور اس دور کی جاہلیت اتنی مثالی ہے کہ پرانی جاہلیتوں میں سے کوئی بھی اس کی ہم سری نہیں کر سکتی۔ پرانی جاہلیتوں کا جوہرِ حیات یا تو شرک ہوتا تھا یا کفر، آخرت کا انکار ہوتا تھا یا شفاعت کا من بھاتا عقیدہ' جب کہ یہ ترقی یافتہ جاہلیت خدا کی ہستی کے انکار سے وجود میں آئی ہے۔ جب اسلام کی بنیاد خدا کے ایمانِ کامل پر اور اس جاہلیت کی بنیاد خدا کے انکارِ مطلق پر ہے، تو یقینی بات ہے کہ یہ دونوں، فکر اور عمل کے میدان میں کہیں بھی اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ اور جب یہ دونوں کسی جگہ بھی پہلو بہ پہلو نہیں آسکتے تو قدرتی طور پر اس جاہلیت کے پیرووں کے لیے اللہ کا دین جس قدر 'غریب'، اجنبی اور ناقابلِ فہم ہو سکتا ہے' اُس قدر غریب پچھلے کسی دور میں ہرگز نہ رہا ہوگا۔ اس لیے آج کے معرکۂ اسلام و جاہلیت کی بابت یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ بس چودہ سو برس کی قدیم تاریخ اپنے کو دہرا رہی ہے۔ نہیں، بات بہت آگے بڑھ چکی ہے۔ 'روشنی' کے اِس دور میں وہ تمام تاریکیاں اکٹھی ہو گئی ہیں جنہیں نفسانیت، مادہ پرستی اور فکر و نظر کی کجی، آباء و اجداد کی اندھی پیروی اور عناد و تعصب، ساری چیزیں ابتداء سے اب تک وجود میں لاسکی ہیں، اور حق کو نیست و نابود کرنے کے لیے باطل نے اپنے کو اُن سبھی ہتھیاروں سے سجا رکھا ہے جن کو پرانی اور نئی ساری جاہلیتیں ایجاد کر سکی ہیں۔ عادؔ کی جبّاریت، ثمودؔ کی سرکشی، فرعونؔ کا اِفساد فی الارض، اہلِ مدینؔ کی کاروباری چالیں، سدومؔ والوں کا فاحشہ قوم شعیبؔ کا مذہبی تصورِ انفرادیت، اہلِ عرب کا من ماتا عقیدۂ شفاعت، غرض جاہلیت کا کونسا مظہر ہے جو اِس وقت موجود نہیں، اور اسلام کا کون سا شعبہ ہے جس کے عجیب و غریب ہونے پر تمسخر بھرے اشارے نہ کیے جاتے ہوں۔

'باہر' کی دنیا کا 'سین' یہ ہے جو اِس وقت آپ نے دیکھا، 'اندر' کی دنیا کا منظر اس سے پہلے کے صفحات میں دیکھ چکے ہیں۔ پوری تصویر دیکھ لینے کے بعد "وَ سَیَعُوْدُ غَرِیْبًا" کی نبوی پیشین گوئی کی بابت فیصلہ، کہ وہ کس حد تک ظہور میں آچکی ہے، کچھ مشکل نہیں رہا۔ یہ فیصلہ اِس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ باہر والوں کے لیے اگر اسلام

پوری طرح غربت، اور اجنبیت کے پردوں میں ڈھک گیا ہے، تو اندر والوں کے لیے بھی کچھ زیادہ جانا پہچانا، مانوس و مالوف نہیں رہ گیا ہے۔ ملتِ اسلامیہ کے مختلف طبقات کے ہاں اِس اجنبیت کے درجے مختلف ضرور رہیں، لیکن، ایک محدود استثنا کے ساتھ، اجنبیت کی دھند باقی سبھی کے لیے نظر کا حجاب بنی ہوئی ہے، البتہ کہیں یہ دھند ہلکی ہے اور کہیں گہری۔



طُوبیٰ لِلغُربَاء

فرض کی پکار

جب اسلام کا ظہور ہوا تھا، اُس وقت 'غربت' کی حالت میں تھا۔ اس کے بعد وہ ایک مدت تک شہرت اور غلبہ کی حالت میں رہا۔ اب وہ پھر بہت بڑی حد تک غربت کی حالت میں واپس لوٹ گیا ہے۔ یہ تینوں حالتیں دراصل دنیائے انسانیت کی تاریخ کے تین باب ہیں۔ کیا اسی حد پر یہ تاریخ اپنے اختتام پر پہنچ گئی ہے یا اس کا چوتھا باب بھی لکھا جائے گا؟ انسانیت کی قسمت اگر پھوٹ نہیں گئی ہے تو یہ باب بھی لازماً لکھا جانا چاہیے۔ اور اسلام کے نام لیوا اگر اپنی غفلتوں اور محرومیوں پر صبر نہ کر بیٹھے ہوں تو ان کا پہلا اور آخری فرض یہی ہے کہ وہ یہ باب لکھ کر رہیں۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں افسوس اور درد کے ساتھ یہ دلخراش خبر دی تھی کہ اسلام کے اوپر غربت اور اجنبیت کے بادل پھر چھا جائیں گے، وہاں یہ خوشخبری بھی سنا رکھی ہے کہ ایک وقت آئے گا جب خیر کا دور پھر لوٹے گا۔ اہلِ ایمان کو اس بشارت سے حوصلہ پانا چاہیے۔ لیکن بالفرض یہ خوش خبری موجود نہ ہوتی، تب بھی یہ سوال تو اپنی جگہ موجود ہی تھا کہ اسلام کے پیروؤں کا بجائے خود کیا فرض ہے؟ کیا وہ اللہ کی زمین پر اس کے دین کے داعی اور حق کے شاہد نہیں بنائے گئے ہیں؟ جب ان کا مقام و منصب یہ ہے تو وہ جاہلیت کے پھیلے اور چھائے ہوئے جھاگ کو دیکھ کر ہمت کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟ اور حالات کو ناسازگار پا کر بد دل اور خاموش ہو رہنے کی گنجائش ان کے لیے کہاں سے نکل سکتی ہے؟ پھر حضورؐ نے اسلام کے دورِ غربت کی پیشین گوئی ہی تو کی تھی۔ یہ بھی تو نہیں فرمایا تھا کہ لوگ غربت کی اس حالت کو دینِ خدا کا دائمی مقدر سمجھ لیں، اور اس پر ہمیشہ کے لیے

صبر کر بیٹھیں۔ اس کے بخلاف آپؐ کی وصیت تو یہ تھی کہ آنے والے دورِ غربت میں اہلِ ایمان کو ہرگز سپر انداز نہ ہونا چاہیے۔ اور ساتھ ہی اس اطمینان کا اظہار بھی کر دیا تھا کہ اس وصیت کو یاد رکھنے والے کچھ نہ کچھ لوگ امت میں ہمیشہ پائے جاتے رہیں گے:۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَجْمَعُ اُمَّتِیْ عَلٰی ضَلَالَۃٍ[1]	اللہ تعالیٰ میری امت کو کبھی کسی ضلالت پر اکٹھا نہ کرے گا۔

مزید فرمایا تھا کہ:۔

لَا تَزَالُ طَائِفَۃٌ مِّنْ اُمَّتِیْ یُقَاتِلُوْنَ عَلَی الْحَقِّ ظَاھِرِیْنَ عَلٰی مَنْ نَاوَاھُمْ۔[2]	میری امت میں سے ایک گروہ ہمیشہ حق کے لیے لڑتا رہے گا، اور اپنے دشمنوں پر غالب رہے گا۔

معلوم ہوا کہ یہ امت اہلِ حق سے کبھی خالی نہ رہے گی۔ اس میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا بہرحال پایا جاتا رہے گا جو حضورؐ کی وصیت پر عمل کرے گا اور حق پر قائم رہے گا، اس طرح قائم رہے گا کہ اہلِ جاہلیت اپنی تمام تر معاندانہ کوششوں کے باوجود انہیں پست حوصلہ نہ کر سکیں گے۔ حضورؐ کی یہ پیشین گوئی، یا خوش خبری ایک بڑی اہم حقیقت پر مبنی تھی۔ یہ امت خدا کے دین کی آخری علم بردار امت ہے۔ اس لیے گزشتہ امتوں کی طرح یہ بھی اگر خدانخواستہ کبھی پوری کی پوری گمراہ ہو کر رہ جاتی تو خلقِ خدا تک ہدایت کا پیغام پہنچتے رہنے کی کوئی صورت باقی نہ رہ سکتی۔ اور یہ بات اللہ تعالیٰ کی حکمت کے بھی خلاف ہوتی اور اس کے عدل کے بھی خلاف ہوتی۔ اس لیے ضروری تھا کہ اس امت کی لاکھ خرابیوں کے باوجود اس کا کوئی نہ کوئی حصہ ہدایت کا منارہ بنا دنیا میں برابر موجود رہے۔ تاکہ اس کے ذریعہ خدا کا پیغام بندوں تک کسی نہ کسی طرح پہنچتا رہے۔

تاریک سے تاریک حالات میں بھی اگر امت کا کوئی نہ کوئی گروہ (طائفہ) حق پر قائم رہنے والا اور حق کے لیے لڑنے والا موجود رہے گا تو دوسرے بھی کیوں نہیں ایسے ہی بن سکتے؟

---

[1] ترمذی، جلد دوم۔ باب لزوم الجماعۃ۔ [2] ابوداؤد۔ جلد اول۔ باب فی دوام الجہاد۔

ہر حال اور ہر دور میں اہلِ حق کے ایک گروہ کی موجودگی کا واضح مطلب یہ ہے کہ سچے اہلِ ایمان کے لیے حالات کی ناسازگاریاں کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ پس ضرورت حالات کو دیکھنے کی نہیں، خود اپنے کو دیکھنے کی ہے۔ "لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ" کی اطمینان دہانی جس طرح حضرات صحابہؓ کے لیے تھی، اسی طرح ہر دور کے مسلمانوں کے لیے ہے۔ اور ایمان کا اہلِ ایمان سے مطالبہ یہی ہے کہ وہ اس اطمینان دہانی پر مطمئن ہو کر کشتی دریا میں اتار دیں۔ یہ ہے فرض کی وہ پکار جو اسلام کی زبانِ حال سے مسلسل بلند ہوتی رہتی ہے۔ اسلام والوں کو اسے کان لگا کر سننا چاہیے۔

اہلِ حق کی تصویر، سراپا غربت

حق پر قائم رہنے والے اس گروہ کی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خاص پہچان اور امتیازی شان بتائی ہے، یا یوں سمجھیے کہ ان کے ایمان و عمل کا ایک مخصوص معیار بتایا ہے۔ یہ پہچان، یہ امتیازی شان، اور یہ معیار آپؐ کے اُسی جامع ارشاد کے آخری جملے میں مذکور ہے جس کے پہلے کے جملوں میں اسلام کے دونوں اَدوارِ غربت کا ذکر ہے۔ اِس جملے کے الفاظ یہ ہیں:-

.... فَطُوْبٰى لِلْغُرَبَاءِ[1] پس مبارکی ہے 'غربت' والوں کے لیے۔

اِن الفاظ سے برسرِحق گروہ کی پہچان اور امتیازی شان یہ قرار پاتی ہے کہ جاہلیت کے عروج کے زمانوں میں جس طرح اسلام غریب اور اجنبی بنا ہوگا، اسی طرح امت کا یہ گروہ بھی غربت اور اجنبیت کے ماحول میں سانس لے رہا ہوگا۔ اہلِ زمانہ اس گروہ کے افراد سے کوئی اُنس نہ محسوس کریں گے، انہیں ماضی کی یادگار کہا جائے گا، ان کی طرف انگلیاں اٹھیں گی، اور اُن کا مذاق اڑایا جائے گا۔ اور یہ سب کچھ اس لیے ہوگا کہ جس اسلام کو ایک اعجوبہ قرار دے دیا گیا ہوگا، اس کی ایک ایک چیز کو وہ دانتوں سے پکڑے رہیں گے، اور نہ صرف یہ کہ اسے دانتوں سے پکڑے رہیں گے بلکہ کوشش کریں گے کہ دوسرے بھی اسے اپنا لیں۔ دوسرے

---

[1] ترمذی، جلد دوم۔ باب ماجاء ان الاسلام بدء غریبًا۔

لفظوں میں یہ کہ وہ کسی ملامت اور طنز و تمسخر کی پروا کیے بغیر پوری استقامت کے ساتھ اسلام کے داعی اور حق کے نقیب بنے رہیں گے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے 'غرباء' کا عملی رویّہ یہی بتایا تھا:-

اَلَّذِیْنَ یُصْلِحُوْنَ مَا اَفْسَدَ النَّاسُ مِنْ بَعْدِیْ مِنْ سُنَّتِیْ ؕ لہ	یہ وہ لوگ ہوں گے جو اُس بگاڑ کو دور کریں گے جسے لوگوں نے میرے بعد میری 'سنت' (عملی روش) میں پیدا کر دیا ہوگا۔

حضورؐ کی 'سنّت' کو، جسے لوگوں نے بگاڑ کر رکھ دیا ہوگا، درست کرنے اور اسے نکھار کر اپنی اصل ہیئت میں واپس لانے کے کام میں وہ سب کچھ موجود ہے جس کے مجموعے کا نام 'حق کی شہادت' اور 'خیر کی دعوت' ہے۔ اس لیے اس ارشاد کا پورا مدعا یہ ہے کہ یہ 'غرباء' خود بھی اسلام پر جمے ہوں گے، غافل مسلمانوں کو بھی غفلت کی حالت سے نکالنے کی کوشش کرتے رہیں گے، اور اسلام پر جو غبار ڈال دیا گیا ہوگا اسے بھی ہٹا کر اس دین کی اصل اور مکمل صورت دنیا کے سامنے پیش کریں گے' اور اپنے اِس جہادِ مسلسل پر دل سے مطمئن، اور اس کی توفیق پانے پر اللہ کے شکر گذار ہوں گے۔ انہیں اس حقیقت پر شرحِ صدر حاصل ہوگا کہ اس وقت اسلام اگرچہ غریب اور نامانوس بن کر رہ گیا ہے، لیکن فی الاصل دنیا کا کوئی بھی دوسرا نظامِ فکر و عمل انسانی فطرت کو اس سے بڑھ کر مرغوب و مطلوب نہیں ہو سکتا، اور غیر اسلام اگرچہ آج دوپہر کا سورج بنا ہوا دنیا کے سر پر چمک اور بھڑک رہا ہے لیکن اس کی چمک بالکل جھوٹی اور اس کی آتش نگاہی بالکل ناپائدار ہے۔ وہ ان لوگوں کی ہفوات سے رائی برابر بھی متاثر نہ ہوں گے جو اسلام کو تیرہ چودہ سو برس پرانا مذہب کہتے ہیں، اور ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پورے یقین کے ساتھ اور کسی معذرت کے بغیر صاف صاف کہہ سکیں گے کہ تم غلط سمجھتے اور غلط کہتے ہو، یہ دین صرف تیرہ چودہ سو برس نہیں، بلکہ اپنے اصول و مقاصد اور اپنی بنیادی تعلیمات کے لحاظ سے ہزاروں برس قدیم ہے، اُتنا ہی قدیم ہے جتنی قدیم خود انسان کی ہستی ہے۔ جس طرح یہ پورا نظامِ کائنات لامعلوم مدت پہلے وجود میں آیا تھا اور اب تک قائم ہے اور ابد تک قائم رہے گا، اور اس طویل العمری کے باوجود اس کائنات کی نہ

کہکشائیں بوڑھی ہو سکتی ہیں، نہ اس کے شمسی نظاموں، اس کے سیاروں اور ستاروں، اس کے سورج اور اس کے چاند میں سے کوئی چیز از کار رفتہ ہو سکتی ہے، اسی طرح یہ اسلام، خدا کا یہ ازلی اور ابدی دین، اور زندگی و بندگی کا یہ نظام حق بھی کبھی بوڑھا، فرسودہ، از کار رفتہ نہ ہو سکا ہے نہ ہو سکے گا۔ بادل کی موٹی تہیں جب فضا میں چھا جاتی ہیں تو آسمان کا کوئی کرہ، حتیٰ کہ خود آسمان بھی نظر نہیں آیا کرتا، لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں ہوتا کہ اوپر کی ساری چمکتی دمکتی چیزیں نیست ہو چکی ہیں۔ ٹھیک یہی معاملہ اِس دین کا بھی ہے۔ آج تم لوگوں کے لیے اس کے عقائد اور اس کے تصورات، اس کی قدریں اور اس کی تعلیمات یقیناً 'غریب' اور نامانوس بنی ہوئی ہیں، مگر یہ صورتِ حال اسلام کی فرسودگی کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ خود تم لوگوں کی اپنی کج نظری، کم نگاہی پست خیالی اور بے بصری کا نتیجہ ہے۔ ورنہ اسلام کی تازگی، اس کی توانائی اور اس کی قائدانہ صلاحیت بدستور قائم و برقرار ہے اور ہمیشہ قائم و برقرار رہے گی۔ خدا کا دین کوئی تاج محل اور قطب مینار نہیں کہ اس کا جمال کبھی نہ کبھی ماند پڑ جانے والا، اور اس کی سربلندی کبھی نہ کبھی زمین بوس ہو جانے والی ہو، بلکہ صداقت اور ہدایت کا وہ نورِ مجسم ہے جس کے لیے عمر رسیدگی کوئی معنی نہیں رکھتی۔

اہلِ حق سراپا غربت ہوں گے، اور ان کی غربت کی یہ تصویر ہوگی۔ کوئی شک نہیں کہ اپنی ایسی تصویر بنانے کے لیے فرہاد کا جگر اور قیس کا جنون درکار ہے۔ یہ جگر اور یہ جنون ایسے لوگوں کے اندر نہیں پیدا ہو سکتا جو کوئی قدم اٹھاتے یا زبان کھولتے وقت زمانے کے تیوروں اور علم برداران جاہلیت کی چتونوں کو بھی دیکھتے رہیں۔ اسی طرح وہ لوگ بھی اس متاعِ گراں قدر سے محروم ہوں گے جو صرف اپنے کام سے کام رکھنا کافی سمجھیں۔ دوسرے کیا کر رہے ہیں، کیا کہہ رہے ہیں کیا بنا اور کیا بگاڑ رہے ہیں، ان باتوں سے انہیں کوئی سروکار نہ ہو۔ پہلی طرح کا سہما سہما اتباعِ اسلام تو وہ تصویر کبھی بنا ہی نہیں سکتا جو غربائے اسلام کی تصویر ہے، دوسری طرح کا اونگھتا ہوا اتباع بھی دو ایک آڑی ترچھی لکیریں کھینچ دینے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا۔

روشنی کی ایک کرن

یہ تو ادائے فرض کے حق کی بات ہوئی، اور ایک مسلمان کے لیے اسی بات کو کافی ہونا

چاہیے۔ لیکن حالاتِ زمانہ کا گہرائی سے جائزہ لیا جائے۔ تو وہ اب فی الواقع اتنے سخت بھی نہیں رہ گئے ہیں جتنا اوپر سے نظر آتے ہیں۔ اُفق پر امید کی کرن نمودار ہو چلی ہے جاہلیت کا زور اپنی انتہا کو پہنچتے پہنچتے کس قدر ٹوٹنے لگا ہے۔ اور اس کی وجہ اس کے پیدا کیے ہوئے وہ کڑوے کسیلے پھل ہیں جنہیں کھا کر بہتوں کے منہ کا مزا خراب ہوتا جا رہا ہے۔ آدم کے جو بیٹے شیطان کے اٹھائے ہوئے طوفانِ جاہلیت میں بہ گئے تھے، ان میں سے بہتیرے اب اس کے تھپیڑے کھا کھا کر خاصے پریشان ہو اٹھے ہیں۔ مادیت، خدا فراموشی اور نفسانیت کے تلخ نتائج نے ان کے ذہنی سکون میں ایک طرح کی ہل چل پیدا کر دی ہے۔ انہیں محسوس ہونے لگا ہے کہ گو اُن کے پاس دولت، سامانِ عیش، جاہ و اقتدار اور علم و فن، سب کچھ موجود ہے، مگر زندگی کا سکون رخصت ہوتا جا رہا ہے، اندر کا سکون بھی اور باہر کا سکون بھی۔ حالانکہ سکون انسان کی ایسی ضرورت اور نعمت ہے جس کا کوئی بدل نہیں۔ اسے کھو کر آدمی کبھی خوش نہیں رہ سکتا۔ ہپی ازم کا جو لاوا پھوٹ بہا ہے، کیا وہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ انسان دولت اور عیش کی فراوانی سے اکتا چلا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح مٹھاس میں ایک خاص ڈگری سے آگے بڑھ جانے پر تلخی محسوس ہونے لگتی ہے، اسی طرح دولت اور عیش کی حد سے بڑھی ہوئی نام نہاد مٹھاس بھی انسانی فطرت کے لیے خوش گوار نہیں رہ جاتی اور وہ اسے اگلنا شروع کر دیتی ہے۔ موجودہ مادی تہذیب انسان کو اسی صورتِ حال سے دو چار کرنے لگی ہے۔ سامانِ عیش کی ظاہری بہتات اندر کی مفلسی میں تبدیل ہو گئی ہے۔ ایک پہلو سے یہی انجام مادی قوت کی بے محابا ترقی کا بھی ہو رہا ہے۔ اس ترقی کو سکون اور راحت کی ضمانت سمجھا جاتا تھا، مگر ہوا یہ کہ وہ اپنے پیٹ سے بے چینی اور خوف زدگی کو جنم دے رہی ہے۔ امریکہ اور روس کی سُپر پاورس کو دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ کسی اچانک ایٹمی حملے کے اندیشوں نے ان کی نیند اڑا رکھی ہے۔

اب اُن مروجہ قوانینِ زندگی کی طرف آیئے جنہیں بڑے بڑے عالی دماغ قانون سازوں نے بنایا تھا، آپ دیکھیں گے کہ ان کا بھرم بھی کھلتا جا رہا ہے اور ان کی ناکامی کا آئے دن مظاہرہ ہوتا رہتا ہے۔ ایک تہائی صدی پہلے مشہور برطانوی مفکر، برٹرینڈ رسل، نے جو یہ خیال ظاہر کیا تھا

کہ سفید فاموں کی سیادت کا دور ختم ہو رہا ہے، وہ محض ایک خیال ہی نہیں تھا، بلکہ حقائق کے کھلے ہوئے اشاروں کا ادراک و اعتراف تھا۔ چنانچہ دنیا جوں جوں آگے کھسک رہی ہے، یہ اشارے زیادہ سے زیادہ کھلتے جا رہے ہیں۔ اور ان اقوام کا، نیز ان کی شاگرد قوموں کا ظاہری و باطنی اضطراب چھپائے نہیں چھپ رہا ہے۔ یہ ان کا اضطراب ہی تو ہے جو انہیں ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر دوڑا رہا ہے۔ جاہلیت کے ایک پھندے سے جب بے چین ہو اٹھتی ہیں تو اسے پھینک کر دوسرا پھندا اپنے گلے میں ڈال لیتی ہیں۔ امپیریلزم اور ملوکیت کی جان لیوا سختیاں زندگی جب دو بھر کر دیتی ہیں تو بھاگ کر جمہوریت کے زیر سایہ جا کھڑی ہوتی ہیں۔ سرمایہ داری کی اذیتیں جب برداشت سے باہر ہونے لگتی ہیں تو اپنے کو کمیونزم کے شکنجے میں دے دیتی ہیں۔ جمہوریت کے سبز باغ کا سایہ بھی جب ٹھنڈا ثابت نہیں ہوتا تو ڈکٹیٹر شپ کی گود میں جا بیٹھتی ہیں۔ غرض ایک عام بے چینی ہے جو مختلف شکلوں میں اپنا اظہار کرتی رہتی ہے۔ یہ صورتِ حال بتاتی ہے کہ زمین تیار ہو رہی ہے، اور اگر اس میں ڈھنگ سے بیج ڈالا جائے تو اسے قبول کر سکتی ہے۔ اس نے تو اپنی طلب کا، نادانستہ، مظاہرہ بھی شروع کر دیا ہے۔ مسلسل آوازیں اٹھ رہی ہیں کہ موجودہ ہلاکت آفریں سائنس کے دیو کو صرف روحانیت قابو میں لا سکتی ہے۔ درد کو ذرا اور بڑھنے دیجیے، آگے چل کر اس مطلوبہ روحانیت کا تعیّن بھی زیرِ غور آ سکتا ہے۔ اور وقت بتا دے گا کہ مطلق روحانیت اس درد کا درماں ہرگز نہیں بن سکتی کیونکہ اس نوع کی روحانیت کا سائنس سے کوئی قابلِ فہم اور معقول جوڑ لگ ہی نہیں سکتا۔ حالانکہ یہ سائنسی دور جب آ گیا ہے تو بہرحال برقرار رہے گا۔ اس کے واپس چلے جانے کا کوئی سوال ہی نہیں۔ اس لیے روحانیت کا کوئی ایسا ہی تصور آج کام دے سکتا ہے جو زندگی کے مسائل کو حل کرنے میں علم اور سائنس سے ہم آہنگی کی پوری پوری صلاحیت رکھتا ہو، اور اس کی رہنمائی اور نگرانی بھی کر سکتا ہو۔ ایسی روحانیت ایک دینِ اسلام کے سوا نہ مشرق میں کہیں پائی جا سکتی ہے نہ مغرب میں۔ البتہ اس بات کا یقین ابھی نہیں کیا جا سکتا کہ روحانیت کی ضرورت کا اظہار کرنے والی یہ آوازیں اپنے اندر سنجیدگی اور طلبِ صادق بھی رکھتی ہیں، اور اگر رکھتی ہیں تو اسلام سے پیروانِ جاہلیت کا دیرینہ تعصب انہیں اس کی طرف متوجہ ہونے کی اجازت بھی دے گا۔ لیکن ان دونوں

شبہات کے باوجود اطمینان اور امید کا ایک پہلو سامنے آچکا ہے۔ اور وہ یہ کہ دنیا، اسلام کا نام لیے بغیر، اس کی خوشہ چینیاں کرنے پر مجبور ہونے لگی ہے۔ اگرچہ اس خوشہ چینی کا محرک دینی اور روحانی نہیں ہے، بلکہ صرف افادی ہے۔ یعنی ہو یہ رہا ہے کہ جب خود ساختہ قوانین اور نظریات کے ناخوش گوار نتائج زندگی اجیرن بنا دیتے ہیں تو لوگ انہیں بدل ڈالنے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں، اور یہ تبدیلی بسا اوقات ایسے قوانین و نظریات کی شکل میں سامنے آتی ہے جو اسلامی قوانین و نظریات کے مطابق تو نہیں ہوتے، مگر ان کا رُخ کسی نہ کسی حد تک انہی کی طرف ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اسلام کے تعزیری قوانین کو لے لیجیے، جن پر جاہلیت کے پروردہ دانش وروں اور قانون سازوں کو سب سے زیادہ اعتراض رہتا چلا آرہا ہے۔ ان کے اس اعتراض کی وجہ ان کا یہ نظریہ ہے کہ قاتل اور رہزن اور زانی مجرم نہیں بلکہ فی الواقع ذہنی مریض ہوتے ہیں، اس لیے ان کی غلط حرکتوں کے جواب میں انتقام کا نہیں ہمدردی اور اصلاح کا رویہ اختیار کیا جانا چاہیے۔ اسلام کا نظریہ چونکہ یہ نہیں ہے اور وہ ایسے غلط کاروں کو ذہنی مریض نہیں بلکہ اخلاقی مریض اور قانونی مجرم قرار دیتا ہے، اس لیے معاشرے کو جرائم کی وبا سے بچانے کے لیے اس نے ان کے لیے سخت اور عبرت ناک سزائیں مقرر کی ہیں۔ نظریوں کے اس فرق کی وجہ سے اہلِ جاہلیت اسلام کے ان تعزیری قوانین کی معقولیت اور مصلحت سمجھ نہ سکے، اور انہوں نے چھوٹتے ہی انہیں وحشیانہ کہہ دیا۔ ان لوگوں کو اس بات کی توفیق تو نہ مل سکی کہ وہ اپنے اس نظریۂ جرم و سزا پر معروضی طور سے غور کر کے اس کی غلطی کا ادراک کر سکتے، لیکن اس احمقانہ نظریے کے جو بھیانک نتائج لازماً نکلنے والے تھے، وہ جب نکلے اور نکلتے نکلتے پانی سر سے اونچا ہونے لگا تو ان لوگوں کو قدرے ہوش آیا۔ ایک طرف تو ان کے سامنے وہ رپورٹیں تھیں جو اقوامِ متحدہ کی طرف سے مختلف ملکوں کے اندر ہونے والے جرائم کی بابت شائع ہوتی رہتی ہیں اور جنہیں دیکھ کر فی الواقع ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان ممالک میں سے بہتوں کا انسان حیوانوں اور درندوں سے بھی آگے نکل گیا ہے۔ دوسری طرف انہوں نے دیکھا کہ جن دو تین مسلم ملکوں میں اسلام کے تعزیری قوانین کا فی الجملہ نفاذ ہے، وہاں جرائم کی تعداد نسبتہً انتہائی کم، بلکہ نہ ہونے

کے برابر ہے۔ یہ تقابلی جائزہ انہیں یہ محسوس کرنے پر مجبور کرنے لگا ہے کہ جرم اور سزا کے بارے میں ان کا نظریہ عملاً کامیاب نہیں رہا۔ نئی دہلی سے شائع ہونے والے ایک سہ ماہی رسالے نے ابھی حال میں اس مسئلہ کے بارے میں اپنی تحقیقات کے نتائج شائع کیے ہیں، جن میں یہ بات بھی بتائی گئی ہے کہ امریکہ کی بعض ریاستوں نے عادی مجرموں سے نپٹنے کے لیے عبرت ناک سزاؤں کے قانون کی تجدید کی ہے۔ یہ ریاستیں یہ قدم اٹھانے پر اس لیے مجبور ہوگئیں کہ جرائم پیشہ لوگوں کی بحالی اور اصلاح کے الٹے نتائج برآمد ہوئے اور ہلکی سزاؤں کی بنا پر ان ریاستوں میں جرائم کی تعداد بڑھ گئی۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ جرائم کے بعض ماہرین کے خیال میں عبرتناک سزائیں دنیا میں جرائم کی روک تھام کا ایک طریقہ ہیں۔ اپنے اس خیال کی حمایت میں مثالیں دیتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ "بعض مسلم ممالک میں، جہاں عبرتناک سزائیں نافذ ہیں، رہزنی، ڈاکے اور اغواء کی وارداتیں شاذ و نادر ہی واقع ہوتی ہیں"۔ خود ہمارے ملک میں گذشتہ دنوں خواتین کی بہت سی انجمنوں نے عورتوں پر بڑھتے ہوئے بہیمانہ حملوں کی روک تھام کے لیے حکومت سے سخت سزائیں نافذ کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ تعزیری قوانین ہی جیسا حشر عائلی قوانین کا بھی ہو رہا ہے۔ قانونِ نکاح کی بے قیدیوں اور طلاق کی دشواریوں نے معاشرے کی حالت ابتر کر رکھی ہے، اس لیے رہ رہ کر لوگوں کو اسلامی قوانین کی یاد آرہی ہے۔ عورتوں کے پاس ظالم شوہروں سے چھٹکارا پانے کا کوئی اختیار نہ تھا۔ اب ان کی اس بے کسی کا مداوا مہیا کر دیا گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ سارے قانونی تغیرات من مانے طور پر ہو رہے ہیں اور اسلامی قوانین کے مطابق نہیں ہیں، لیکن اُن کا رُخ اکثر اوقات اِنہی قوانین کی طرف ہوتا ہے، جو اس بات کی علامت ہے کہ جاہلیت کی ماری ہوئی دنیا اپنے اکثر قوانین سے تنگ آکر ان میں ایسی تبدیلیاں کرنے پر مجبور ہو چلی ہے جو اُن کی اسلامی قوانین سے دوری کو کم کر دینے والی ہیں۔ اور اس طرح وہ خواہی نخواہی ان قوانین کی طرف آرہی ہے۔ اگرچہ اس کا یہ آنا سیدھے راستے سے نہیں، ٹیڑھے راستوں سے ہے، لیکن ابھی اس سے زیادہ کی توقع کی بھی نہیں جا سکتی۔ یہ توقع تو اسی وقت کی جا سکتی ہے جب وہ اِن قوانین کی روح، انکے مقاصد اور ان کے مصالح کا اعتراف کرے اور اسلام کی بالغ نظری کو تسلیم کرے۔ ظاہر ہے کہ

یہ منزل ابھی بہت دور ہے۔ اس وقت تو جو ہلکی ہلکی تبدیلیاں مختلف سطحوں پر ہو رہی ہیں، ان کی حیثیت 'اَن کہی، کہنے' سے زیادہ نہیں ہے، مگر ان سے اتنا بہرحال ظاہر ہوتا ہے کہ آج کی 'مہذب دنیا'، اپنی محبوب جاہلیت کے زیرِ اثر اسلام کو چاہے جتنے بھی کوسنے دے، اس کے عملی تجربے اور ضرورتیں اسے جیسے جیسے مجبور کرتی جائیں گی، اس کو اسلامی قوانین کی طرف آنا ہی پڑے گا۔ یہ بات، زمانے کی یہ معمولی سی کروٹ بھی غربائے اسلام کے لیے ایک مژدہ سے کم نہ ہونی چاہیے۔ اگر وہ اپنی 'غربت' کے صحیح قدر شناس ہوں گے اور اس قدر شناسی کا عملی ثبوت بھی دیتے رہیں گے، جو انہیں لازماً دینا ہی چاہیے، تو آج ان سے لڑنے والی دنیا کل ان کے قریب آسکتی ہے۔ اور جب ایسا ہوگا اس وقت وہ اور ان کا دین' دونوں، غربت کی حالت سے نکلنا شروع کر دیں گے۔

امیدوں کے پھیلتے اجالے

یہ تو بیرونی دنیا کی بات تھی۔ اندر کی دنیا کا حال اس سے کہیں زیادہ خوش آئند ہے۔ اُن 'غربائے اسلام' کی تعداد آج تیزی سے بڑھ رہی ہے جو اسلام اور جاہلیت کے معرکے میں ہراولی دستہ بنا کرتے ہیں۔ ایشیا اور افریقہ کے کئی ملکوں میں اس ہراولی دستے کے 'سپاہیوں' کی بھرتی اور تربیت کے مراکز کھل چکے ہیں۔ اور بعض جگہوں میں اس نے اتنی قوت حاصل کر لی ہے کہ جاہلیت کے پیروؤں میں کھلبلی مچ گئی ہے۔ ان ہراولی دستوں کی بعض کمزوریوں کا انکار نہیں۔ ان سے بعض بے اعتدالیاں اور بے تدبیریاں بھی سرزد ہو سکتی ہیں۔ لیکن بشری خامیوں سے پاک ہونے کا نہ کوئی دعویٰ کر سکتا ہے، نہ کوئی کسی سے اس کا مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہو سکتا ہے۔ اللہ کے دین کے لیے اٹھ کھڑے ہونے والے یہ غربا، دہر اگر اپنے ارادوں میں مخلص ہیں، اور قرائن کہتے ہیں کہ وہ یقیناً مخلص ہیں، تو خدا کی سنت یہ ہے کہ وہ اپنے دین کے خادموں کے ضُعف (ظاہری کمزوریوں) کا بھی لحاظ کرتا ہے اور ان کے ضعف (معنوی کمزوریوں) کی بھی رعایت کرتا ہے۔ اس لیے اس کے کرم سے پوری توقع ہے کہ ان 'دستوں' کی پیش قدمیاں جاری رہیں گی، اور ایک دن غربت و اجنبیت

کی وہ گھٹائیں چھٹ جائیں گی جو اسلام اور اس کے سچے پیروؤں پر مدت سے چھائی ہوئی ہیں۔

یہ کوئی معمولی المیہ نہ ہوگا کہ امیدوں کے اس پھیلتے ہوئے اجالوں میں بھی ہماری خودی بیدار نہ ہو اور ہماری خود شناسی پر بدستور مردنی چھائی رہے۔ بے شک اب بھی اس خوش گمانی کا کوئی موقع نہیں کہ سفر کی راہ ہموار اور بے خار ہوگئی ہے۔ ایسا نہ کبھی ہوا ہے نہ کبھی ہوگا۔ ہر کہنے والے نے ہمیشہ یہی کہا ہے اور آج بھی کہہ رہا ہے کہ دین کی خدمت، نصرت اور اقامت کی راہ کانٹوں سے بھری ہوئی ہے۔ تحریروں میں پڑھی اور تقریروں میں سنی جانے والی یہ دائمی حقیقت آج سر کی آنکھوں سے دکھائی بھی دے رہی ہے۔ حیرت ناک، لیکن توقع کے عین مطابق صورت حال یہ ہے کہ اسلامی قوتوں کے اس بڑھتے ہوئے قدم کو روک دینے کی کوششیں ابھی غیروں کی طرف سے تو پسِ پردہ اور صرف زبان و قلم سے ہو رہی ہیں، لیکن 'اپنوں' کی طرف سے علانیہ اور پوری 'شانِ جہاد' کے ساتھ ہوتی چلی آرہی ہیں۔ مصطفےٰ کمال اور جمال عبد الناصر، شاہ ایران اور شاہ فاروق، حافظ الاسد اور صدام حسین، حبیب بورقیبہ اور بومدائن، سکارنو اور سہارتو، اور انہی جیسے کچھ اور مسلم حکمرانوں کے کارنامے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ملت کے یہ 'نامور' سربراہ 'اسلام کی تاریخ میں کیسے کیسے سیاہ اور' سرخ' ابواب کا اضافہ کرچکے ہیں، اور کرتے جارہے ہیں۔ یہ لوگ 'مسلمان' تھے یا 'مسلمان' ہیں، لیکن اسلام کا راستہ انہوں نے اس طرح روکا اور روک رہے ہیں کہ اسلام کے کھلے منکر اور مخالف بھی حیرت میں پڑ گئے ہوں گے۔ مگر پھر یاد کر لیجیے کہ ایسا ہونا ہی تھا۔ پہلے بھی یہی کچھ ہوچکا ہے، اور جب تک جاہلیت کے دم میں دم ہے ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ اور ایک نصرتِ اسلام ہی پر کیا موقوف ہے دنیا کا کون سا بڑا کام ہے جو خونِ جگر جلائے اور زخم پر زخم اٹھائے بغیر انجام پایا کرتا ہے؟ اگر ہمیں اسلام پر اور اس کے وعدوں پر واقعی یقین ہے تو سارے اندیشوں سے بے پروا ہو کر غربائے اسلام کے بڑھتے ہوئے کارواں میں شامل ہوجانا چاہیے۔ دیکھیے کل قیامت کے دن کس کس کا نام خدا کے حضور غرباء کی فہرست میں لکھا ملتا ہے۔

———※———